دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کا تحقیقی رسالہ

اُردوئے معلّیٰ

قدیم اُردو نمبر

شمارہ ۹

مرتبہ

خواجہ احمد فاروقی

قیمت پانچ روپے

اُردوئے معلّٰی

قدیم اُردو نمبر

شعبۂ اُردو جامعہ اسلامیہ دہلی

فہرستِ مضامین

(یونین پرنٹنگ پریس دھلی)

حصۂ دوم
انتخابات

شذرات

سائنسی انقلاب نے ہمارے خیالات کی منطقی ساخت اور ان کی نئی تشکیل میں بڑی مدد دی ہے لیکن زبان کی طرف ہم نے زیادہ توجہ نہیں کی اور داغ کے بعد تو جو پرانی روایات تھیں، وہ بھی رفتہ رفتہ ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ ہمارے یہاں لسان اور لسانیات کے میدان میں جو سائنسی کام ہوا ہے، اس کی حیثیت حسنِ مستعار کی سی ہے۔

چشم نرگس کی، دہن غنچے کا، حیرت میری

جدید علوم کی روشنی میں اصلی اور بنیادی تحقیق کی طرف ہم نے قدم نہیں اٹھایا۔ شروع میں خوشہ چینی بھی ضروری ہوتی ہے اور دوسروں کے خیالات سے استفادہ بھی۔ شاید وہ جھوٹ بھی جس سے فرہاد نے شہادت پائی تھی! وہ سراب بھی، جس کے بغیر پیاس کچھ معنی نہیں رکھتی۔ لیکن

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

اردو زبان سے متعلق یہ خاص نمبر اس بڑی ضرورت کو پورا نہیں کرتا، اس

ضرورت کی طرف اشارہ ہے۔

دنیا میں اُردو کے بولنے والوں کی تعداد ۱۸۵ ملین کے قریب بتائی جاتی ہے لیکن اس کے بولنے والوں کی سب سے بڑی تعداد ہندوستان میں ہے۔ دست و بازو کو نظر نہ لگے لیکن تقسیم کی یہ لکیر اس خوبی سے کھینچی گئی ہے کہ اُردو کا سارا علاقہ، اس کا مولد و مصدر سب ہمارے پاس نہ ہے۔ باوجود مشکلات کے ہندوستان میں اُردو کے علمی ذخیرے، اُردو کے ادیب اور شاعر، اُردو کے اخبارات، اُردو کے تعلیمی انتظامات سب سے زیادہ ہیں۔ ایوانِ اُردو، اُردو ہال، اُردو کالج، اُردو انسٹی ٹیوٹ اور جامعۂ اُردو کی عمارتیں، اُردو گھر اور غالب ہال سب آزادی کے بعد ہی وجود میں آئے ہیں۔ پاکستان میں اُردو کے بولنے والوں کی تعداد صرف ۳۲ لاکھ ۹۸ ہزار ۴ سو ۴ ۵ ہے یعنی اس کی آبادی کا صرف $3\frac{1}{2}$ فی صد حصہ اُردو سے تعلق رکھتا ہے ——————

پاکستانی ادیب جناب عاشق بٹالوی لندن میں مجھ سے کہتے تھے : " اُردو ؟ ! ممکن ہے مولانا صلاح الدین کے گھر میں بولی جاتی ہو لیکن اب ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ اُردو ہماری مادری زبان نہیں ہے —— مولانا ظفر علی خاں مرحوم اُردو کے بڑے شیدائی تھے اور مسلمانوں کے زوال کے سلسلے میں خشیۃ اللہ کے نہ ہونے کا بار بار ذکر کرتے تھے۔ اس وقت ہم بچے یہ سمجھتے تھے کہ خشیۃ اللہ کوئی رحیم اللہ، کریم اللہ بڑا عالم فاضل ہے جس کے اُٹھ جانے سے ہم اس زبوں حالی کو پہنچ گئے ہیں۔ ہم نے تو اُردو ثانوی زبان کی حیثیت سے سیکھی ہے اور دیوان ذوق کو بھی پنجابی کے ذریعے پڑھا ہے "

جب میں نے ۱۹۴۶ء کے رسالۂ نقوش میں اس پر زور دیا تھا کہ اُردو کا مستقبل اصلاً ہندوستان سے وابستہ ہے اس لیے کہ وہ اُردو کا گھر ہے اور

اس کے بولنے والوں کی سب سے بڑی تعداد ہندوستان میں ہے اور پاکستان "بار امانت نتوانست کشید" تو ڈاکٹر عبدالحق مرحوم بہت خفا ہوئے تھے اور آخر وقت تک یہ شکایت ان کے دل سے نہیں نکلی۔

اُردو کے سلسلے میں ہمارے اوپر بے شمار ذمّے داریاں عاید ہوتی ہیں اور آزادی کے بعد یہ ذمّے داریاں اور بڑھ گئی ہیں لیکن ہم نے ان میں سے کتنی ذمّے داریوں کو پورا کیا ہے؟ جب کام کی بات کا ذکر آتا ہے تو اُردو کے بہی خواہ رقیب کے گلے اور طعنِ اقربا کا ذکر لے بیٹھتے ہیں۔ یہ بھول جاتے ہیں کہ کام مشکلات میں بھی ہوتا ہے اور جادۂ راہِ وفا' جز دمِ شمشیر نہیں۔ ایسی انفرادی اور اجتماعی صدہا مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جب انسان نے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں مشکلات کے آگے سر جھکانے سے انکار کر دیا ہے: ابو علی ابن سینا کے علمی کاموں کا اوسط سال میں بیس ہزار صفحات تھا اور خط اتنا باریک تھا جیسے تعویذ کے نقش۔ اپنی معروف کتاب قانون پر انھوں نے پورے پندرہ برس' دن اور رات اسی طرح شدید دقّتوں اور دشواریوں میں کام کیا تھا۔ آخر میں ان کی بصارت زائل ہو گئی لیکن ہمّت ختم نہیں ہوئی ——— سرسیّد نے قطب مینار کے کتبے کن دشواریوں میں پڑھے ہیں: مولانا صہبائی لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اُن کے جھولے کو جھونٹا دیتے تھے اور وہ ایک ایک حرف کو پڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس وقت نہ فوٹوگرافی نے یہ کمال بہم پہنچایا تھا اور نہ کمپیوٹر تھے۔ جانوں کی پڑ رہی تھی اس لیے ستایش اور صلے کا بھی سوال نہیں تھا ——— اہرامِ مصر، جن کی عظمت کے آگے افلاک سرنگوں ہیں، کن ہمّت شکن دقّتوں میں تعمیر ہوئے ہیں! ایک ایک پتھر کو سیلاب کے زمانے میں چٹانوں سے لڑھکایا ہے تاکہ وہ میلوں دور معماروں

تک پہنچ جائیں اور یہ کام ایک دو دن نہیں، بیس برس تک مسلسل ہوتا رہا۔

میں یہ چند سطریں روس میں بیٹھ کر لکھ رہا ہوں جہاں میں اُردو کے مہمان پروفیسر کی حیثیت سے مقیم ہوں۔ یہ وہ سرزمین ہے جس کے سفیر جہانِ قمر تک پہنچ گئے ہیں اور یہاں کے انسان نے کرۂ ارض کو پہلی دفعہ، زمین سے ہٹ کر، بطور وحدت کے دیکھا ہے۔ ہم نے ابھی تک اپنے ملک ہندوستان کو بھی چھوٹی چھوٹی وفاداریوں سے علیحدہ ہوکر اور ایک کُل کی حیثیت سے نہیں دیکھا اور اسی وجہ سے ہمارے مسائل اتنے اُلجھے ہوئے ہیں۔ اگر ہم تہذیبی مسائل کو اِس نظر سے دیکھ سکیں تو ہمیں سب زبانوں سے پیار ہوگا، ہم سب کی اہمیت کو تسلیم کریں گے اور ہر خرمن سے خوشہ چینی کرنا اپنا فرض سمجھیں گے ــــ

میں قطعاً منکر ہوں اِس بات سے کہ کوئی زبان محض حکومت کی سرپرستی سے ترقی کر سکتی ہے یا حکومت کی بے اعتنائی سے ختم ہو سکتی ہے۔ اُردو کا مستقبل اُردو والوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس کو اگر اُردو والے زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو وہ زندہ رہے گی اور اسے کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا۔ حکومتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اِس آسمان نے جین قبا اور طرف کلاہ بہت دیکھی ہیں لیکن اس کے عوام رہتی دنیا تک باقی رہتے ہیں لیکن اُردو کو اس طرح سنوار تو دیجیے کہ اگر کوئی اسے قتل کرنا چاہے تو خود اس کا ہاتھ رُک جائے:

در زیرِ تیغ رفت و شہیدش نمی کنند

ڈاکٹر ہومس نے لکھا ہے کہ ہمیں اس صدی میں تمام پچھلی صدیوں سے زیادہ علم حاصل کرنا ہے اور اگلی صدی کے لوگوں کو اس سے بھی ہزاروں گنا زیادہ سیڑھیاں طے کرنا ہوں گی۔ کیا ہم نے اُردو زبان کے خزانوں میں اضافہ کرنے اور اس کی خوبیوں کو عام کرنے کا کوئی منصوبہ بنایا ہے؟

ہندوستان میں اُردو سے دل چسپی رکھنے والوں کی تعداد اگر پچاس ملین بھی ہے تو ذرا سوچیے کہ جب یہ پوری آبادی تعلیم سے آشنا ہو جائے گی تو اس کی بدولت ہمارے ملک میں کتنا بڑا انقلاب رونما ہو جائے گا! ہمیں کتنے استادوں کی ضرورت ہوگی؟ کتنی کتابوں کی؟ کتنے اخباروں کی؟ کتنے کاغذ کی؟ کتنی روشنائی کی؟ اور یہ بات بھی یاد رہے کہ تعلیم ٹھہری ہوئی حالت نہیں ہے، مسلسل عمل ہے۔

اُردو کے ساتھی ان روشن امکانات پر غور نہیں کرتے، راستے کی معمولی دقتوں سے گھبرا جاتے ہیں۔ حالاں کہ غالب کا فتویٰ تو یہ ہے کہ راہ کو پُرخار دیکھ کر بھی دل خوش ہونا چاہیے۔ جتنا بڑا مقابلہ ہوگا، اتنی ہی زیادہ عملی صلاحیت اُبھرے گی۔ مشکلات ذوقِ فراہمی ہوتی ہیں اور عزم اور حوصلے کی زادِ راہ بھی، جو منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے۔ جو دقتیں ہمارے سامنے ہیں وہ زبان کی تاریخ میں بہت معمولی ہیں ——— سمرقند میں ایک پولش خاتون مجھ سے کہتی تھیں کہ جرمنی کے قبضے کے دوران میں پولش کی تعلیم یک سر ممنوع تھی۔ ہم بچوں کو سرِ شام سُلا دیتے تھے اور رات کے وقت ان کو اُٹھا کر پولش کا درس دیتے تھے۔ میں کھڑکی میں کھڑی یہ دیکھتی رہتی تھی کہ جرمن سپاہی تو نہیں آ رہے۔ جب میں تھک جاتی تھی تو میری بڑی لڑکی یہ پہرہ دیتی تھی۔ اس ظلم کے باوجود آج پولش، یورپ کی اہم اور سرمایہ دار زبانوں میں سے ہے ——— اسی طرح چیک زبان پر کیا کیا وقت نہیں گزرے۔ ۱۶۲۰ء میں کوہ سفید کی لڑائی ہوئی اور چیک، جرمنی کے ہیبسبرگ خاندان کے محکوم ہو گئے اور بوہیمیا اور موریویا میں ان کی زبان، ان کا مذہب سب خطرے میں پڑ گیا۔ اگر معصوم بچوں کی زبان سے بھی کوئی چیک لفظ

غیر ارادی طور پر نکل جاتا تھا تو ان کو سخت ترین سزائیں دی جاتی تھیں۔ یہ ظلم تین سو سال تک جاری رہا لیکن جِک زبان دیہاتی گیتوں اور کٹ پتلی کے تماشوں کے ذریعے زندہ رہی ——— اور آج جب اِس ظلم کی بساط اُلٹ چکی ہے تو وہ یورپ کی ترقی یافتہ زبانوں میں گنی جاتی ہے۔

بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کے برعکس بھی درست ہے۔ اگر کسی زبان کو آئین اور اکثریت کی بھی تائید حاصل ہو تب بھی ضروری نہیں کہ اسے شرفِ قبول حاصل ہو جائے یا وہ ترقی کی اعلیٰ منزلیں طے کرلے ——— پاکستان میں اُردو صرف کاغذ پر سرکاری زبان ہے۔ ابھی اس کو دلوں میں جگہ نہیں ملی۔ ہندی کو جنوبی ہندوستان میں جڑ پکڑنے کے لیے بڑی کڑیاں جھیلنا ہوں گی۔ تمنّا بے تاب سہی لیکن عشق تو صرف صبر کا تقاضا کرتا ہے۔ آئرلینڈ میں لاکھوں پاؤنڈ آئرش کی ترویج و ترقی پر خرچ کیے گئے لیکن وہ آج تک انگریزی کی جگہ نہیں لے سکی۔ مسز ڈوری نا سیلون جو خود آئرش ہیں روم میں مجھ سے کہتی تھیں کہ "آئرش کے امتحان میں تمام طالب علم پاس کر دیے جاتے ہیں۔ نہ کوئی اس کے لیے محنت کرتا ہے اور نہ سنجیدگی سے پڑھتا ہے۔ ایک بے مایہ زبان کا پڑھنا ہی کیا؟ لیکن میرے ساتھ عجیب واقعہ پیش آیا۔ استاد نے زبانی امتحان میں پوچھا: 'ڈوری نا تم آج کل کیا پڑھ رہی ہو۔' میں نے عرض کیا "افلاطون کی ریاست"۔ استاد نے کہا "کیا تم اس کا خلاصہ مجھے بتا سکتی ہو"! میں انگریزی میں تو بتا سکتی تھی لیکن آئرش، اظہارِ بیان سے قطعی عاجز تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مادری زبان میں فیل کر دی گئی!" اسی طرح اسپرانتو میں سائنس یا فلسفے کی گفتگو کرنا تقریباً محال ہے۔ یہی حال ان سو زبانوں کا ہے جو موجودہ زمانے میں حضرت انسان نے مصنوعی طور پر وضع کی ہیں یا ان کو

مصنوعی طریقوں سے رائج کرنے کی کوشش کی ہے۔

گلی ور کے سفرنامے میں ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ وہ چلتے چلتے ایک اکادمی میں پہنچا جہاں اہلِ علم الفاظ کے ختم کرنے کے درپے تھے۔ اُن کی دلیل یہ تھی کہ الفاظ تو اشیا، ان کی کیفیت اور عمل کو ظاہر کرتے ہیں اس لیے کیوں نہ الفاظ کے بجائے اِن اشیا ہی کو استعمال کیا جائے۔ اس ادارے کے دو بڑے عالم ان چیزوں کے بوجھ کے نیچے دبے جا رہے تھے اور پسینے میں شرابور تھے۔ انھوں نے اپنے گٹھر زمین پر رکھے، تب کہیں جا کر اس نئی زبان میں کچھ دیر گفتگو کی ——

اُردو کے سامنے جو خطرات ہیں، وہ اندرونی زیادہ ہیں اور بیرونی کم۔ ہم زبان اور محاورے سے بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں اور ایسی اُردو استعمال کرتے ہیں جو کتابی زیادہ ہے۔ اس کا روزمرّہ، اس کا ادب، ہمارے ذہن کا حصہ نہیں ہے (اسی وجہ سے ہم لفظ، چیز یا واقعات اور نتائج کا فرق بھول جاتے ہیں حالاں کہ قومی جمہوریتوں میں اس قسم کی تربیت کی اشد ضرورت ہے جو صرف زبان کے ذریعے ہی ممکن ہے) ہم جو زبان بولتے ہیں وہ انفرادی ورثہ نہیں ہے بلکہ وہ سرمایہ ہے جو ہمیں معاشرے سے ملا ہے۔ اسی لیے اگر ہم انسان کو معاشرے سے الگ کر لیں تو وہ بے زبان ہوگا۔ اکبر کے زمانے میں یہ تجربہ ہو چکا ہے۔ رابنسن کروسو کے افسانے کی دل کشی اِس میں مضمر ہے کہ وہ انسان کو سماج سے الگ کر کے دیکھنے کی ناکام کوشش ہے۔ زبان لفظوں کا ایک متحرک جلوس ہے لیکن بولنے والے کی حیثیت اس عقاب کی سی نہیں ہے جس نے انسانوں سے الگ آشیانہ بنایا ہو یا اس بادشاہ کی نہیں ہے جو ایک اونچی جگہ کھڑے ہو کر فوج کا سلام لے رہا ہو۔ بولنے والا خود اس جلوس

کا حصہ ہے اور اس کے ذہن کے سارے نقش و نگار اسی معاشرے نے تعمیر کیے ہیں۔ اسی لیے وہ زبان زندہ رہے گی جس میں ہمارا سماجی ورثہ، نئے الفاظ کا خون، اور تازہ خیالات کی توانائی شامل ہوگی۔ مجھے افسوس اس کا ہے کہ اُردو اپنی بنیادوں سے ناآشنا ہوتی جا رہی ہے اور اب جو اُردو سننے میں آتی ہے اس میں اُردو پن کم ہے، بناوٹ زیادہ ـــــ میرے ایک نوعمر عزیز نے ولایتی موزے خریدے۔ وہ اُن کو بار بار پہنتے تھے اور اپنی ماں کو دکھلاتے تھے۔ وہ دق ہوکر کہنے لگیں: "ہٹو۔ مجھے یہ اترا ہٹ کی باتیں پسند نہیں۔" اس میں اترا ہٹ کا لفظ بہت خوب صورت اور معنی خیز ہے لیکن اس کا استعمال کم ہوتا جا رہا ہے۔ مولانا حامد حسن قادری مرحوم کو گوشت بہت پسند تھا۔ کہنے لگے "میں گوشت بغیر روٹی کی لاگ کے کھاتا ہوں۔" ۱۹۴۶ء میں جامعہ کی جوبلی تھی اور قرب وجوار میں فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے تھے۔ ایک صاحب یہ کہانی لے کے بیٹھ گئے۔ آغا حیدر حسن صاحب کہنے لگے۔ "میاں چھوڑو بھی۔ کچھ لگاوٹ کی باتیں کرو۔" مولوی نذیر احمد کے یہ جملے دیکھیے۔ اب ایسی اُردو نہ کسی رسالے میں نظر آتی ہے، نہ کتاب میں:

"یار ہو بڑے خوش قسمت کہ اس وقت بھاڑ مل گیا۔ ذرا واللہ ہاتھ تو لگاؤ، دیکھو تو کیسے بھلس رہے ہیں۔ اور سوندھی سوندھی خوشبو بھی عجیب ہی دل فریب ہے کہ بس بیان نہیں ہو سکتا۔ تعجب ہے کہ لوگوں نے خس اور مٹی کا عطر نکالا مگر بھنے ہوئے چنوں کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوا۔ کوئی فن ہو، کمال بھی کیا چیز ہے۔ دیکھیے، اتنی تو رات گئی ہے مگر چھدامی کی دکان پر بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ بندے نے تحقیق سنا ہے کہ حضور والا کے خاصے میں بھی چھدامی کی دکان کا چنا بلاناغہ لگ کر جاتا ہے اور واقع میں ذرا آپ غور سے دیکھیے کیا کمال کرتا ہے کہ

ونٹنے میں چنوں کو سڈول بنا دیتا ہے۔ بھئی تمھیں میرے سر کی قسم، سچ کہنا، ایسے خوب صورت، خوش قطع، سڈول چنے تم نے پہلے بھی کبھی دیکھے ہیں؟ دال لنے میں تو اس کو یہ کمال حاصل ہے کہ کسی دانے پر خراش تک نہیں، ٹوٹنے پھوٹنے کا کیا مذکور۔ اور دانوں کی رنگت دیکھیے کوئی بسنتی ہے، کوئی بسنتی۔"

زبان کی تعلیم بھی اس طرح ہونا چاہیے کہ اس کی خوبیاں کسی ایک حلقے میں محدود نہ رہیں بلکہ عام ہو جائیں ـــــ میں ماسکو میں تھا۔ ایک پروفیسر مجھ سے ملنے آئے۔ لفٹ کے دروازے پر تکلف ہونے لگا۔ پہلے آپ، پہلے آپ۔ اس منزل پر کام کرنے والی لڑکی کہنے لگی: "یہ کیا آپ گوگول کے کرداروں کا سا تکلف کرتے ہیں۔ آگے بڑھیے بھی، ورنہ لفٹ نکل جائے گی" ـــــ دمشق صاحب سے ہندوستان کی ملاقات تھی، مجھے روس میں دیکھ کر کہنے لگے: "فاروقی صاحب پہاڑ آپس میں نہیں ملتے لیکن انسان ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ ہماری دوبارہ ملاقات ہوگی" ـــــ یہ بات اہلِ روما میں بھی تھی۔ وہ بات بات میں ہوریس اور ورجل کا حوالہ دیتے تھے۔ انگلستان میں بھی تھی اور ہے شیکسپیر کے حوالے ہائڈ پارک اور پارلیمنٹ دونوں جگہ دیے جاتے ہیں۔ میں نے مسٹر رالف رسل کا تعارف ایک صاحب سے کرایا۔ بعد میں ان سے پوچھا: "کیسے کچھ پسند آئے آپ کو؟" کہنے لگے "ہاں بے نیازی ہے لیکن حد سے بڑھی ہوئی نہیں"۔ یہ بات ہمارے یہاں بھی تھی لیکن نئی نسل اپنے تہذیبی ورثے سے دور ہو گئی ہے اور اس کی خوبیاں اس کے ذہن کا حصہ نہیں بنیں ـــــ ۴۷ء میں ہزاروں آدمی پاکستان کی طرف بھاگے چلے جا رہے تھے۔ کچھ ڈر کی وجہ سے، کچھ لالچ کی وجہ سے، کچھ کو یہ تصور تھا کہ دودھ کی نہریں بہہ رہی ہوں گی اور حوریں جامِ کوثر لیے کھڑی ہوں گی۔ میری ایک

عزیزہ یہ سب واقعات سُن کے کہنے لگیں "بھیا میں سیاست وریاست تو نہیں جانتی لیکن مجھے وہ قصہ یاد آتا ہے ـــــ ایک بگلا تھا۔ جوانی میں وہ مچھلیوں کا شکار کرتا تھا اور آرام و آسایش کی زندگی گزارتا تھا لیکن جب بڑھاپے میں اس کے قوا جواب دے گئے اور وہ پہلے کی طرح شکار کرنے سے مجبور ہو گیا تو اس نے ایک چال چلی۔ ایک روز رونی صورت بنا کر اور مُنہ لٹکا کر بیٹھ گیا۔ ایک کچھوا آیا اور پوچھنے لگا "خیر تو ہے۔ آپ اس قدر افسردہ کیوں ہیں؟" "کیا بتاؤں اِس تالاب سے مجھے ایک اُنس ہے۔ ساری زندگی یہاں کاٹی ہے۔ ایک آدھ مچھلی پکڑ کے اپنا گزارا کر لیتا تھا لیکن اب یہ تالاب مچھلیوں سے خالی ہو جائے گا اور میں اس بڑھاپے میں فاقے سے مر جاؤں گا۔ آج دو مچھیرے ادھر سے گزرے۔ کہہ رہے تھے اس میں خوب مچھلیاں بھری ہوئی ہیں۔ اگلے مہینے سے اس میں بڑے بڑے جال ڈالیں گے اور سب کو ایک ساتھ پکڑ لیں گے۔" کچھوے نے جا کر یہ خبر مچھلیوں کو سنائی۔ گھبرا کر بگلے کے قریب آئیں اور کہنے لگیں "ہم نے یہ بُری خبر سُنی ہے، بتائیے ہم کیا کریں؟ ایک خرد مند کو مصیبت کے وقت دشمن کا بھی مشورہ لے لینا چاہیے۔ خاص طور پر جب کہ اس میں دشمن کا بھی فائدہ ہو ــــ آپ کی زندگی بھی تو آخر ہمارے اوپر منحصر ہے۔" بگلے نے مسکین صورت بنائے کہا "مچھیروں کا مقابلہ ناممکن ہے۔ ہاں ایک صورت سمجھ میں آتی ہے یہاں سے قریب ہی اس پہاڑی کے پیچھے ایک جھیل ہے اس کا پانی آئینے سے زیادہ شفّاف ہے۔ اگر تم سب کسی طرح وہاں منتقل ہو جاؤ تو ساری زندگی امن چین سے گزار دگی۔" مچھلیاں کہنے لگیں " اے ہے یہ تو بڑی اچھی صورت ہے لیکن بغیر آپ کی مدد کے وہاں ہم کیسے جا سکتے ہیں" بگلے نے جواب دیا " مجھے مدد کرنے میں تامّل نہیں مگر

وقت لگے گا، اتنا تو میں کر سکتا ہوں کہ دو دو تین تین مچھلیوں کو روز اپنی چونچ میں دبا کر لے جاؤں اور اس جھیل میں پہنچا دوں۔" مچھلیاں راضی ہو گئیں اور اس طرح بگلا روز مچھلیوں کو پہاڑی کے پیچھے کھاتا رہا"۔۔۔۔ یہ کہانی کلیلہ دمنہ میں ہے لیکن اب ہماری لڑکیوں کو نہ کہانیاں یاد ہیں، نہ لوریاں، نہ گیت۔ نہ ان کو گلستاں کی خبر ہے نہ کلیلہ دمنہ کی۔ یہ صورت ہندوستان ہی میں نہیں پاکستان میں بھی ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اپنے بچّے کا قصہ سناتے تھے جو کراچی کے انگریزی اسکول میں پڑھتا ہے۔ ایک روز بدایوں کے ایک بزرگ ان کے یہاں پہنچے اور اس بچے سے پوچھا "میاں! والد صاحب قبلہ تشریف رکھتے ہیں" بچّہ اندر گیا اور ماں سے پوچھا "ممّی، ہمارے نیبرہڈ میں کوئی والد صاحب قبلہ رہتے ہیں۔ ایک آدمی پوچھتا ہے"۔۔۔۔ ایک امریکی دوست مجھ سے کہتے تھے کہ آپ تسلیم کریں یا نہ کریں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں ایک متوازی اُردو پیدا ہو رہی ہے جس میں جملے کے جملے اور فقرے کے فقرے انگریزی کے ہیں۔ الفاظ کا تو شمار ہی نہیں۔"

ہماری یونی ورسٹیوں میں ادب کی طرف تو توجہ ہو رہی ہے لیکن زبان کی طرف توجہ نہیں ہے۔ اس کے لیے امریکہ اور روس کی طرح ایک علیحدہ ادارہ ہونا چاہیے جو ان تمام امور کا جائزہ لے اور اس کی رائے وقیع سمجھی جائے۔

خواجہ احمد فاروقی

حصّۂ اوّل

زبان کیا ہے؟

جناب عتیق احمد صدیقی

انسان کو دوسرے حیوانوں سے ممیز کرنے والی خصوصیات میں "زبان" کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اپنی سماجی اور معاشرتی اہمیت نیز باہمی افہام و تفہیم کا واحد ذریعہ ہونے کے باعث زبان ہی انسان کو انسان بناتی ہے۔ ایک جرمن پروفیسر کا قول ہے کہ انسان صرف زبان کی وجہ سے انسان ہے۔ یہ بات ہے بھی ٹھیک۔ زندگی کا کون سا شعبہ ہے جہاں زبان کی کارفرمائی نہیں اور زندگی کا کون سا لمحہ ہے جب زبان کے بغیر انسان کا تصور ممکن ہے۔ انسانی زندگی میں اس کی اہمیت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ زندہ رہنے کے لیے خواہ نہ سہی، لیکن سماجی اور انسانی" زندگی" کے لیے زبان لازمی ہے۔ اس کے بغیر تہذیب کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ تمام علوم کی بنیاد زبان پر ہی ہے۔ انسانی تخیل کے لیے زبان ناگزیر ہے۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں کی رائے میں زبان خود خیال ہے۔ زبان اور خیال کے ایک ہونے

کے تصور پر بحث کی جاسکتی ہے، لیکن اس سے اتنی بات ضرور واضح ہوجاتی ہے کہ زبان اور خیال کا تصور کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہے۔ خیال اور زبان کے اس باہمی رشتے سے فلسفۂ زبان کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ اور اس طرح زبان کے سوال پر غور کرنے کے لیے دو مختلف النوع علوم کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ زبان اور اس کی ماہیت پر لسانی نقطۂ نظر سے غور کیا جاسکتا ہے اور فلسفیانہ نقطۂ نظر سے بھی۔ اوّل الذکر کے ذیل میں زبان کے خارجی افعال وخواص اور داخلی تحریکات پر غور کیا جاسکتا ہے اور آخرالذکر کے ذیل میں خالص داخلی انداز سے، یعنی کون سے محرکات صدورِ زبان کا باعث ہوتے ہیں اور زبان سے کیا تحریکات پیدا ہوسکتی ہیں۔ زبان کے خارجی پہلو سے بحث کی جائے یا اس کے داخلی پہلو سے، لیکن ہر بحث سے پہلے یہ متعین کرنا لازمی ہوگا کہ زبان کیا ہے؟

اس سوال کے ساتھ ہی ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے۔ آیا زبانِ مطلق بھی کوئی چیز ہے یا مختلف زبانوں کا وجود ہی ہمیں زبان کا احساس دلاتا ہے؟ اس صورت میں زبانِ مطلق ایک کل ہوگی، جس کے اجزا مختلف زبانیں ہیں۔ یا یوں کہیے کہ زبانِ مطلق ایک تصور ہے جس کا معروضی اظہار مختلف زبانوں کی صورت میں ہوتا ہے۔ پھر یہ سوال کہ آیا زبان کی تعریف کے سلسلے میں زبان کے مجرد تصور پر غور کیا جائے یا اس کی عملی تطبیق پر؟ عملی تطبیق منفرد زبانوں (اردو۔ انگریزی۔ تامل۔ چینی وغیرہ) پر ہی ہوسکتی ہے۔ اس لیے کہ جب زبان کا تصور کیجیے، استعمال ہونے والی کسی نہ کسی زبان کا تصور اُبھرتا ہے۔ زبان کا ذریعۂ اظہار قوتِ گویائی ہے اور گویائی کی مظہر کوئی نہ کوئی زبان ہی ہوتی ہے۔ لیکن کیا ان میں سے کسی ایک زبان کو مدِنظر رکھ کر زبان کی تعریف متعین کی جاسکتی ہے؟ یہ ممکن تو ہے لیکن اس

میں ایک قباحت یہ ہوگی کہ ہر زبان بعض ایسی منفرد خصوصیات رکھتی ہے جو دوسری زبانوں میں نہیں پائی جاتیں۔ اس طرح متعین کی ہوئی زبان کی تعریف جملہ زبانوں کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ اس لیے زبان کے مجرد تصوّر کو سامنے رکھ کر ہی اس کی تعریف کا تعین ضروری ہوگا۔

زبان کیا ہے؟ یہ سوال نیا نہیں۔ انسان عرصۂ دراز سے اس پر غور کر رہا ہے اور ساتھ ہی بعض ایسے سوالوں پر بھی کہ زبان کب سے وجود پذیر ہوئی؟ کیسے وجود میں آئی؟ سب سے پہلے کس خطۂ ارض پر زبان کا وجود ہوا؟ سب سے پہلی زبان کون سی ہے؟ آیا یہ عطیۂ ربّانی ہے جو انسان کو یک بیک ودیعت ہوا، یا اس کا تدریجی ارتقا ہوا؟ ان آخر الذکر سوالوں کے جواب بھی دینے کی کوشش کی گئی، لیکن بحث ہمیشہ اُلجھ کر رہ گئی اور کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچا جا سکا۔ البتہ لسانیات نے پہلے سوال "زبان کیا ہے" کا شافی ووافی جواب دیا ہے۔ یہ جواب خود کئی دیگر سوالوں کے جواب سے متعین ہوتا ہے۔ زبان کیا کام انجام دیتی ہے؟ اس کا استعمال کون کرتا ہے؟ اور استعمال کس ماحول میں ہوتا ہے؟ زبان کی تخلیق کا ذریعہ کیا ہے؟ زبان اور خارجی اشیا کا کیا تعلق ہے؟ اس تعلق کی نوعیت کیا ہے؟

انسان کو بھوک لگتی ہے۔ کسی ہیبت ناک کیفیت کو دیکھ کر اس کے دل میں خوف پیدا ہوتا ہے۔ کسی دل کش منظر سے دل میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ ان سب کو وہ خود محسوس کرتا ہے۔ لیکن دوسروں پر بھی اپنے احساس کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ ہاتھ کے اشاروں، چہرے کے اُتار چڑھاو یا اچھل کود سے وہ ان اور اس طرح کے اپنے دوسرے احساسات کا اظہار کر سکتا ہے لیکن اظہارِ خیال کا سب سے زیادہ موثر اور مکمل ذریعہ اس کو زبان کی شکل میں حاصل ہوا ہے۔

انسان کے ذہن میں جو خیال پیدا ہوتا ہے اسے دوسروں تک پہنچانے کے لیے وہ زبان کا استعمال کرتا ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ زبان کا کام ترسیلِ خیال ہے۔ فلسفیانہ نقطۂ نظر سے اس پر بحث کی جا سکتی ہے کہ زبان اور خیال دو جداگانہ چیزیں ہیں یا دونوں ایک ہی ہیں۔ لیکن لسانیات کے نقطۂ نظر سے دونوں قائم بالذات ہیں اور ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے ہی ان پر غور کیا جا سکتا ہے۔ اگر زبان اور خیال کو ایک ہی چیز تصور کر لیا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ہر زبان کے لیے ایک جداگانہ خیال کی ضرورت ہوگی۔ حالانکہ عملی طور پر ایسا نہیں۔ زبان کو زیادہ سے زیادہ خیال کا لباس کہا جا سکتا ہے اور جسم ایک رہتے ہوئے لباس کی تبدیلی عین ممکن ہے۔ زبان کی فعالی قوت یہ قرار پاتی ہے کہ اس کے ذریعے ایک فرد کا خیال دوسرے تک منتقل ہوتا ہے۔

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دو افراد جو ایک دوسرے کی زبان نہیں جانتے، وہ ایک دوسرے پر اظہارِ خیال نہیں کر سکتے، گویا ترسیلِ خیال کا عمل رک جاتا ہے۔ کیا ہم ان دونوں کی زبانوں کو "زبان" کی تعریف سے خارج کر دیں گے؟ ایسا نہیں۔ اور یہ اس لیے نہیں کہ ان دو افراد کے درمیان محض اجنبیت ترسیلِ خیال میں حارج ہے۔ وگرنہ وہ دونوں زبانیں اپنی اپنی جگہ ترسیل کے لیے کافی ہیں۔ اس جگہ کو ان زبانوں کا دائرۂ کار کہا جا سکتا ہے جو ایک مخصوص معاشرے پر محیط ہوتا ہے۔ اس مخصوص معاشرے سے باہر زبان کی ترسیلی حیثیت اس وقت تک ساقط رہتی ہے جب تک کہ دوسرے لوگ اس کو سیکھ نہ لیں۔ اس طرح ایک زبان ایک مخصوص معاشرے میں پیدا ہو سکتی، پنپ سکتی اور پروان چڑھ سکتی ہے۔ اپنی توسیعی شکل میں اس کا

دائرۂ کار ان حدود سے باہر پھیل سکتا ہے۔ یہاں معاشرے کا مفہوم لسانی معاشرہ ہے یعنی وہ سماجی گروہ جس کے افراد اظہار خیال کے لیے ایک سا ذریعہ استعمال کرتے ہیں۔ یہاں یہ امر بھی مدِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ گویائی انسان کی جبلت میں اس طرح داخل نہیں جس طرح مثلاً اس کا چلنا یا بھوک محسوس کرنا۔ لیکن یہ قوت جبلی اس لیے معلوم ہوتی ہے کہ انسان خلا میں پیدا نہیں ہوتا، بلکہ سماج میں پیدا ہوتا ہے اور اسی سماجی ماحول سے اس عادت کو اخذ کرتا ہے۔ اگر بچے کو پیدا ہوتے ہی انسانی سماج سے الگ کر دیا جائے تو بھی وہ اپنی جبلت کو باقی رکھے گا۔ وہ بھوک کا احساس بھی کرے گا، خوشی اور غم کا احساس بھی اس کے اندر پیدا ہوگا اور چلنا بھی شروع کر دے گا (ہو سکتا ہے چلنے کا انداز عام انسانی انداز سے قدرے مختلف ہو) لیکن گویائی سے محروم ہو جائے گا۔ یا نومولود بچے کو ایک سماج سے دوسرے سماج میں منتقل کر دیا جائے تو اس کا چلنا، اس کا دیکھنا، اس کا خوشی و غم کا محسوس کرنا بالعموم اسی طرح ہوگا جس طرح پہلے سماج میں ہوتا، لیکن اس کی بول چال پہلے سماج سے بالکل مختلف ہوگی۔ یعنی زبان ایک طرف جبلی کے مقابلہ میں اکتسابی ہے اور دوسری طرف انفرادی کے مقابلے میں سماجی عمل ہے۔

انسانوں کے علاوہ بعض حیوانات میں بھی ترسیل کا عمل ہوتا ہے۔ اس کی بہترین مثال شہد کی مکھیوں سے پیش کی جا سکتی ہے۔ شہد کی مکھیاں گروہ بنا کر رہتی ہیں۔ خدمت گار مکھیاں رس کی تلاش میں نکلتی ہیں۔ جب وہ ایسی جگہ پا لیتی ہیں جہاں شہد کے لیے رس موجود ہے تو واپس آکر دوسری مکھیوں کو مطلع کرتی ہیں۔ اطلاع دہی کا یہ عمل ان کی اڑان میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ خبر رساں مکھی چھتّے تک آتی ہے۔ پھر ایک خاص زاویے سے ایک خاص دوری تک اڑتی ہے اور پھر واپس آتی ہے۔ اس عمل کے دہرانے سے دوسری مکھیاں اس کی سمت اور فاصلے

سے باخبر ہو جاتی ہیں لیکن اس ترسیل کو زبان سے اس لیے تعبیر نہیں کیا جا سکتا کہ مکھیوں میں یہ عمل سماجی سے زیادہ وہبی ہے۔ مکھی نے اسے کسی سے سیکھا نہیں بلکہ اس کی جبلت میں یہ امر شامل ہے۔ زبان کے ساتھ بعض دوسری شرائط اور بھی ہیں جن کو مکھیوں کا یہ ترسیلی عمل پورا نہیں کرتا۔ ان پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔

زبان جس چیز سے مرکب ہے وہ انسانی آوازیں ہیں۔ اور آوازیں بھی وہ جو انسان کے مُنہ اور اس کے آس پاس کے اعضا کی حرکات و سکنات سے وجود پذیر ہوتی ہیں۔ ان اعضا کی حرکت ہوا میں کچھ لہریں پیدا کرنے کی ذمہ دار ہے اور بس۔ ان لہروں کا سماعی نتیجہ وہ آوازیں ہیں جو زبان کی ترکیب میں کام آتی ہیں۔ اس بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسان کے اعضائے نطق[۱] کے ذریعے پیدا ہونے والی آوازوں سے زبان کا ہیولیٰ تیار ہوتا ہے۔ یہاں اس بات کی تحدید ہو جاتی ہے کہ اگر تالی بجا کر یا قدموں کی چاپ سے' یا ہوا کے چلنے سے' یا نقارے پر چوٹ لگا کر' یا ایسے ہی کسی اور ذریعے سے آواز پیدا ہو تو وہ زبان کے زمرے میں شامل نہیں ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی اس طرح کی آوازوں سے زبان کا کام لیا جائے۔ یہ ایک عارضی قائم مقامی ہوگی۔

انسان کو غصہ آتا ہے تو چہرے کی رگیں تن جاتی ہیں' دورانِ خون تیز ہو جاتا ہے؛ شدید غم میں آواز بھرّا جاتی ہے؛ خوف سے جسم میں کپکپی پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ سب جبلی افعال ہیں اور غیر اختیاری طور پر سرزد ہوتے ہیں اور ان کیفیات

---

[۱] مُنہ، زبان، دانت، حلق وغیرہ ـــ یہ اعضا اگرچہ بنیادی طور پر دوسرے کاموں کے لیے ہیں لیکن انسان نے ان کو گویائی کا ذریعہ بھی بنایا ہے اس لیے ان کو اعضائے نطق کہا جاتا ہے۔

کا جزو ہیں۔ کبھی انتہائی کرب کے عالم میں غیر ارادی طور پر انسان کے منہ سے اوہ، اف، اونہہ وغیرہ آوازیں نکل جاتی ہیں۔ کبھی انتہائے مسرت میں وہ چلّا اٹھتا ہے۔ یہ آوازیں صرف اس بات کا اعلان نہیں کہ ایسی کیفیت محسوس کی گئی بلکہ خود اس درد و کرب یا مسرت کا حصہ ہیں اور غیر ارادی طور پر شدید جذبات کی طرح چھلک پڑتی ہیں۔ یہ انسان کی جبلت کا جز ہیں اور جیسا پہلے مذکور ہوا زبان جبلت نہیں ہے۔ زبان ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آوازیں، تجربات، جذبات، کیفیات وغیرہ کی مظہر ہوں، ان کا جز نہ ہوں اس صورت میں یہ آوازیں ہماری ذہنی واردات کی نمایندگی کرتی ہیں۔ کوئی کہے کہ "میں شدید درد محسوس کر رہا ہوں" یا "اوہ" کہے اور سماجی طور پر اس کے معنی بھی یہی متعین کیے جائیں "میں شدید درد محسوس کر رہا ہوں" تو یہ آوازیں زبان کا حصہ ہوں گی، کیوں کہ اس جذبے کا اظہار کرتی ہیں، خود اس کا جز نہیں۔ گویا بول صرف علامت ہوتے ہیں، وہ خود وہ شے یا واقعہ نہیں بن جاتے جس کا اظہار ان کے ذریعے ہوتا ہے، اسی حقیقت کے اظہار کے لیے کہا جاتا ہے کہ بول بامعنی ہوں تب ہی وہ زبان کا حصہ بنتے ہیں۔ یہاں معنی سے مراد وہ شے یا کیفیت یا جذبہ وغیرہ ہوتے ہیں جن کا اظہار ان کے ذریعے ہوتا ہے۔ کسی بول کے معنی اس کے مختلف محل استعمال میں واقع ہونے سے اس کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں۔ اس طرح معنی ہماری عملی دنیا سے تعلق رکھتے ہوئے سماجی اور معاشرتی حیثیت سے ایک مفروضی حقیقت ہوتے ہیں۔ چونکہ زبان علامتوں کا مجموعہ ہوتی ہے، اس لیے یہ ضروری نہیں کہ ہم صرف ان اشیا یا کیفیات کے بارے میں گفتگو کر سکیں جو ہمارے سامنے موجود ہیں، بلکہ ان کے بارے میں بھی گفتگو کرنا ممکن ہے جو ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں۔ خواہ ان کا وجود ماضی میں ہو یا مستقبل میں۔

چونکہ علامتیں خود جزوِ شے نہیں ہوتیں بلکہ ان کا صرف صوتی اظہار ہوتی ہیں، اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان علامتوں کا تعین کیسے ہوتا ہے؟ اور یہ تعین کون کرتا ہے؟ اور کیا ان علامتوں اور اشیا میں کوئی باہمی ربط ہوتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ شے اور علامت کا کوئی منطقی یا معنوی تعلق نہیں ہوتا۔ نہ علامت میں اپنے معنی سے متعلق کوئی علامت پوشیدہ ہوتی ہے بلکہ استعمالِ عام سے علامت اور شے میں خارجی تطبیق پیدا ہوتی ہے۔ ان علامتوں اور خارجی مظاہر سے ان کے تعلق کا احساس نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا رہتا ہے اور اہلِ زبان ان علامات اور ان کی خارجی تطبیق سے اس درجہ مانوس ہو جاتے ہیں کہ وہ ان کو بالکل منطقی اور عقلی سمجھنے لگتے ہیں۔ مثلاً گھوڑا، سورج، کمرہ، میز وغیرہ علامات سے جو تصور ہمارے ذہن میں آتا ہے، وہ محض عرصۂ دراز کے استعمال کی وجہ سے ہی پیدا ہوا ہے ورنہ اس کی کوئی دلیل نہیں دی جا سکتی کہ کمرے کو گھوڑا اور میز کو کمرہ کیوں نہیں کہا جا سکتا۔ اگر علامت اور اس کے خارجی مظہر میں کوئی داخلی ربط ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ایک خاص چوپایے کو ہندوستان میں (اور ہندوستان کے بھی ایک خاص علاقے میں) کُتّا، ایران میں سگ، عرب میں کلب، انگلستان میں Dog، فرانس میں Chien اور زیکوسلوواکیہ میں Pes کہا جاتا۔

کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ اس وقت علامت اور معنی کا کوئی داخلی باہمی تعلق نہیں ہے لیکن ابتدا میں ضرور کوئی تعلق رہا ہوگا اور اشیا کی خصوصیات کے اعتبار سے یا ان کی کسی حرکت مثلاً آواز وغیرہ کی نقل میں ہی ان کے لیے اشاراتی علامات مقرر کی گئی ہوں گی۔ لیکن اس خیال کا اطلاق معدودے چند علامات پر ہی ہو سکتا ہے اور ان میں بھی بعض مشابہتیں ہونے کے باوجود مکمل ہم آہنگی نہیں ہو سکتی۔

بالآخر اسی نتیجے پر پہنچا ہوگا کہ آوازوں کی مخصوص ترتیب سے پیدا شدہ اکائیوں کے معنی کسی ایک جماعت یعنی سماجی گروہ کے اتفاقِ رائے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس میں کسی منطقی استدلال کو دخل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے پیچھے انسان کی خود مختاری اور من مانا انداز کارفرما ہوتا ہے۔ چونکہ یہ علامتیں خود اختیاری ہوتی ہیں، یعنی ان کے اندر خود کوئی معنی پوشیدہ نہیں ہوتے اور ان کی سماجی حیثیت بھی ہوتی ہے، اس لیے معاشرے کی نفسیاتی اور ذہنی تبدیلیاں ان پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔ اس لیے زبان کے ارتقائی عمل میں یہ بات عام ہے کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ علامت کا مفہوم بدل کر کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ مثلاً لفظ "رنڈی"، جو اٹھارویں صدی تک مطلقاً عورت کے لیے استعمال ہوتا تھا، اب بازاری عورت (طوائف) کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔ یا اس کے برعکس کبھی مفہوم اپنی جگہ باقی رہتا ہے اور علامت میں ایسی تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں کہ اس کو شناخت کرنا آسان نہیں ہوتا۔ مثلاً سنسکرت کا لفظ "مش" اُردو تک آتے آتے "مچھلی" بن گیا۔ کسی بھی زبان کا بولنے والا ایک زبان کے مختلف استعمالات اور اس کی اطلاقی کیفیت کو سن کر ہی اس کے معنی ذہن نشین کرتا ہے۔ یہی صورت اس وقت ہوتی ہے جب بچہ آغوشِ مادر میں زبان سیکھتا ہے۔

اب تک ہم علامات کو خود اختیاری اور من مانے طور پر استعمال کرنے کی بات کرتے رہے ہیں۔ لیکن یہ من مانا انداز ضابطے اور قاعدے سے بے نیاز نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر زبان کا نظام بڑے ضابطوں کا پابند ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ نظام کسی ایک شخص کا ترتیب دیا ہوا نہیں ہوتا اور نہ کسی خاص وقت میں یک بہ یک وجود میں آجاتا ہے، بلکہ سالہا سال کا استعمال اور رواج اس

ضابطے کے وجود کا باعث ہوتا ہے اور اسی کے تحت زبان کے تمام اجزا کی حیثیت متعین ہوتی ہے۔ ہر زبان میں یہ نظام تہ در تہ ہوتا ہے۔ بالعموم پہلی سطح آوازوں کی ترکیب و ترتیب ہوتی ہے یعنی چند آوازوں کو ملا کر بامعنی اکائیاں یا علامتیں بنائی جاتی ہیں اور زیادہ صحیح یہ کہ بن جاتی ہیں اور پھر ان اکائیوں کی ترتیب سے کسی پورے خیال کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ عرف عام میں پہلی ترتیب کو لفظ اور دوسری کو جملے سے تعبیر کرتے ہیں۔ لفظوں کی ساخت اور جملوں میں ان کی ترتیب مختلف زبانوں میں مختلف ہوتی ہے لیکن ہر زبان میں ترتیب کا یہ ڈھانچا متعین بھی ہوتا ہے۔ تعین کی صورت کسی خاص ترتیب کے بار بار دہرائے جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح ایک نمونے کو دیکھ کر دوسرے مجموعے (جملے) تیار کیے جا سکتے ہیں اور اس طرح جو سانچے تیار ہوتے ہیں ان میں متبادل اجزا کے استعمال سے زبان کا نظام بنتا ہے۔ مثلاً اگر اُردو میں یہ نامکمل جملہ کہا جائے :

لڑکا ...... کتاب .... ہے

تو خالی جگہوں کو متعدد اکائیوں (لفظوں) سے پُر کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً :

لڑکا "اپنی" کتاب پڑھتا ہے

" "مجھے" " دیتا "

" "نئی" " پسند کرتا " وغیرہ

یہاں ہم نے دیکھا کہ اپنی کی جگہ مجھے یا نئی وغیرہ بھی استعمال ہو سکتا ہے، اسی طرح پڑھتا کے بجائے دیتا اور پسند کرتا وغیرہ کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ گویا زبان میں استعمال ہونے والے بعض عناصر بعض دوسرے عناصر سے تبدیل کیے جا سکتے ہیں لیکن اس تبادل پذیری پر بھی زبان کا ضابطہ پابندی عائد کرتا ہے۔

جب تک ہم زبان کے نظام کا دعویٰ کرتے ہیں، اس وقت تک یہ ممکن نہیں کہ زبان کا کوئی بھی لفظ کسی بھی لفظ کی جگہ استعمال کیا جا سکے مثلاً ہم یہ نہیں کہہ سکتے:

لڑکا اس کا کتاب میز ہے

یہ بھی نہیں کہہ سکتے:

لڑکا کی کتاب اچھا ہے وغیرہ

اسی استعمال کی بنا پر اجزائے زبان کو انواع میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور اسی طرح کائنات کی لاتعداد اشیا معدودے چند گروہوں میں تقسیم ہو جاتی ہیں۔ خارجی دنیا میں اشیا کا تعین مشکل ہوتا ہے لیکن زبان میں، مثال کے طور پر، اسم اور فعل دو جداگانہ تقسیمیں ہیں۔ ایک اشیا کو ظاہر کرتا ہے اور دوسرا کام کو۔ غرض جہاں زبان میں ابتدائی طور پر خود اختیاری کارفرما ہوتی ہے، وہیں سے زبان کے ضابطے بھی شروع ہو جاتے ہیں۔ کسی بھی زبان کے مروجہ نظام کے تحت لفظ یا جملے کی بہت سی صورتیں قابل قبول ہو سکتی ہیں اور بہت سی دوسری صورتیں غلط قرار پائیں گی۔ ہر زبان کا اپنا ایک نظام ہوتا ہے جو سماجی، معاشرتی، تاریخی اور جغرافیائی حالات کے تحت بنتا ہے اور رواج عام اور مسلسل استعمال اس کو سند قبولیت بخشتے ہیں۔

سیٹی بجانا، کھانسنا یا زبان سے ٹک ٹک کرنا اگرچہ ملفوظی آوازیں ہیں، کسی معاشرے میں ہی ان کا استعمال بھی ہوتا ہے اور کبھی کبھی ان سے معنی بھی اخذ کیے جاتے ہیں لیکن چونکہ یہ کسی نظام کے تحت نہیں آتیں اس لیے ان کو بھی زبان کے زمرے میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح چڑیوں کا چہچہانا، شیر کا غرانا، بلی کا میاؤں میاؤں کرنا اگرچہ ترسیل کا ذریعہ ہیں لیکن زبان کے زمرے میں شامل نہیں۔ یہ جہاں زبان کی بعض دیگر شرائط کو پورا نہیں کرتے، ابھی تک کسی نظام کے تحت بھی نہیں

لائے جا سکے۔ ان آوازوں کو زبان کے زمرے میں شامل کرنے کے لیے ہمیں اس وقت کا انتظار کرنا پڑے گا جب انسان اپنے علم، تجربے اور تحقیق سے ان آوازوں کی تہ میں کار فرما نظام کو معلوم کر لے۔

مندرجۂ بالا مباحث کا لب لباب یہ ہے کہ زبان (۱) ترسیل خیال کا ذریعہ ہے جسے (۲) ایک سماج کے افراد استعمال کرتے ہیں؛ (۳) یہ استعمال علامتوں کے ذریعے ہوتا ہے جو (۴) صوتی ہوتی ہیں اور (۵) خود اختیاری ہوتی ہیں نیز (۶) یہ علامتیں ایک ضابطے میں مربوط ہوتی ہیں۔

ان نتائج کو یکجا کیا جائے تو زبان کی تعریف کا تعین یوں کیا جا سکتا ہے کہ زبان صوتی خود اختیاری علامتوں کا منظم مجموعہ ہوتی ہے جس سے کسی سماجی گروہ میں ترسیل خیال کا کام لیا جاتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ بعض جانوروں کی بولی یا ان کی حرکات اس تعریف کی کچھ شرائط پوری کرتی ہوں، لیکن انسانی زبان کے علاوہ اب تک کی دریافت شدہ حرکات یا آوازوں یا ترسیلی ذرائع میں سے کوئی بھی ان سب شرائط کو بیک وقت پورا نہیں کرتا۔

ان مباحث اور اس تعریف کے پیشِ نظر زبان کی بعض خصوصیات کا تعین بھی کیا جا سکتا ہے جو اسے دوسرے علامتی اور ترسیلی ذرائع یا افعال سے جدا اور ممتاز کرتی ہیں۔ یہ خصوصیات مذکورہ شرائط سے بنیادی طور پر مختلف نہیں بلکہ کچھ ان کی توسیعی و ترمیمی شکلیں ہیں یا ان سے پیدا شدہ بعض نتائج کا احصا کرتی ہیں۔

ہر زبان اپنی ترتیب کے اعتبار سے دہرے عمل سے گزرتی ہے۔ پہلی سطح پر آوازوں کی ترتیب ہوتی ہے۔ ہر بول چند آوازوں سے مل کر بنتا ہے۔ پھر چند بول مل کر مکمل مفہوم کے فقرے بناتے ہیں۔ ترتیب کی پہلی سطح صوتیوں کی ہے اور دوسری

سطح تشکیلیوں کی۔ گویا ہر زبان میں اس کے صوتی اور تشکیلی نظام ساتھ ساتھ کام کرتے ہیں۔ اس دوہرے عمل کی وجہ سے ہی اظہارِ بیان کے لیے غیر معین اصوات کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چند اصوات سے کثیر تعداد میں کلمات اور کلمات کی محدود تعداد سے لامحدود فقرے بنائے جاسکتے ہیں۔ اس طرح اظہارِ خیال کے لیے لامحدود علامتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ اس کو زبان کو دہرے پن سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

زبان کی دوسری خصوصیت اشتقاقی تخلیقیت ہوتی ہے۔ زبان میں جب کوئی نیا لفظ داخل ہوتا ہے تو اہلِ زبان بلا تامل اس کے دوسرے مشتقات کا استعمال شروع کر دیتے ہیں۔ یہ مشتقات کہاں سے آئے؟ لفظ انھیں اپنے ساتھ نہیں لایا۔ لیکن چونکہ اس طرح کی ساختیں زبان میں پہلے سے موجود ہوتی ہیں، انھیں کے قیاس پر کسی بھی نئے لفظ کو ڈھال لیا جاتا ہے۔ زبان کی خصوصیات میں اسی لچک کے باعث نئے طرزِ اظہار کی گنجائش نکلتی ہے اور اسی کے باعث نئے خیالات کا اظہار ممکن ہوتا ہے اور اسی کے باعث بالکل اجنبی صورتِ حال کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ اس کی بڑی دل چسپ مثالیں ہمیں بچوں کی زبان میں مل جاتی ہیں۔ بچہ جب زبان سیکھنے کی منزل میں ہوتا ہے تو وہ اپنے قیاس سے کام لے کر بعض ایسی ترکیبیں استعمال کرتا ہے جن کا زبان میں وجود نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک بچے نے کہا: "سب عورتیں اور مردیں وہاں ہیں"۔ جملے کی اس ساخت میں اردو میں مرد کی جمع۔ یں کے اضافے سے نہیں بنائی جاتی بلکہ واحد شکل (مرد) ہی جمع کا کام دیتی ہے۔ لیکن "عورتیں" کے قیاس پر بچے نے "مردیں" بنالیں:

عورت : عورتیں :: مرد : ×

اسی باعث اگر قائل دورانِ گفتگو کوئی ایسا لفظ استعمال کرجائے جو نہ اس نے کبھی خود بولا اور سنا ہو اور نہ ہی دوسروں نے، تو بھی اس کی بات سمجھ لی

جاتی ہے اور کبھی کبھی تو قائل اور سامع دونوں کو اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا کہ کوئی اس نوع کا لفظ بولا گیا ہے۔ زبان کی لغزش سے ادا شدہ الفاظ اس کی بہترین مثال پیش کرتے ہیں۔

کیا کسی کلمے اور اس کے مفہوم میں کوئی منطقی ربط ہوتا ہے؛ یعنی کیا اس بات کی کوئی منطقی توجیہ ہے کہ کیوں ایک خاص کلمہ کسی ایک خاص شئے یا کیفیت پر دلالت کرتا ہے؟ زبان کی تعریف کی بحث میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ ایسی صورت شاذ ہی پیدا ہوتی ہے۔ یہ ربط من مانے انداز کا ہوتا ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ لفظ و معنی محدود نہیں رہتے؛ بلکہ ہر کلمہ اپنے اندر معنی کی بے پناہ صلاحیتیں پوشیدہ رکھتا ہے۔ اگر کلمہ و معنی کا یہ تعلق جسمانی یا کسی دیگر مطابقت پر مبنی ہوتا تو اس طرح کا جمود پیدا ہو جاتا۔ بالکل ایسے ہی جیسے تصویری خط کے ذریعہ اظہار بیان محدود سے محدود تر ہو جاتا ہے۔ اسے زبان کے "من مانے پن" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

زبان کی ایک اور خصوصیت ہے جسے تبادل پذیری کہا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ذی روح جو مرسل ہے، مرسل الیہ بھی ہو سکتا ہے۔ قائل اور سامع کا مقام تبدیل ہو سکتا ہے۔ سامع قائل ہو سکتا ہے اور قائل سامع بن سکتا ہے۔ سامع جو کچھ سُن کر سمجھ سکتا ہے اصولاً اسے خود بھی ادا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ انسانی زبان کے علاوہ دیگر حیوانات میں یہ تبادل پذیری نہ ہونے کے برابر ہے۔

ترسیل کا عمل دو طرفہ ہوتا ہے۔ ایک ذی روح کے کسی ترسیلی عمل سے دوسرا ذی روح متاثر ہوتا ہے۔ زبان کے ذریعے انسان صرف اپنے جذبات و احساسات کا اظہار ہی نہیں کرتا بلکہ دوسروں میں اس احساس کو جگانے کا باعث بھی بنتا ہے۔

اس عمل میں خارجی جسمانی حرکات کا عمل بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ اسے اصطلاحاً "تخصیص" کہا جا سکتا ہے۔ تخصیص کا درجہ اس سے متعین ہوتا ہے کہ تاثر انگیزی کس حد تک جسمانی حرکات سے معرا ہے۔ جسمانی حرکات کو جتنا کم دخل ہوگا اسی قدر تخصیص زیادہ ہوگی۔ خاص جسمانی حرکات سے پیدا شدہ تاثرات تخصیص سے بالکل عاری ہوتے ہیں۔ ایک شخص جو سامنے کھڑا ہے وہ ہمارے ہاتھ کے اشارے سے سمجھ سکتا ہے کہ اسے بلایا جا رہا ہے لیکن "یہاں آؤ" کہہ کر بھی اس کے دل میں یہ احساس پیدا کیا جا سکتا ہے۔ دوسری صورت میں ہاتھ کی جسمانی حرکت درمیان سے نکل گئی اور تاثر انگیزی خارجی جسمانی حرکت کے بغیر عمل میں آئی۔ اس طرح اس ترسیل میں تخصیص کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ دیگر حیوانات کی اب تک معلوم شدہ ترسیلی عادتوں میں انسانی زبان سب سے زیادہ تخصیص کی حامل ہے۔

ایک اور خصوصیت ہے جسے "بُعد" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ کیا ہم سیب کی بات اسی وقت کر سکتے ہیں جب سیب ہمارے سامنے ہو؟ یا سر کے درد کا بیان صرف اس وقت کر سکتے ہیں جب سر میں واقعی درد ہو رہا ہے؟ ایسا نہیں۔ سیب کی شکل، اس کے رنگ، اس کے ذائقے وغیرہ کی بات اس وقت بھی کی جا سکتی ہے جب سیب ہمارے سامنے نہیں ہے، اسے دیکھے اور کھائے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا ہے یا اس کی خواہش ہمارے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح سر کے درد کا بیان اس وقت بھی کیا جا سکتا ہے جب سر میں درد نہیں ہے۔ گویا اشیا و کیفیات کو مقدمہ وجزا سے بے نیاز ہو کر بھی زیر بحث لایا جا سکتا ہے۔ بُعد کی اس خصوصیت میں بُعدِ مکانی اور بُعدِ زمانی دونوں شامل ہیں۔ انسانی گفتگو کا بڑا حصہ اسی خصوصیت پر مبنی ہوتا ہے۔ دیگر حیوانات میں ترسیل کا جو تھوڑا بہت عمل ہوتا ہے، اس کی محرک سامنے والی چیزیں ہوتی ہیں۔ ان میں غیر موجود کے

متعلق ترسیلی صلاحیت مفقود ہوتی ہے۔ شہد کی مکھیوں کی ترسیل میں کسی حد تک یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔ خدمت گار مکھی نباتاتی رس کا پتہ لگاتی ہے اور واپس آکر دوسری مکھیوں کو مطلع کرتی ہے۔ اطلاع یابی اور اس اطلاع دہی میں کسی حد تک بعد مکان و زمان کی کیفیت موجود ہے۔ کسی حد تک سے مراد یہ ہے کہ زیادہ دیر ہو جانے پر مکھی کے لیے اطلاع دہی ممکن نہیں رہتی۔ برخلاف اس کے انسان زبان کے ذریعے بعید سے بعید تر کے بارے میں بھی گفتگو کر سکتا ہے۔

ترسیلی عمل کے لیے اس ترسیلی نظام پر قدرت حاصل ہونا بھی ضروری ہے اس کی دو صورتیں ہیں یا تو کسی ذی روح کو نسلی طور پر وراثتاً یہ قدرت حاصل ہوتی ہے یا تربیت کے ذریعے۔ تربیت میں سیکھنے کو دخل ہوتا ہے اور صرف سیکھنا ہی کافی نہیں بلکہ سکھانے کا عنصر بھی شامل ہونا ضروری ہے اور جو کچھ سکھایا جا رہا ہے اس کی پہلے سے موجودگی بھی ضروری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر نئی عمارت کے لیے بنیاد پہلے سے موجود ہوتی ہے۔ یہ شرف صرف انسانی زبان کو حاصل ہے۔ اسی میں زبان کے ارتقا، توسیع اور اس کی کثرتِ استعمال کا راز مضمر ہے۔ ہر نسل گذشتہ نسل کا سرمایہ، کچھ اضافے کے ساتھ، اگلی نسل کو منتقل کر دیتی ہے۔ دوسرے کسی ذی روح میں ترسیلی عمل اکتسابی نہیں، بلکہ وہبی ہوتا ہے۔ چونکہ یہ ایک نظری خصوصیت کے طور پر ہر ذی روح کو حاصل ہوتا ہے اس لیے ہر متنفس کی صلاحیت اس کے ساتھ ہی ختم بھی ہو جاتی ہے۔ گویا انسانی زبان میں ماضی، حال، مستقبل تینوں ایک رشتے میں منسلک ہو جاتے ہیں اور یہ سلسلہ لامتناہی طور پر جاری رہتا ہے، جب کہ اس کے علاوہ کسی بھی ذی روح میں نہ ماضی حال بنتا ہے اور نہ حال مستقبل میں منتقل ہوتا ہے۔

ایک آخری خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر زبان اپنی حیثیت میں مکمل ہوتی ہے۔

یہ ہو سکتا ہے کہ ایک زبان میں ذخیرۂ الفاظ بہت کم ہو، لیکن اس کے بولنے والے اپنی ذہنی واردات اور قلبی کیفیتوں کو اسی طرح ادا کر سکتے ہیں جس طرح ایک اس زبان کا بولنے والا جس میں ذخیرۂ الفاظ کی کمی نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی خاص شے یا کیفیت کے لیے کسی زبان میں الفاظ نہ ہوں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ زبان نامکمل ہے۔ یا اس شے یا کیفیت کے اظہار میں معذور ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ صرف ہو سکتی ہے کہ اس زبان بولنے والوں کا تجربہ اس پر محیط نہیں ہے۔ عربی زبان میں گھوڑے اور اونٹ کے لیے متعدد الفاظ ہیں اور جرمن زبان میں فلسفے کی بے شمار اصطلاحیں ہیں۔ یہ اس بات کا اظہار ہے کہ جغرافیائی یا معاشی وجوہ کی بنا پر عرب میں گھوڑے اور اونٹ کو اہمیت حاصل ہے اور جرمنی کے لوگ فلسفے سے ذوق و شوق رکھتے ہیں جس کے نتیجے میں ایک جگہ ایک چیز کے لیے اور دوسری جگہ دوسری چیزوں کے لیے بے شمار الفاظ وجود میں آئے۔

یہ زبان کی بنیادی خصوصیات کہی جا سکتی ہیں اور اسی لیے ہر زبان میں ان سب کا بیک وقت مجتمع ہونا ناگزیر ہے۔ اگر کسی عمل میں یہ سب خصوصیات مجموعی طور پر موجود نہ ہوں تو وہ کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن زبان نہیں۔

کتابیات

1. JOHN. P. HUGHES: THE SCIENCE OF LANGUAGE.
2. A.A. HILL: INTRODUCTION TO LINGUISTIC STRUCTURE.
3. LOUIS GRAY: FOUNDATIONS OF LANGUAGE.
4. W.M. URBAN: LANGUAGE & REALITY
5. BLOCH & TRAGER: OUTLINE OF LINGUISTIC ANALYSIS.
6. C.F. HOCKETT: A CORRSE IN MODERN LINGUSTICS.
7. SPAIR: LANGUAGE.

کچھ بیان اپنی زبان کا

راجہ شیو پرشاد ستارۂ ہند

کا خطبہ

جو سنہ ۱۸۶۸ء میں بنارس انسٹی ٹیوٹ کے جلسے میں پڑھا گیا

اس ملک کے ابتدائی رہنے والے کون تھے اور اُن کی زبان کیا تھی۔ یہ بات صرف خیال و قیاس سے تعلق رکھتی ہے۔ کیا وہ زبان تامل اور تلگو کی جڑ تھی کہ جواب تک دکھن میں جاری ہیں اور سنسکرت سے کچھ بھی علاقہ نہیں رکھتیں یا اُن بہت سی زبانوں میں سے کسی کی جڑ تھی جو بندھیا کے آس پاس جنگل جھاڑیوں کے رہنے والے پہاڑیوں کے درمیان رائج ہیں۔ ہم کو اس مقام پر اس بحث سے کچھ غرض نہیں، ہم کو اتنا ہی کہنا چاہیے کہ وہ سنسکرت ہرگز نہیں تھی۔ سنسکرت اس ملک میں آریہ لوگوں کے ساتھ یعنی براہمن، کشتری اور ویشیہ کے ساتھ کہ جن کی وہ بولی تھی، جانب شمال و مغرب یعنی ہندوکش ہمالے پار اُتر کُرو دیش سے آئی۔ ثابت

ہے کہ یہاں کے ابتدائی باشندے اس ملک کے ہر حصے میں جدا جدا قسم کی بولیاں بولتے تھے۔ اس سے مطلب نہیں کہ کس قدر ابتدائی باشندے قدم بقدم ہٹتے ہوئے دکھن کو چلے گئے خواہ دشوار گذار جنگل پہاڑوں میں پناہ گیر ہوئے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی جماعت نے شودر کے نام سے اپنے ظفریاب گورے دشمنوں کی یعنی آریہ لوگوں کی اطاعت قبول کی اور ان کی نئی آبادیوں میں آباد ہو کر شمار میں آئے گو نہایت خوار اور ذلیل اور خدمت گذار تھے تاہم وہی نہایت کارآمد تھے۔ مسافروں کو اکثر عورتوں کی تلاش رہتی ہے اور اس باعث سے اونچے برن والوں کو شودروں کی عورتیں لینے میں یقین ہے کہ کچھ زیادہ پرہیز نہ رہا ہو۔ بس اس حالت میں ضرور وہ خطرہ براہمنوں کے دل میں گذرا ہوگا کہ جس میں ابتدائی باشندوں کے ساتھ اس طرح کی راہ و رسم پیدا ہونے سے اُن کی زبان یعنی وید کی زبان بگڑ گئی تھی اور وہ بڑے شکر گذار ہوئے ہوں گے پانِنی کے جب اُس نے اپنی لاثانی اور حیرت انگیز قاعدے کی کتاب یعنی کومدی بنا کر اُن کی زبان کو قائم اور مستحکم کر دیا۔ پانِنی نے جبکہ اُس زبان کو قائم کیا، ضرور اس کو کسی قدر اُن آلائش اور آمیزشوں سے پاک و صاف بھی کرنا پڑا ہوگا کہ جو اُس وقت تک اُس میں بھر گئی تھیں اور اس لیے اس کا نام سنسکرت پڑا کیونکہ سن مکمل اور درست کو کہتے ہیں اور کرت کے معنی بنایا ہوا۔ سنسکرت کے معنی لغت میں موضوع و مصنوع، آراستہ، پیراستہ، مصفا، منزہ، مکمل، مقدس، منضبط، قواعد صرف و نحو کے بموجب بنائی ہوئی زبان، اتنے لکھے ہیں۔ براہمنوں کا پیشہ درس و تدریس تھا اور اُن کی بزرگی اور اُن کی روزی اسی سنسکرت زبان کے علم پر منحصر تھی۔ بلاشک ان کو حسب اقتضائے بشریت حسد ہوا ہوگا کہ کہیں عوام الناس یعنی ابتدائی باشندے اور دوغلے جن کو منوجی نے انتر پچھو لکھا ہے، اُس کو سیکھ نہ لیویں۔ انھوں نے یکبارگی

اُن کے لیے اُس کا دروازہ بند کر دیا اور اُنھیں اُس کے درس و تدریس کی کلّی ممانعت کی اور وجہ اُس ممانعت کی یہ قرار دی کہ پانِنی کا صرف و نحو سنسکرت ویدانگ یعنی جزوِ وید ہے کہ جس کو جہاں تک کوئی شودر سُن سکے، پڑھنا بھی منع ہے اور شودروں کو سکھلانے کی تو کون سی بات ہے اور نام اُس کا دیو بانی رکھا یعنی زبانِ دیو۔ دیو سنسکرت میں خدا، بادشاہ اور براہمن کو کہتے ہیں سا سوا اس کے عوام الناس کو اس حالت میں سنسکرت لفظوں کا صحیح تلفظ کرنا بھی بہت مشکل پڑا ہوگا اور پراکرت کے نام سے وہ اُن کی نئی نئی زبانیں وجود میں آ گئی ہوں گی کہ جو ایسا قریب قریب سنسکرت سے علاقہ رکھتی ہیں۔ پراکرت مشتق ہے پرکت سے یعنی طبیعت، اور اُس کے معنی ہیں مستخرج جب ایک زبان سے کوئی دوسری زبان نکلتی ہے، اصلی زبان کو اُس دوسری زبان کی پراکرت کہتے ہیں۔ ہیم چندر مشہور لغت والا لکھتا ہے کہ پراکرت کی اصل سنسکرت ہے کیونکہ جو کچھ سنسکرت سے نکلے، اسی کا نام پراکرت رکھا جا سکتا ہے۔ قطعِ نظر اس کے ایک اور بھی فرق ان دونوں لفظوں سے یعنی سنسکرت اور پراکرت سے معلوم ہوتا ہے۔ سنسکرت اُن لوگوں کو کہتے ہیں جو مہذب ہیں اور پراکرت اُن کو جو غیر مہذب ہیں، پس پراکرت ان بولیوں کا نام رہ گیا جو مفصل میں عوام الناس بولتے ہیں۔

الغرض پراکرت وہ زبان ٹھہریں جو سنسکرت الفاظوں سے بنی تھیں مگر بموجب تلفّظ عوام الناس یعنی جس طرح پر اُن کو عوام الناس استعمال میں لاتے تھے اور جن میں ابتدائی باشندوں کے الفاظ بھی ملے ہوئے تھے اور صرف و نحو اُس کا کسی قدر سنسکرت سے نکال کر ہر ایک ضلع کے حسب حالات و مواقع کچھ کچھ تغیر و تبدّل کر کے، اپنے اپنے طور پر ترتیب دے لیا تھا۔ ہم یہاں مثال کے طور پر چند الفاظ بتلاتے ہیں جو ابتدائی باشندوں کی زبان سے پراکرت میں آ گئے

اور سنسکرت سے کچھ علاقہ نہیں رکھتے۔

سنسکرت	نئی پراکرت یعنی ہندی	پرانی پراکرت
पादम्	गोड़	गोडम्
उदरम्	पेट	पोट
पुंश्चली	छिनाल	छिण्णालिया
स्तम्भः	खूंटा	खूंटा
मज्जन्तम्	डूबना	डुब्बन्तम्
पिव	घूंटना	घोट्ट

اور نیچے وہ الفاظ لکھے جاتے ہیں جو سنسکرت سے پراکرت میں آگئے۔

نئی پراکرت یعنی ہندی	پرانی پراکرت	سنسکرت
सुन	सुणु	शणु
घी	घिअम्	घृतम्
दही	दहि	दधि
नाच	णच्च	नृत्य
मुह	मुहम्	मुखम्
बहिरा	बहिर	बधिरः
मेह	मेहो	मेघः
कह	कहहि	कथय
बहू	बहू	बधूः

نئی پراکرت یعنی ہندی	پرانی پراکرت	سنسکرت
काज	कज्ज	कार्य्यम्
आज	अज्ज	अद्य
चंमार	चम्मारओ	चर्मकारः
कुम्हार	कुम्भारो	कुम्भकारः
सब	सब्बम्	सर्व्वम्
सच	सच्चम्	सत्यम्
हाथ	हत्थी	हस्तः
बुड्ढा	बुड्ढ	वृद्धः
सेठ	सेट्ठि	श्रेष्ठ
सूखा	सुक्ख	शुष्कः
पोथी	पोत्थओ	पुस्तकम्
पोखरा	पोक्खर	पुष्करः
दहिना	दहिणम्	दक्षिण
खेत	खेत्त	क्षेत्रम्
मट्टी	मट्टिआ	मृत्तिका
रीछ	रिच्छो	ऋक्षः
मोर	मोरो	मयूरः
बहिन	बहिणी	भगिनी
खंभा	खम्भो	स्तम्भः
बाहिर	बाहिर	बहिश्

سنسکرت	پرانی پراکرت	نئی پراکرت یعنی ہندی
हरिद्र	हलद्दी	हलदी
संध्या	संझा	संझा
सूची	सूई	सूई
गम्भीरम्	गहिरम्	गहिरा
षष्ठी	छट्ठी	छठ
त्रयोदश	तेरह	तेरह
षट्	छ	छ
विंशति	बीसइ	बीस
दुहिता	धीआ	धी
यष्टिः	लट्ठी	लाठी
वाष्पः	बाप्फो	बाफ
मत्स्यः	मच्छ	मछली
यः	जो	जो
उत्तिष्ठ	उट्ठेहि	उठ

جو ہو، یہ تمام پراکتیں یعنی یہاں کے ضلع ضلع کی بولیاں یعنی ماگدھی اردھ ماگدھی سورسینی، مہاراسٹری، شاوری، آبھیری، چانڈالی، پیشاچی وغیرہ اعلیٰ برنوں کے نزدیک گنواری اور بہت ذلیل رہیں اور راج دربار یعنی کچہریوں کی زبان میں سنسکرت بنی رہی حتیٰ کہ تولد مسیح سے ۵۴۳ برس پہلے شاکیہ مُنی گوتم بودھ مت کے بانی نے ایک ایسا انقلاب عظیم برپا کیا جو آج تک دُنیا میں سُنا بھی نہیں گیا۔ اُس نے اپنا مذہب عوام الناس کے لیے بنایا۔ اُس نے اپنا بیان عوام الناس کو سمجھانا چاہا

اور اُس نے ان کی زبان میں وعظ کہنا شروع کیا۔ پراکرت عورت بچے بخواندہ، ناخواندہ سب سمجھتے تھے۔ اور اس مگدھ یعنی جنوبی بہار کی پراکرت یعنی ماگدھی کہ جو بودھ مت کا گویا مولد تھا، یکبارگی درجۂ اعلیٰ کو پہنچ گئی اور وہی زبان مذہبی اور وہی زبان درباری قرار پائی۔ علوم و فنون کے اس زبان میں کتب خانے ہو گئے اور کوئی سو کم دو ہزار برس گزرتے ہیں، وررچ نے اس کے لیے قواعد صرف و نحو بھی منضبط کر دیے۔ سنسکرت گویا اپنی عمر طبعی کو پہنچ گئی۔ سنسکرت کی گویا موت آئی۔ صرف کسی کسی جگہ میں جہاں کے راجاؤں نے دیدک مت نہیں چھوڑا تھا، بنی رہی۔ یہاں تک کہ بودھ مت والوں نے باپ کو بیٹا اور بیٹے کو باپ کر دیا۔ پراکرت کو اصل اور سنسکرت کو اس کا مستخرج قرار دیا اور لکھ دیا کہ "ایک زبان ہے جو تمام زبانوں کی اصل ہے اور ابتدا سے آفرینش میں انسان اور براہمن جنھوں نے کبھی کچھ کہا سنا نہ تھا بلکہ تنا رمطلق بودھ لوگ بھی اُسی میں بولتے تھے، اُس کا نام ماگدھی ہے۔"

सा मागधि मूल मासा नरा ये यादि कप्पिका ।
ब्रह्मानो चस्सुतालापा सम्बुद्धा चापिभासेर ॥

جب شری شنکر آچاریہ نے آٹھویں یا نویں صدی کے قریب بودھوں کو یہاں سے نکالا، سنسکرت کو پھر رائج کرنے کی کوشش ہوئی لیکن شنکر سوامی کے بھی مقدور سے باہر تھا کہ پراکرت کو معدوم کریں اور سنسکرت کو روزمرہ کے تمام کام اور آپس کی بول چال کے لیے رائج زبان بناویں۔ گو اس میں شک نہیں کہ چند روز کے لیے سنسکرت دھار کے راجا بھوج اور قنوج کے راجا راٹھور کے درباروں میں بڑے آب و تاب کے ساتھ چمک گئی تھی لیکن پراکرت کو (اور یہاں غرض اُس پراکرت سے ہے جو مگدھ سے لے کر متھرا سے آگے تک ماگدھی اور سورسینی کے نام سے بولی جاتی تھی) کچھ دن بعد ایسے سخت اور زبردست دشمنوں سے کام

پڑا کہ اب تک کبھی نہیں آئے تھے۔ یہ اہلِ اسلام تھے۔ یہ فارسی بولتے تھے اور انھیں کے ساتھ فارسی اس ملک میں آئی۔

ان لوگوں نے اپنی فارسی یعنی زبان فارس کے مقابل میں پراکتوں کا نام ہندی یعنی زبانِ ہند رکھا۔ اس زمانہ تک پراکتوں میں رفتہ رفتہ بڑے بڑے تغیّر و تبدّل ہو گئے تھے۔ اختصار اور آسانی تلفّظ کے باعث بہتیرے لفظ بالکل بدل گئے تھے۔ املا میں بھی فرق آگیا تھا۔ نئے نئے لفظ شامل ہو گئے تھے۔ پرانے بمشکل پہچانے جاتے تھے چنانچہ تمام دنیا کی زبانوں کا یہی دستور ہے۔ سر چارلس لائل کہ جو بڑا ماہرِ دستِ عالم ہے کہتا ہے کہ " دنیا میں کوئی زبان بھی ہزار برس سے زیادہ قائم نہیں رہتی ہے جو زبانیں کہ اب بولی جاتی ہیں ہزار برس پیشتر ان میں سے کسی کا بھی وجود نہ تھا یعنی ٹھیک اسی طرح پر کوئی بھی بولی نہیں جاتی تھی اور اس طرح پر بہت سی قدیم زبانیں تغیّر و تبدّل پاکر اور بہت سی زبانیں متواتر بن کر تب اِن حال کی زبانوں میں منتقل ہوئی ہیں۔" اب اس زمانہ کی پراکرت وہ پراکرت نہ تھی جس میں بدھ نے وعظ کہا تھا۔ پریاگ اور دہلی کی بولیوں میں وہاں کی ان بولیوں کے بہ نسبت جو دو ہزار برس سے پیشتر وہاں بولی جاتی تھیں اور جن میں مہاراج دھرم اشوک کا حکم نامہ پتھر کے کھنبول پر کھدا ہوا ہے، بہت فرق آگیا تھا۔ اس فرق کے دکھلانے کے لیے ہم نے اوپر کی فہرستوں میں ایک خانہ کے درمیان نئی پراکرت یعنی ہندی کے نام سے اُن الفاظوں کو بھی لکھ دیا ہے جو اب بولے جاتے ہیں۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہو جائے گا کہ ان کی شکل پہلے پراکرت میں کیا تھی اور اب اس ہندی میں کیا ہو گئی۔ اہلِ اسلام کی سلطنت میں یہ فارسی الفاظ اور فارسی محاوروں سے بالکل بھر گئی۔ فارس کی قدیم زبان یعنی زبان زند اوستا سنسکرت سے بہت مناسبت رکھتی ہے بلکہ دونوں ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں۔ مثال کے

طور پر چند الفاظ جو ہم یہاں لکھتے ہیں، ان کے تلفظ اور معنی کی مناسبت سے ہمارا یہ دعویٰ فوراً پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے گا۔

क़दीम फ़ारसी	संस्कृत
पैतर	पितृ
ब्रातर	भ्रातृ
पैति	पति
अस्प	अश्व
वाच	वाच
ज़ेनु	जानु
मधु	मधु
वश्र	वस्त्र
वैरि	वारि
मैध्य	मध्य
मिरेथ्यु	मृत्य
पाध	पाद

لیکن یہ نئی فارسی جس نے ہماری پراکرت کو معمور کر دیا، خود عربی سے بھری ہوئی آئی۔ عربی سنسکرت سے مطلق تعلق نہیں رکھتی۔ پراکرت نے فارسی کے ساتھ عربی کو بھی اپنے اندر جگہ دی اور احکام شرعِ اسلام جو اس وقت قوانین مجریۂ ہندوستان تھے۔ عربی زبان میں ہونے کے باعث عربی الفاظ تمام ہندوستان میں کیا خاص اور کیا عام سب کی روزمرّہ بول چال ہو گئے۔

اب اِس نئی زبان کو یعنی اُس پراکرت کو جس میں فارسی اور عربی ملی ہندی کہو، چاہے ہندوستانی بھاکھا کہو چاہے برج بھاکھا ریختہ کہو چاہے کھڑی بولی اُردو کہو، چاہے اُردوئے معلّیٰ، اس کے تخم تبھی سے بوئے گئے کہ جب محمود غزنوی نے چڑھائیاں کیں اور اہلِ اسلام کی اس ملک پر توجہ ہوئی۔ آٹھ سو برس سے زیادہ گزرتے ہیں۔

دہلی اور آگرہ یہ دونوں اُس وقت گمنام تھے قنوج گویا ہندوؤں کی سلطنت کا دارالحکومت اور پایۂ تخت گنا جاتا تھا۔ سنسکرت کا علم وہاں اپنے اوج پر تھا۔ یہ قنوج ہی تھا جہاں سے بنگالے کے راجا آدسُر نے کُلین براہمن منگوائے۔ بنارس قنوج کے تابع تھا۔ متھرا کا شہر بھی بڑی رونق پر تھا۔ محمود غزنوی ان دونوں شہروں کی بڑائی لکھتا ہے لیکن کمال افسوس کی بات ہے کہ اس وقت کی بھاکھا میں لکھی ہوئی کوئی پستک اب دستیاب نہیں ہوتی۔ سب سے قدیم اس زبان کی پستک جو ہم لوگوں کو ہاتھ لگی ہے مشہور بھاٹ چند کا پرتھی راج رایسا ہے۔ کہتے ہیں کہ چند کانگڑے کا رہنے والا تھا۔ پرتھی راج سومیشر چوہان اجمیر والے کا بیٹا تھا۔ اپنے نانا اننگ پال راجہ دہلی کی گود بیٹھا تھا۔ شہاب الدین غوری نے ۱۱۹۳ء میں اُس کے گلے پر چھرا پھروایا اور تبھی سے ہندوستان میں اہلِ اسلام کی سلطنت قائم ہوئی۔ پرتھی راج کے تحت میں دہلی اور اجمیر کا راج ایک ہو جانے کے باعث کسی قدر دہلی پھر نام آور ہو گئی تھی لیکن زیادہ دہلی کی نام آوری کا باعث یہ ہے کہ وہ تب سے برابر اہلِ اسلام کی دارالسلطنت رہی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ چند کی زبان یعنی جس زبان میں اُس نے پرتھی راج رایسہ لکھا ہے آیا قنوج کی زبان تھی یا متھرا کی یا کانگڑے کی یا دہلی اور اجمیر کی یا اُس زمانہ میں ان مقاموں کی بولیوں کے درمیان کچھ ایسا چنداں فرق نہ تھا۔ بہر کیف چند سطر لکھی جاتی ہیں ان کے ملاحظہ سے معلوم ہو جائے گا کہ ممالک مغرب اور شمال کی زبان تب سے

اب کس قدر بدل گئی اور کیا جلد فارسی الفاظ اس میں ملنے لگے تھے۔

मिले सेन सुरितान[1] दिसा अन्नेक दिव्य भर।
दिव्य पारिापझरी सुकरि सावस्य पर ॥
गहि कोदुसन्जि गज्जनि सुवर आतस चरित अनंत करि।
आवंत पंग सारथ सथन मिलि मन थाप्पिय थानलरि ॥
तब कहै शाह साहाब अहेा तातार खान सुनि।
खुरासान रुस्तमा जमन मारूफ खानपुनि ॥

اب اس ملک میں دو قسم کے آدمی ہو گئے، ایک جنھوں نے اس ملک کو فتح کیا یعنی اہلِ اسلام اور دوسرے جو اُن کے مطیع ہوئے یعنی اہل ہند۔ دربار کی زبان فارسی تھی اور دربار کی زبان تمام دنیا میں اور تمام زمانہ میں اولیٰ اور اشرف سمجھی جاتی ہے۔ گویا بالکل وضع داری کی وہ جڑ ہو جاتی ہے۔ اہل ہند کا سب سے بڑا حوصلہ یہی تھا کہ جہاں تک ممکن ہو علم ولیاقت میں اہلِ اسلام سے قرب حاصل کریں۔ بڑی سے بڑی تعریف اُس وقت اہلِ ہند کی یہی ہو سکتی تھی کہ اُن کے اشعار مثل اہلِ ولایت یعنی ایرانی کے معلوم ہوتے ہیں۔ ہندو لوگ نہ صرف آپس کے درمیان فارسی میں خط و کتابت جاری رکھتے تھے اور اپنے گھر کا حساب بھی فارسی میں لکھتے تھے بلکہ اگر لفظ صحیح ہوتا میں کہہ سکتا کہ مُفرّس بن گئے تھے جس قدر وہ زیادہ مقرب بارگاہِ سلطانی تھے اسی قدر زیادہ مبتلا اس بلائے عظیم کے تھے۔ اُس وقت کے ہندو مصنفوں کا حال جو سر ہنری الیٹ صاحب نے اپنی کتاب میں درج فرمایا ہے لائق دیکھنے کے ہے صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ " ہندو مصنّف کی تصنیف میں کوئی بات ایسی نہیں ہے

---

[1] فارسی الفاظ کے نیچے خطوط کھینچ دیے ہیں۔

جس سے اُس کی قوم اور اُس کا مذہب ظاہر ہو سکے ہاں شاید کسی قدر عبارت کا غیر فصیح اور پُر تکلف ہونا البتہ اس بات کی انگشت نمائی کرتا کہ غیر کی پوشاک اس کے بدن پر کیسی نازیبا ہے۔ وہ ہندؤں کو کافر لکھتا ہے اور مسلمانوں کو مومن۔ وہ پیروں کی ایسی تعظیم کرتا ہے کہ گویا اُن کا بڑا معتقد ہے۔ جب کبھی ہندو مارے جاتے ہیں، وہ لکھتا ہے داخل فی النار والسقر شدند اور جب کسی مسلمان کا ایسا حال ہوتا ہے تو لکھتا ہے شربت شہادت نوشیدند وہ اپنے حاکموں کے معمولی الفاظ اور محاوروں کا اس قدر عادی ہو گیا ہے کہ وہ لکھتا ہے نور اسلام محرم الحرام قرآن شریف اور بسم اللہ بغیر تو کچھ شروع ہی نہیں کرتا اور حمد نعت بھی وہ اپنے دیباچہ میں بہت ضروری سمجھتا ہے۔ ایک بڈھا ہندو مصنف جو بخوبی جانتا ہو گا کہ جلد ہی چتا میں پھنک کر اور راکھ کی ڈھیر ہو کر گنگا میں بہایا جائے گا، اپنے تئیں "بر سر تابوت اور بر کنارہ گور لکھتا ہے"۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں سے بہت سی باتیں وہ مصنف خوشامد کی راہ سے جان بوجھ کر اپنے مسلمان مالکوں کے خوش کرنے کو لکھتے تھے تاہم ہم کو اس بات کے دکھلانے کے لیے کہ پراکرتوں کی نہروں میں کس طرح فارسی لفظوں کی سیلابی آ گئی، بہت کار آمد ہیں۔

کبیر پندرھویں صدی کے اخیر میں سکندر لودی کے زمانہ میں ہوا۔ وہ بنارس میں ایک مسلمان جولاہہ کے گھر میں پیدا ہوا تھا اور پڑھا لکھا نہ تھا۔ راما نند کا چیلا ہوا اور کبیر پنتھیوں کا مت نکالا۔ اس کی تصنیفات سے اب بھی بہت کچھ بچ رہا ہے۔ یہ اسی کا ہے۔

छोड़ बदबख़्त तू कहर के नज़र कू। खोज दिल बीच जहां बसत हक्का॥
अजब दीदार है अजब महबूब है। करन कारन जहां सबद सच्चा॥
खड़ दरदबंद दर्वेस दर्गाह में। खैर और मिहिर मौजूद मक्का॥
जिकर कर कर फिकर दुरदफै कर। कहै कबीर इह सखुन पक्का॥

بابا تلسی داس براہمن تھے، پنڈت تھے، شاعر تھے، ساد ھو تھے، اکبر شاہ کے ہم عصر تھے۔ ضلع باندا میں جمنا کنارے راجا پور میں پیدا ہوئے تھے اور سترھویں صدی کے شروع میں گنگا کنارے بنارس میں پرلوک کو سدھارے۔ ان کی رامائن ہی اپنے قسم کی لاثانی ہے۔ اس سے بڑھ کر ہندوؤں میں اس وقت کوئی دوسری پستک رائج نہیں ہے گو زبان کسی قدر دہقانی ہے اور سنسکرت الفاظ اور محاوروں سے بھری ہے لیکن شاعری میں اپنی قسم کی ایک ہی ہے۔ گھوڑے کی تعریف میں لکھتے ہیں۔

जगमगति जीन जराव जो जसु मोति मानक तेहि लगे।
किंकिनि ललाम लगाम ललित बिलोकि सुरनर मुनि ठगे।

اسی زمانہ کے قریب قریب سور داس ہوئے انھوں نے کرشن کے جس گائے۔ ان کے پد مشہور ہیں۔ یہ اُن کا کہا ہے۔

कीजै प्रभु अपने विरद की लाज। मोह पतित कबहुं नहि
आयौ नैकु तुमारे काज ॥
माया सबल धाम धन बनिता। बांध्यों हौं इह साज ॥
देखत सुनत सबै जानत हौं। तऊ न आयौ बाज ॥
कहियत बहुत काहि तुम नाते। स्रवनन सुनी अवाज ॥
दियो न जात पार उतराई। चाहत चढ़न जहाज ॥
लीजै पार उतारि सूर कों। महाराज बृजराज ॥
नई न करत कहत प्रभु तुमसों। सदा गरीब नवाज ॥

اگر ہم چاہیں بہتیری مثالیں نانہک، دادو، نابھا وغیرہ کی جو قریب قریب اُسی زمانہ میں ہوئے ہیں، دے سکتے ہیں لیکن ان میں ایسا نامی کوئی نہیں ہے اور ہمارے نزدیک

اب اس بات کی کافی دلیلیں پیش ہوگئیں کہ گو اہلِ ہند نے دیوناگری حرف اور اپنا خاص تلفظ اور بہت سا اپنے صرف و نحو کا قاعدہ بحال و برقرار رکھا تاہم فارسی لفظوں کو بہت آزادی سے کام میں لائے۔

اہلِ اسلام اپنے گھمنڈ کے مارے محکوموں کی زبان میں گفتگو کرنا بے شک موجب ذلت و حقارت سمجھتے ہوں گے لیکن ان کی حرم سرا ہندو زاد لڑکیوں سے پُر تھیں اور انھیں رات دن کام ایسے ہندؤں سے پڑا کرتا تھا کہ جو فارسی سے کم واقف تھے۔ پس یہ گھمنڈ رفتہ رفتہ کم ہوگیا اور اگر بالکل خط و کتابت نہیں تو بول چال تو ہندؤں کے ساتھ اُن کی زبان میں جائز سمجھی جانے لگی اور اشعار بھی اُن کی زبان میں ندرت کے طور پر خواہ فخریہ بنانے لگے۔ خواجہ ابوالحسن خسرو جس کو امیر خسرو کہتے ہیں اور جو غیاث الدین بلبن کے دربار میں نامی ملک الشعرا تھا، تیرہویں ہی صدی میں اس قسم کی غزلیں کہنے لگا تھا۔

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں

غزل مشہور ہے یہاں بالکل لکھنے کی حاجت نہیں۔

لیکن سبھی خسرو کی طرح طوطیٔ ہند نہ تھے۔ ہندی میں فاش غلطیاں کرتے تھے۔ اُن کی زبان ہندی پر تو ہم نو آمد صاحب لوگوں کی ہندی کو ترجیح دے سکتے ہیں چنانچہ مثال کے لیے کچھ کلام سعدی دکن کا سنیے۔ اکثر اسے لوگ غلطی سے سعدی شیرازی سمجھتے ہیں۔ یہ چودھویں صدی میں ہوا تھا۔

ہمنا تمھیں کو دل دیا تم دل لیا اور دُکھ دیا
ہم یہ کیا تم وہ کیا ایسی بھلی یہ ریت ہے

ملک محمد جایس والے کی مثنوی پدماوت ایسے عیوب سے مُبرّا ہے اور شیرینی اس کے کلام سے ٹپکتی ہے۔ وہ سولھویں صدی میں شیر شاہ کا ہم عصر

تھا۔ مثنوی کا دیباچہ۔

सय्यद अशरफ़ पीर पियारा। जेहिं मोहि पंथ दीन्ह उजियारा॥
लेसा हिये प्रेम कर दिया। उठी जोति भा नर्मल हिया॥
मारग हुत जो अंधेर असूझा। भा उजेर सब जाना बूझा॥
खार समुंद्र पाप मोर मेला। बोहित धर्म लीन्ह के चेला॥
जाके ऐस होहिं कंडहारा। तुरत बेग सो पावै पारा॥
दस्तगीर गाढ़े के साथी। जिहिं अवगाह दीन्ह तिहिं
हाथी॥

یہ اکبر، جہاں گیر اور شاہ جہاں کا زمانہ تھا کہ جب کسی قدر ملک میں امن امان رہنے لگا اور علوم و فنون کی طرف لوگوں کا دل متوجہ ہوا۔ ترجمہ کے لیے سنسکرت پستکیں تلاش ہونے لگیں اور ہندؤں کے ساتھ راہ و رسم بڑھ جانے سے مسلمان شاعر بھی کہ جن میں کیا کوئی خاندان شاہی سے نہ ہوں گے، بالکل یہاں کی زبان میں شعر کہنے لگے۔ ولی اس قسم کا شاعر اول کہا جا سکتا ہے۔ اس کو تین سو برس سے زیادہ گزرا۔ یہ اُسی کا ہے۔

طاقت نہیں کسی کو کہ اک حرف سن سکے
احوال گر کہوں میں دلِ بے قرار کا
آئے ولی ہماری طرف تیغِ ناز لے
اُس شوخ کو خیال اگر ہے شکار کا
مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی
دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

لیکن مضمون اُن شاعروں کے پاس بجز عشق کے اور کچھ نہ تھا۔ کبھی وہ

کسی کا سراپا اور ناز و انداز بیان کرتے ہیں، کبھی وہ دردِ فراق میں مبتلا ہیں، اِس کے سوا اور اُن کو کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ ایسے مضمونوں کے لیے نہایت نرم و شیریں الفاظ درکار ہیں۔ سوائے نرم و شیریں الفاظ کے دوسرے کام ہی میں نہیں آ سکتے۔ اگر فارسی کے حروفِ تہجی پر نگاہ کی جائے تو فوراً ثابت ہو جائے گا کہ اس سے بڑھ کر دُنیا میں کوئی زبان ملایم اور شیریں نہیں ہے پس روز بروز ہندی الفاظ ان شاعروں کے نزدیک سخت و درشت ٹھہرتے گئے اور ان کی جگہ میں فارسی اور عربی الفاظ بھرتی ہونے لگے مثلاً پہلے پنکھڑی کا استعمال ہوتا تھا جیسے کہ:

یار کے اُن لبوں کی کیا کہیے
پنکھڑی ایک گلاب کی سی ہے

لیکن بعد جو شاعر ہوئے اُن کے کانوں میں اس لفظ نے گھاو کیا، فوراً برگِ گل سے بدل دیا۔

برگِ گل پر یار کی تصویر کا دھوکھا ہوا
گویا ہیں نزاکت سے دو برگِ گل تر لب

اور اس طرح پر قدم بقدم کھنچتے کھنچتے ہم لوگ مرزا نوشہ اسد اللہ خاں غالب اور مرزا رجب علی بیگ سرور کی اُردوے معلّی کو پہنچے۔ دونوں نہایت مشہور ناظم و ناثر۔ ایک دہلی کے اور دوسرے لکھنؤ کے، ابھی زندہ ہیں۔

دہلی دارالسلطنت تھی اور ملک مشرق کے آدمی ہمیشہ کلام الموک کو ملوک الکلام سمجھتے رہے ہیں۔ قلعۂ دہلی کی زبان سب کے لیے سند ہوگئی لیکن وہ صرف قلعہ ہی کی زبان تھی۔ ضلع میں جاٹ گوجروں کی زبان سے بڑھ کر شاید کسی دوسری زبان میں دہقانیت نہ ملے چنانچہ روایت ہے جب ایک شاعر دہلی کے نواح میں پہنچا پوچھا قلعہ کتنی دور ہے۔ لوگوں نے جواب دیا پاس ہے۔ آگے بڑھ کر پھر پوچھا جواب ملا

نجیک ہے آگے بڑھ کر پھر پوچھا جواب پایا نزدیک ہے آگے بڑھ کر پھر پوچھا لوگوں نے کہا قریب ہے جب قلعہ کا دروازہ دکھلائی دیا پھر پوچھا، وہاں لوگوں نے بتلایا متصل ہے۔ اب اسی سے آپ لوگوں کو قلعہ کی اُردوے معلیٰ کی بالکل حقیقت دریافت ہو جائے گی۔ اس انیسویں صدی کے شروع میں ڈاکٹر گلگرسٹ صاحب نے میر امن دہلوی مصنف باغ و بہار اور للّوجی لال کب ساکن اکبر آباد مصنف پریم ساگر کو حکم دیا کہ نثر کی کچھ کتابیں اس ملک کی زبان میں ایسی تصنیف کریں کہ جن کو پڑھ کر صاحب لوگ اس ملک والوں کی بولی سمجھ سکیں اور اس ملک والے جو کچھ کہ صاحب لوگ اُن سے بولیں اُس کو سمجھ لیویں۔ دونوں مصنف بیشک حیران ہوئے ہوں گے کیونکہ یہ اُن کے لیے بالکل نئی بات تھی۔ دونوں نے کتاب لکھی مگر دونوں کو ایک ایک نئی زبان بنانی پڑی۔ للوجی نے تو اپنے پریم ساگر میں سے بالکل فارسی لفظ خارج کیے یہاں تک کہ اپنے مربی ڈاکٹر گلگرسٹ کے لیے بھی صاحب کا لفظ نہیں لکھا۔ افسوس للوجی یہ بھول گئے کہ خود اُن کا نام آدھا یعنی لال لفظ فارسی ہے۔ میر امن نے گو بعض مقام میں نداان اور ٹک وغیرہ ایسے ہندی لفظ لکھے ہیں کہ جو اب استعمال میں نہیں آتے تاہم باغ و بہار کے ابتدا ہی میں ایک لفظ ایسا فارسی کا مرکب لکھا ہے کہ جس سے شاید صاحب لوگوں کو تمام عمر کام نہ پڑے گا یعنی دلق پوشو۔

لکھنؤ اس بات میں کچھ پیچھے نہیں رہا۔ لکھنؤ میں بھی بادشاہ تھا۔ لکھنؤ کے شاعر قلب سے ہراول میں آ گئے۔ مرزا سرور کا فسانۂ عجائب اُس محنت کے پہاڑ کا قلہ ہے کہ جو انسان زبان کو پُر تکلف اور مصنوعی بنانے میں حدِ امکان تک کر سکتا ہے۔

لیکن اب بادشاہ اور بادشاہی دونوں دہلی اور لکھنؤ کی ہمیشہ کے لیے

دریا برد ہوئی۔ بیت

بیک گردشِ چرخ نیلوفری
نہ نادر بجا ماند نہ نادری

قلعہ اور محل سب نقشۂ ہند میں سرخ رنگے گئے۔ شاعر جھوٹے اور خوشامدی جو اب تک ہماری زبان کے لیے سند سمجھے جاتے تھے، ملکہ معظمہ دام اقبالہا کی عملداری میں ہند کے اِس سرے سے اُس سرے تک منتشر ہو گئے اور لوہے کی سڑکیں اور دھوئیں کی گاڑیاں اب روزمرّہ ملکہ معظمہ دام اقبالہا کے انواع و اقسام کی رعیتوں کو بھارت برش کے ہر ایک حصّہ اور گوشہ سے یکجا لاتی ہیں وہ بالضرور آپس میں گفتگو کریں گے اور ایک دوسرے کی سُنیں گے، تو اب کیا کرنا چاہیے، کیا اُردوے معلّٰی سیکھنے کے لیے قلعہ دہلی میں جاویں؟ دہلی خود اب درجۂ دوم کا شہر گنا جاتا ہے۔ قلعہ میں وہ دیوانِ خاص جس میں اب تک لکھا ہوا ہے۔ بیت

اگر فردوس بر روے زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است

عجائب خانہ بنائی گئی، اگر وہاں سند کے لیے کسی شاعر کو تلاش کریں تو پہرے والے گورے اور سنتری حکم در پکارتے ہیں پس ہم لوگوں کو اب سند کے لیے کسی دوسری جانب دیکھنا چاہیے، ضرورت کے بموجب سرمایہ حاصل کرنا چاہیے۔ پچیس برس گزرتے ہیں سرکار نے اپنی کچہریوں میں سے فارسی زبان اُٹھا دی اور حکم دیا کہ اس ملک کی بولی میں کام کیا جائے۔ سرکار کا انصاف اور سرکار کی دانائی اس تجویز سے اظہر من الشمس ہے۔ زبان فارسی تو اُٹھ گئی مگر حروف فارسی (اور میں پھر اسی غلط لفظ کا استعمال کرتا ہوں) مفرس عملے کہ

جو اکثر کایتھ اور اہلِ اسلام میں جوں کے جوں باقی رہے۔ انھوں نے حکم سرکاری کی تعمیل کی یعنی کہیں کہیں ہندی فعل لکھ دیے سو بھی ہندی قاعدے کی پابندی کے ساتھ نہیں اور بالکل الفاظ بلکہ فقروں کی ترکیب جہاں انھیں ہندی بنانے میں دقت معلوم ہوئی جوں کی جوں باقی رہی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک نئی زبان تیار ہوئی یعنی کچہریوں کی زبان۔

پندرہ برس سے زیادہ گذرتے ہیں کہ سرشتۂ تعلیم ممالک مغربی میں قائم ہوا اور بافراط یہاں کی زبان میں کتابیں چھاپی گئیں لیکن اس میں بھی کسی قدر وہی غلطی واقع ہوئی جو ڈاکٹر گلگرسٹ کے وقت میں موجب افسوس ہوئی تھی یعنی پنڈت لوگ سوچتے ہیں کہ جس قدر اصلی سنسکرت الفاظ چاہے وہ سمجھ میں آئیں یا نہیں، لکھے جائیں، اسی قدر ان کی نام آوری کا باعث ہے اور اسی طرح مولوی لوگ فارسی اور عربی لفظوں کی نسبت سوچتے ہیں غرض پُل بنانے کے عوض میں دونوں خندق کو گہرا اور چوڑا کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے نزدیک ایک کا نام ہندی رکھا ہے اور دوسرے کا نام اُردو۔ وہ چھوٹی سی پستک بال بودھ جو دیوناگری پڑھنے والے لڑکوں کو حرف سیکھتے ہی دی جاتی ہے گو میرے نام سے چھاپی گئی ہے لیکن اس میں تحریر دوسرے لوگوں کی ہے اس میں پودے کے لیے سماپت لکھا ہے، گرمی کے لیے اُشنتا، تیز کے لیے تیکش، پیڑ کے لیے برکش، مضبوطی کے لیے درڑھتا، پیدا کے لیے اُتپن، صاف کے لیے سپشٹ، برابر کے لیے تُلیہ، اور اسی طرح قصۂ سورجپور میں کہ وہ بچّوں کو حروف تہجی ختم ہوتے ہی دیتے ہیں، اراضی منقسمہ، بٹی ہوئی زمین کی جگہ اور خورد و کلاں سکنائے دیہہ چھوٹے بڑے گاؤں کے رہنے والوں کی جگہ لکھا ہے۔

خالص ہندی کے طرفدار (اور اُن میں بڑے بڑے زبردست آدمی ہیں)

ہرگز خوش نہ ہوں گے جب تک کہ ہم لوگوں کی زبان سے کل فارسی کے الفاظ خارج نہ کیے جائیں۔ وہ لوگ فارسی کے آنے سے پیشتر جو پراکرت کے الفاظ رائج تھے ان پر بھی قائم نہ ہوکر ویدوں کا زمانہ زندہ کیا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے بالکل الفاظوں کو از سرِ نو قواعد پانینی کی ٹکسال میں مضروب کرانا چاہتے ہیں۔ وہ خود نہیں جانتے کہ اپنی اس خیالی زبان کا کیا نام رکھیں۔ بھلا دے کے لیے وہ کبھی کبھی اس کو برج بھاکھا بتلا دیتے ہیں لیکن اس بات سے مطلق ناواقف ہیں کہ برج بھاکھا غیر زبان کے لفظوں کو خارج نہیں کرتی ہے۔ سنیئے بھکھاری داس اپنے کابیہ نرنے میں کیا کہتا ہے۔

व्रज भाखा भाखा रुचिर कहै सुमति सब कोय ।
मिलै संस्कृत पारस्यौ पै अति सुगम जो होय ॥ १ ॥

یہ زبان اب تھوڑی وسعت میں یعنی صرف ضلع متھرا میں بولی جاتی ہے اُس کی شہرت کچھ اس کے کسی وصف ذاتی یا اس کے کار آمد ہونے کے باعث نہیں ہے بلکہ جے سنگھ سوائی راجہ جے پور کی قدردانی کے باعث کہ جو اٹھارھویں صدی میں ہو گیا ہے، اُس نے بڑے بڑے بھاری انعام دے کر برج بھاکھا کی شاعری کو رونق دی۔ اس نے بہاری کے دوہروں کے لیے ایک ایک اشرفی دی ہے اور واقع میں بہاری ہی نے برج بھاکھا کو دائم الحیات کیا۔ چونکہ اکثر اوزان میں جو ہندوؤں کو پسند ہیں، برج بھاکھا کے باعث بہت سہولت سے شعر بن جاتے ہیں۔ ہندوستان کے اور بھی حصوں میں شاعر اس زبان کو کام میں لاتے ہیں۔ یہ دوہرا بہاری کا ہے۔

लिखन बैठ जाकी सबिहिं गहि गहि गरब गरूर
भये न केते जगत के चतुर चितेरे कूर ॥ १ ॥

ایسی خالص ہندی چاہنے والوں کو اس بات پر یقین دلا سکتے ہیں کہ جب تک کچہری میں حروف فارسی جاری ہیں، ممالک مغربی کے درمیان کسی طرح الفاظ سنسکرت جاری کرنے کی کوشش محض بے فائدہ اور لاحاصل ہوگی۔ حروف فارسی کے عوض ہم لوگ حروف دیوناگری جاری نہیں کر سکتے۔ دیوناگری لکھنے میں نہایت دیر لگتی ہے۔ بنگلا حروف خواہ انگریزی حروف کا جاری ہونا کس قدر ممکن ہے اور اگر جاری ہوں تو کیا نتیجہ نکلے، یہ ایک علیحدہ بات اور ابھی بحث طلب ہے اور اس کا یہاں موقع نہیں۔ ماسوا اس کے سر چارلس لایل کے اس مقولہ کا بھی ضرور خیال رکھنا پڑے گا کہ "جب کوئی زبان ایک مرتبہ مر جاتی ہے دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتی کیونکہ گو اسی اصل و نسل کے آدمی رہے ہوں ممکن نہیں کہ پھر ٹھیک وہی سب اسباب ان کے درمیان جمع ہو سکیں کہ جن سے اُس زبان مُردہ کا وجود ہوا تھا اور یہ تو کب ہو سکتا ہے کہ وہی سب اسباب اُن تمام قوموں کے درمیان بھی موجود ہو جائیں کہ جن سے اُن کو کام پڑتا ہے۔"

اب یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ پس ہم لوگوں کو کیا کرنا چاہیے، کس جانب پھرنا چاہیے کہ جس میں ہم کو سیدھی راہ ملے۔ ہم لوگوں کی زبان کی صرف و نحو (چاہیے آپ اس کو اُردو کہیے چاہیے ہندی) کسی قدر قائم ہو گئی ہے جو باقی ہے جس قدر جلد قائم ہو جائے بہتر ہے۔ اس زبان کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہا ہے اور اب بھی کھلا ہے۔ اُس میں بیشک آئے اور برابر چلے آتے ہیں کیا ابتدائی باشندوں کے الفاظ اور کیا سنسکرت کے الفاظ کیا یونانی (یہاں تک کہ یونانی لفظ دینار پرانی پرانی سنسکرت پوتھیوں میں بھی پایا جاتا ہے اور یا تک بھی یونانی سے مشتق ہوا ہے) کیا رومی کیا فارسی کیا عرب کیا ترک کیا انگریزی کیا کسی ملک کے الفاظ جو کبھی اس دنیا کے پردے پر بسے ہیں یا بستے ہیں، سب کے واسطے اس کا

دروازہ ہمیشہ کھلا رہا ہے اور اب بھی کھلا ہے۔ اب اسے بند کرنے کی کوشش کرنا قطع نظر اس سے کہ کس قدر موجب ہمارے ضرر و نقصان کا ہے، سوچنا چاہیے کہ کیسا ناممکن ہے۔ روک ٹوک بیشک مناسب اور یہی ہو سکتی ہے۔ وہ کون شخص ہے کہ اپنے تال میں جس سے تمام گانو سینچتا ہے، پانی آنے کی نالیاں بند کرے۔ گنگا کی دھارا بہنا تو آپ بند نہیں کر سکتے لیکن یہ البتہ کر سکتے ہیں کہ بندھ اور پشتے بنا کر انھیں کے درمیان اُن کو رکھیں۔ اگر باڑھ آوے وقتاً فوقتاً اُن بندھوں کو ہٹا کے اور ان کی مرمت کر کے زیادہ وسعت دیتے جائیں۔ مجھے پھر سر چالس لایل کا قول یاد آیا "یہ ایک بہت تعجب کی بات لائق تفتیش ہے کہ وہ کون سا قاعدہ یا قانون ہے کہ جس کے بموجب صرف الفاظ اور محاورے ایجاد ہی کیے جاتے ہیں بلکہ ان میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دی جاتی ہے اور بہ نسبت ایک کے دوسرے زیادہ رواج پاتے ہیں۔ جب ہم اس طریق پر غور کرتے ہیں کہ جس طریق سے نئے الفاظ اور محاورے وجود میں آتے ہیں اور پُرانے کالعدم ہو جاتے ہیں ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ بے قصد اور بے ٹھور ٹھکانے گویا ایک کھیل ہے بہر کیف یہ تغیر و تبدل ایک نتیجۂ اتفاقیہ ہے لیکن تو بھی غور کرنے سے ثابت ہوگا کہ اس کے لئے قاعدہ اور قانون مقرر ہے کہ جس کے بموجب موت اور زندگی کے لئے زبانوں کی باہم لڑائی ہوتی ہے ایک فتحیاب اور دوسری شکست کھاتی ہے بعض وقت ذرہ سی آسانی کسی نئے طور کے تلفظ و املا میں خواہ اختصار کے باعث خواہ خوش آواز اور لب و لہجہ کی موافقت سے فتح و شکست کا پلا اولٹ دیتی ہے بعض وقت اس سے زیادہ اور مددگار پہنچ کر ایک کو شکست اور دوسرے کو فتح دیتے ہیں مثلاً وضعداری ملک، اختیار اراکین سلطنت، ذی مقدور لوگ خواہ خاندان کے باعث خواہ تعلیم کے باعث، وہ مصنف جن کے مضامین لوگوں کو

مقبول اور پسند ہیں، وہ لوگ جن کو جلسوں میں تقریر اور وعظ کا کام پڑتا ہے، وہ سرکار کہ جو بالتخصیص عبارت کی یکسانی اور دیہاتی زبانوں کی درستی کے لیے مدارس مقرر کرتی ہے! ہم لوگوں کو بالعموم حتی الامکان انتخاب میں ان لفظوں کو ترجیح دینی چاہیے کہ جو عام فہم و خاص پسند ہیں یعنی جن کو زیادہ تر آدمی سمجھ سکتے ہیں اور جو یہاں کے علما فضلا شعرا اور ادبا کی بول چال میں متروک نہیں کیے گئے ہیں اور بالعموم حتی الامکان ہم لوگوں کو ہرگز غیر ملک کے الفاظ کام میں نہ لانے چاہئیں اور نہ سنسکرت کی ٹکسال قائم کر کے نئے نئے غیر مروج الفاظوں کے سکے جاری کرنے چاہئیں تاوقتیکہ ہم لوگوں کو اس کے جاری کرنے کی ضرورت نہ ثابت ہو جائے یعنی یہ کہ اس معنی کا کوئی لفظ مروج ہماری زبان میں نہیں ہے یا کہ جو ہے قابل اعتراض ہے یا ضرورت شاعری یا ضرورت علمی یا کوئی اور خاص ضرورت ثابت ہو جائے۔
مینے اکثر بڑے بڑے مشہور و معروف مصنف اور شاعروں سے پوچھا ہے کہ صاحب آپ کوئی قاعدہ بتلا سکتے ہیں کہ جس سے ہم ایک لفظ کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کریں۔ سب نے ایک زبان یہی جواب دیا کہ "جو کان کو اچھا لگے" اب مشکل یہ ہے کہ کان سب لوگوں کا ایک ہی نہیں ہے۔ زید کے کانوں کو ایک لفظ اچھا لگتا ہے اور عمر کے کان کو دوسرا! بہرکیف ہم لوگوں کو ایک ہندو جانسن درکار ہے کہ جو کام انگریزی جانسن نے انگریزی زبان کے لیے کیا وہ ہندو جانسن ہماری زبان کے لیے کرے کہ جس کی تلاش تفتیش سے ہماری زبان کی یقینی سرحدیں قائم ہو جائیں اور اُن کے اندر کافی وسعت بھی کہ جوں جوں ترقی ہوتی جائے گنجایش ملتی جائے اور اس میں عربی فارسی سنسکرت (اور اب کہنا چاہیے انگریزی) کے بھی الفاظ دوش بدوش نشو و نما پائیں نہ اس بے ترتیبی سے کہ جیسا اب ایک ہیولاسی ازلی بن رہے ہیں بلکہ ایک سلطنت کے مانند کہ جس کی

حد یں قائم ہو گئی ہیں اور جس کا انتظام منتظم کی دانش مندی کی گواہی دیتا ہے۔

یہاں ایک شخص نے ایک لغت اپنی زبان کا بنانا چاہا تھا بلکہ شروع بھی کیا تھا اور طرز اس کا یہ رکھا تھا کہ اس میں کل الفاظ ہیں کہ جو کسی طرح پر بھی ممالک مغربی والوں کی زبان پر آتے ہیں اور اُن پر اس قسم کے نشان کر دیے جائیں کہ جس سے معاً معلوم ہو جائے کہ کونسا لفظ صرف دیوناگری میں لکھنا پسندیدہ ہے کونسا حرف فارسی میں کونسا فصحا کی زبان پر آتا ہے کونسا گنواروں کی زبان پر کس کو صرف سنسکرت کے پنڈت بولتے ہیں اور کس کو مولوی اور منشی لوگ کون سے الفاظ ہندی کے شاعرانہ ہیں کون سے فارسی عربی کے کون سے علمی ضرورت کے لیے نئے ایجاد کیے گئے ہیں کون سے متروک ہو گئے غرض جہاں تک ممکن ہے نشانوں کے ذریعہ سے جدا جدا موقع استعمال دکھلایا جائے جن پر کچھ نہ نشان ہو سمجھا جائے سب جگہ سب حالت میں سب لوگ کام میں لا سکتے ہیں اور معنی لکھنے کے وقت حسب ضرورت و موقع ان کے مخرج و اشتقاق وغیرہ کا بھی کچھ تذکرہ کیا جائے اور مثالیں بھی ہندی شاعر اور مصنفوں کی دی جائیں مگر شاید اپنی کمی لیاقت کے باعث یا لائق آدمیوں کی مدد نہ ملنے کے باعث یا قلت فرصت سے اُس شخص نے بالکل اس کا خیال چھوڑ دیا۔ کیا خوب ہو کہ کوئی اہالیانِ جلسہ سے اس کام کو اپنے ذمہ لے۔

اُردو کی ابتدا

جناب الفرڈ ماسٹر لندن)

وہ بولی جو بعد میں جدید ہندی اور اُردو کہلائی، اس کا پہلا نام ہندوی، ہندی اور بقولِ اہلِ یورپ ہندوستانی تھا۔ اُردو کا لفظ کورٹ کی زبان کے معنی میں (فوج کی زبان کے معنی میں نہیں) سب سے پہلے ۱۷۵۲ء میں استعمال ہوا ہے۔

کول بروک پہلا شخص ہے جس نے ۱۸۰۱ء میں ہندی، اُردو اور عوامی ہندوستانی میں فرق کیا۔ اس سے قبل ۱۷۸۷ء میں گلکرسٹ ہندوستانی کے الفاظ کو، عربی، فارسی اور ہندوی میں تقسیم کرچکا تھا۔ کھڑی بولی کا (ادبی) اظہار ۱۸۰۳ء میں ہوتا ہے اور ۱۸۱۱ء میں للّو لال جی کوی اس کو بے میل ہندی قرار دیتے ہیں اور اس کا مقابلہ ریختہ یا اُردو سے کرتے ہیں۔

ہندوی کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ وہ ایک شہر میں پیدا ہوئی، مثلاً قنوج میں، جیسا کہ کول بروک نے کہا ہے، دہلی میں، جیسا کہ گریرسن نے کہا ہے، یا لاہور میں، جیسا کہ گراہم بیلی نے کہا ہے اور نہ وہ برج سے پیدا ہوئی ہے جیسا کہ للّو لال جی نے رائے ظاہر کی ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ قرین حقیقت ہے کہ وہ آریائی ہندوستان کے تمام شہروں میں پیدا ہوئی۔ اس کی لفظی ساخت یکساں تھی، اور اس کے

ذخیرۂ الفاظ میں مقامی بولیوں کی آمیزش تھی۔ اصل میں یہ کاروبار کی زبان تھی جیسا کہ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے کہا ہے۔ گریرسن نے جس مقامی زبان ہندوستانی کا ذکر کیا ہے، وہ اُردو کی بنیاد نہیں تھی بلکہ مسلمانوں کے رہنے اور بسنے کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی۔

ہندوی سے پہلے اپ بھرنش کاروباری زبان تھی اور اس کو یہ شرف نویں صدی تک حاصل رہا، اور وہ اسی طرح ممتاز و ممیز تھی، جیسے کہ بعد میں ہندوی اٹھارہ دیش بھاشاؤں میں ممتاز و ممیز ہوگئی۔ اگرچہ یہ نام پراکرت اور بھاشا کی طرح بہت عرصے بعد تک بغیر کسی قید اور تعین کے ہر بولی کے لیے استعمال ہوتا رہا۔

ناگر، اپ ناگر، اور وراکڈا اپ بھرنش کو، شہری، قصباتی اور دیہی ہندوستانی کے مترادف قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس موقع پر مارکنڈے نے اکیس بولیوں کا ذکر کیا ہے۔ جن میں سے اٹھارہ کو دیش بھاشاؤں کی حیثیت سے پہچانا گیا ہے اور تین یعنی مغربی، وسطی اور مشرقی بولیوں کو، ہندی گروہ سے متعلق کیا گیا ہے اس سے بہت پہلے، البیرونی (م ۱۰۳۰ء) نے ایک فراموش شدہ بولی اور مقامی حرف تہجی کا ذکر کیا ہے، جس کا نام بھی دیش بھاشاؤں پر رکھا گیا تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسعود سعد (۱۰۹۹ء) نے ایک ہندوی دیوان مرتب کیا تھا، جو غالباً اپ بھرنش میں تھا، اور یہ اپ بھرنش عبدالرحمان (۱۲۲۰ء) کی سندیس رسک سے مماثل ہوگی جو اب شائع ہو چکی ہے۔

ہیم چندر (۱۱۷۰ء) کے اپ بھرنشی دوہوں سے جو دریافت ہوئے ہیں، ایک ایسی زبان کا پتا چلتا ہے جس میں تذکیر و تانیث کے جنسی صیغے استعمال کیے گئے ہیں اور جس میں الف ممدودہ بھی استعمال ہوا ہے۔

امیر خسرو (۱۳۱۰ء) نے ہندوستانی الفاظ اپنی تحریروں میں استعمال کیے ہیں، جیسے بسیٹھ، یا پردھان۔ جو ہندی کے ہیں اور اپ بھرنش کی صوتیات کی پیروی نہیں کی ہے۔ بعض ہندی اشعار امیر خسرو سے منسوب کیے گئے ہیں لیکن ابھی تک ان کی تنقیدی جانچ نہیں ہوئی۔

مارکنڈے نے پراکرت پنگل سے (چودھویں صدی) چار اشعار بہ طور ناگر اپ بھرنش کے نمونے کے نقل کیے ہیں، جن میں ہندوستانی کے کئی مقبول لفظ آئے ہیں مثلاً چوڑی، جو بعد میں غیر پراکرتی صوتیات کے اثر سے چوٹی ہوگیا۔ جب ہم اس زمانے سے آگے بڑھتے ہیں تو ہندوستانی اور ہندی کی بہت سی تحریریں بکثرت ملتی ہیں جو ہندو اور مسلمان دونوں نے لکھی ہیں۔ اسی زبان کے دو نام اُردو اور ناگری رکھے گئے۔ پنڈت رام جس نے اپنی ہندی قواعد کا نام "ناگری گھوش ویاکرن" رکھا اور اسی وجہ سے سینتی کمار چیٹر جی جدید ہندی کے لیے ناگری ہندی کا لفظ پسند کرتے ہیں۔

کربل کتھا کی زبان[ؔ]

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

اُردو کی ابتدا سے متعلق باقاعدہ تحقیق پچھلے تیس چالیس برسوں سے جاری ہے۔ لیکن یہ مسئلہ ابھی تک پوری طرح حل نہیں ہوا۔ اس کام میں سب سے بڑی دقّت قدیم لسانی نمونوں کے فقدان کی وجہ سے پیش آتی ہے۔ یہ بات بار بار دہرائی جاتی ہے کہ اُردو کا باقاعدہ آغاز دہلی سے ہوا اور دہلی والوں ہی نے اس "ریختہ" زبان کو اردوئے معلّیٰ کے درجے تک پہنچایا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ دہلی لسانی اعتبار سے زبانوں کے سنگم پر واقع ہے۔ اس کے

ؔ میں اپنے کرم فرما ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی کا بے حد شکرگزار ہوں، جنھوں نے میری گزارش پر ان صفحات کو پڑھنے کی زحمت گوارا فرمائی اور کہیں کہیں حواشی کا اضافہ کیا۔

شمال مشرق میں کھڑی، جنوب مشرق میں برج، شمال مغرب میں پنجابی اور جنوب مغرب میں ہریانی بولی جاتی ہے۔ بحث طلب امر یہی ہے کہ ان میں سے اُردو کی بنیاد کس بولی پر ہے۔ دہلی میں زیادہ اثر کھڑی ہی کا رہا ہے اور اردوے دہلی بھی صوتیاتی اور صرفی و نحوی لحاظ سے اس سے مشابہت رکھتی ہے، لیکن جب تک خود کھڑی بولی کی قدامت پوری طرح متعین نہ ہو جائے، یہ دعویٰ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ مسلمانوں کی آمد سے سولہویں سترہویں صدی تک کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ہر چیز ایک وضع چھوڑ کے دوسری وضع پر آرہی تھی، اگر کہا جائے کہ اس تبدیلی کا سب سے زیادہ اثر زبانوں نے قبول کیا تو بے جا نہ ہوگا۔ مختلف بولیاں اس زمانے میں خام حالت میں تھیں۔ قدیم سلطنتوں کا سیاسی انتشار، نئی حکومتوں کا قیام، فوجوں کا اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آنا، باشندوں کی نقل و حرکت، نئے سیاسی مراکز کا قائم ہونا، صوفیانہ سلسلوں کا فروغ اور بھگتی تحریک کا ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چھا جانا؛ ان سب عوامل کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف بولیوں میں اختلاط اور ارتباط کے مواقع بہت بڑھ گئے اور پرانی حد بندیاں ٹوٹنے لگیں۔ نواحِ دہلی کی تقریباً سب بولیاں شورسینی پراکرت کی جانشین ہیں، اس لحاظ سے بھی ان میں کچھ نہ کچھ ہم آہنگی ہونی چاہیے، اس پر سیاسی اور سماجی تحریکوں کے اثرات مستزاد۔ چنانچہ آج اُردو کی بعض خصوصیات کا رشتہ ایک محقق ہریانی سے جوڑتا ہے تو دوسرا کھڑی سے۔ ایک ہریانی کو پنجابی کی شاخ بتاتا ہے تو دوسرا اسے کھڑی کا جنوبی لہجہ کہتا ہے۔ بیشتر ماہرین نے کھڑی کو اُردو کی بنیاد تسلیم کیا ہے، لیکن بعض حضرات

اس کے برعکس خود کھڑی کو اُردو سے ماخوذ بتاتے ہیں۔ اس پیچیدگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کھڑی بولی کے قدیم نمونے دستیاب نہیں۔ برج، ہریانی اور پنجابی اس لحاظ سے خوش نصیب ہیں کہ ان کے قدیم نمونوں کا سراغ لگانے میں کامیابی ہوئی ہے۔ کھڑی بولی کا سلسلہ یوں تو بابا فرید شکر گنج (متوفی ۱۲۶۹ء / ۶۶۸ھ) اور خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی (متوفی ۱۳۵۶ء / ۷۵۷ھ) سے ملایا جا سکتا ہے، لیکن سیر الاولیا اور خیر المجالس میں محض چند جملے یا اقوال ہی ملتے ہیں۔ امیر خسرو (متوفی ۱۳۲۵ء / ۷۲۵ھ) مسلّمہ طور پر زبان دہلوی کے پہلے شاعر ہیں، لیکن ان کا جتنا کلام دستیاب ہوا ہے، اس کی کوئی سند اب تک حاصل نہیں ہو سکی۔ نامدیو (متوفی ۱۴۰۸ء) کبیر داس (متوفی ۱۵۱۵ء) اور گرو نانک (متوفی ۱۵۳۹ء) کے ہاں کھڑی بولی کی نشان دہی کی جا سکتی ہے، لیکن یہ ان کی زبان کا غالب عنصر نہیں۔ لے دے کے کھڑی بولی کے چند نمونے شیخ بہاء الدین باجن، متوفی ۱۵۰۶ء / ۹۱۲ھ ("صفت دنیا بزبان دہلوی گفتہ") چندر بھان برہمن، متوفی ۱۶۶۲ء / ۱۰۷۳ھ (خدا جانے یہ کس شہر اندر ہمن کو لا کے ڈالا ہے) اور افضل جھنجھانوی (متوفی ۱۶۲۵ء / ۱۰۳۵ھ) کی بکٹ کہانی میں ملتے ہیں۔ اُردو گو متاخرین شعرائے فارسی اور دورِ اول کے اُردو شعرا کا زمانہ اس کے بعد کا ہے۔ کربل کتھا کی بنیادی اہمیت یہی ہے کہ یہ کھڑی بولی کی پہلی مستند نثری تصنیف ہے٭۔ اس سے پہلے کھڑی کے جتنے بھی نمونے دستیاب ہوئے ہیں، وہ نہایت مختصر ہیں یا منظوم ہیں۔ لسانیاتی تجزیے میں بول چال کی زبان کو جو درجہ حاصل ہے، اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اس اعتبار سے کربل کتھا کھڑی بولی کے سرمائے میں

٭ یہ مضمون ۱۹۶۱ء میں لکھا گیا تھا جبکہ قصۂ مہر افروز و دلبر از عیسوی خان بہادر (مرتبہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں) ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔ لیکن قصۂ مہر افروز و دلبر کی اشاعت سے کربل کتھا کی اوّلیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اس کتاب کا تعینِ زمانی حتمی طور پر نہیں ہو سکا۔ (گ۔ ج۔ ن)

وقیع درجہ رکھتی ہے۔ دہلی کی قدیم زبان، نواحِ دہلی کی بولیوں سے اس کے تعلقات اور اُردو اور کھڑی بولی کے رشتوں پر کام کرنے والوں کے لیے کربل کتھا بہترین ماخذ ہے۔

مولانا حامد حسن قادری نے کربل کتھا کے چند جملوں کی بنا پر یہ حکم لگایا ہے کہ اس میں روزمرۂ دکن کا اثر پایا جاتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے فضلی کو "دکنی الاصل" قرار دیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ متعدی افعال کی ماضی مطلق میں جمع مذکر کے ساتھ مضارع: فرمائے، کہے، رکھے وغیرہ کا استعمال دکنی سے مخصوص نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ حالتِ فاعلی میں لاحقہ "نے" کا عدم استعمال ہے اور یہ بے قاعدگی اس زمانے کی کھڑی بولی اور ہریانی میں بھی پائی جاتی تھی۔ (اس کی مزید تفصیل آگے پیش کی جائے گی) فضلی نے بار بار وضاحت کر دی ہے کہ وہ جو کچھ لکھ رہا ہے "زبانِ ہندی" میں لکھ رہا ہے۔ اس کے بعد کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ فضلی کو تو یہ بھی دعویٰ ہے کہ وہ اس صنعت کا مخترع ہے اور زبان ہندی میں (ترجمہ کرنے میں) اُسے اوّلیت حاصل ہے:

"پیش ازیں کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع اور اب لگ ترجمۂ فارسی بہ عبارتِ ہندی نہیں ہوئی مستمع۔" (۲۸)[1]

کربل کتھا ۱۷۳۲-۳۳ء / ۱۱۴۵ھ میں تصنیف ہوئی اور پندرہ سال بعد ۱۷۴۷-۴۸ء / ۱۱۶۱ھ میں جب مصنف نے اس پر نظرِ ثانی کی تو اپنے دعوے کو دہراتے ہوئے پھر اس بات پر زور دیا:

"اب کہ نظرِ ثانی کر بکمیت و کیفیتِ مضامین و ہندی استطلاحات[2] (کذا)

---

[1] قوسین میں ہندسوں سے متنِ کتاب کے صفحات مراد ہیں۔

[2] یہ غلط املا کاتب کی کم سوادی پر دال ہے۔ (ع۔ص۔ عبدالستار صدیقی)

و استعارات رنگین اصلاح دیا۔" (۳۲)

کربل کتھا کی لسانی اہمیت اس لحاظ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس کا روئے سخن ان لوگوں کی طرف ہے جو فارسی عربی سے نابلد تھے۔ قدیم زمانے میں زبان کا معیار صرف "منتخب روزگار" یعنی خاص طبقے کے افراد ہی متعین کیا کرتے تھے، جس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ آج اُردو کے عوامی رشتوں کا سراغ لگانے میں طرح طرح کی دقتیں پیش آتی ہیں۔ مقامِ شکر ہے کہ کربل کتھا کی زبان ان مصنوعی بندشوں سے بے نیاز رہی اور اس میں بوجوہ روزمرّہ عوام ہی کو اختیار کیا گیا۔ فضلی نے خود اس کی وضاحت کر دی ہے:

"بندہ حقیر، پرتقصیر ... مخلص روضۃ الشہدا کا کہ سب نکتہ سنجانِ مناقب شاہِ لافتیٰ نے اور سب دقیقہ فہمانِ مصائب سید الشہدا نے واقعہ شہادت شاہ کربلا کا اوس میں لکھا ہے، سونا نا تھا لیکن معانی اوس کے نسا، عورات کی سمجھہ میں نہ آتے تھے، اور فقرات پرسوز وگداز اوس کتابِ مذکورہ کے بسبب لغاتِ فارسی اون کوں نہ رولاتے تھے۔ اکثر اوقات بعد کتاب خانی (خوانی) کے سب یہ مذکور کرتے کہ صد حیف و صد ہزار افسوس، جو ہم کم نصیب عبارت فارسی نہیں سمجھتے اور رونے کے ثواب سے بے نصیب رہتے۔ ایسا کوئی صاحبِ شعور ہووے کہ کسی طرح من وعن ہمیں سمجھا دے اور ہم بے سمجھوں کوں سمجھا کر رولاوے۔ مجہ احقر احقر (افقر) کی خاطر میں گذرا کہ اگر ترجمہ اس کتاب کا برنگینی عبارت وحسنِ استعارات ہندی قریب الفہم عامۂ مومنین ومومنات کیجیے تو بموجب اس کلام بانظام کے کہ من بکا علی الحسین اوتبا کا وجبت لہ الجنۃ، بڑا ثواب باصواب لیجیے۔

کیونکہ اس فائدۂ سبحانی سے اور اس مائدۂ ربانی سے زن و مرد اور پیر و جواں، خوانده و ناخوانده اور خورد و کلاں کو بہرۂ فاضل اور نصیبۂ کامل حاصل ہووے اور ہر ایک بے خبر اس دردِ پرسوز اور اس خبرِ غم اندوز کوں سُن کر اور سمجھ کر رووے۔" (۲۸)

ذیل میں کربل کتھا کی لسانیاتی خصوصیات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

(الف) صوتی

حرکات و علل پنجابی زبان کی خصوصیت ہے کہ اس میں ایسے الفاظ جن میں ثانی حرفِ علت ہو، بہ تخفیف حرفِ علت بولے جاتے ہیں، مثلاً: ہتھ، کن، ٹنگ۔ برج بھاشا میں چونکہ الفاظ کو سہل بنانے کا رواج رہا ہے، ایسے الفاظ کو پہلے حرف کے بعد حرفِ علت کے اضافے سے ادا کیا جاتا ہے، جیسے ہاتھ، کان، ٹانگ۔ حرفِ علت کی تخفیف و تکبیر کے لحاظ سے کھڑی بولی پنجابی اور برج کے بین بین ہے۔ لیکن کربل کتھا میں بعض ایسے الفاظ، جو بعد میں بہ تخفیف حرفِ علت رائج ہو گئے، طویل حرفِ علت کے ساتھ ملتے ہیں، یہ غالباً اس زمانے کی زبانِ دہلوی پر برج کا اثر ہے:

لاگے (۱۳۰)

کاندھے (۴۳، ۴۵)

راکھے (رکھ) (۹۰)

آخری دور کی پراکرتوں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ بعض مرکب اور مشدد حروف کی ماقبل حرکات کا اشباع ہو جاتا تھا۔ سنسکرت اصطلاح میں اسے "گن" (गुण) کہتے ہیں۔ اس کے تلفظ کو نسبتہً سادہ اور سہل

بنانے میں مدد ملتی تھی، مثلاً آگی سے آگ یا مکھّن سے ماکھن۔ شمال مغربی بولیوں میں سے پنجابی نے گُن کو منہ نہیں لگایا اور مشدد لہجے کو باقی رکھا۔ کھڑی بولی کے بعض اضلاع مثلاً مظفرنگر، میرٹھ، سہارن پور اور انبالہ وغیرہ میں اس لہجے کا اثر ملتا ہے لیکن دہلی میں اور برج کے علاقوں میں مشدد الفاظ کو سہل کر لیا جاتا ہے۔ کربل کتھا کی زبان بھی اس معاملے میں مٹی پر مائی (۱۵۰) اور ہڈی پر ہاڑ (ہاڈ) (۱۴۷) کو ترجیح دیتی ہے۔

ضمہ

کربل کتھا میں جہاں الفاظ کے پہلے صوتی رکن میں ضمہ ہے، اسے واؤ میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ حروفِ علت کو کھینچ کے ادا کرنے کے رجحان کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، ممکن ہے ضمہ یعنی خفیف لبی مصوتے کا واؤ یعنی طویل لبی مصوتے میں تبدیل ہونا اسی رجحان کی وجہ سے ہو لیکن قرائن سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ گمان غالب یہ ہے کہ ضمہ کے بجائے واؤ کا استعمال کسی صوتی خصوصیت کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ اس زمانے میں اُردو املا کا عام انداز یہی تھا؛ اور اُس کو اوس اور اُن کو اون لکھتے تھے۔ وسطِ انیسویں صدی تک ضمائر کے املا میں بجائے اعراب کے حروفِ علت کا استعمال اسی طریقے پر ملتا ہے۔[۵] کربل کتھا میں یہ انداز صرف ضمائر میں نہیں بلکہ افعال اور اسما

۵۔ بالکل صحیح ہے۔ سید انشا نے اوس پر اعتراض کیا ہے: جب اُس کی جگہ اوس لکھتے ہو تو اِس کو بھی ایس لکھو۔ (دریائے لطافت کے ابتدائی اوراق میں یہ بحث ہے) لیکن اس لڑائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اِس اور اُس دو لفظ ایک دوسرے کے مقابل تھے وہ دونوں گونگے ہو گئے۔ اکثر اوقات یہ صورت پیدا ہوتی ہے کہ کسی عبارت کو پڑھنے میں جب تک اُس کا پہلے سے مطالعہ نہ کر لیا جائے، پڑھنے والا ٹھوکریں کھاتا ہے اور سننے والے کو اُلجھن ہونے لگتی ہے۔

سب سے بہتر ہو گا کہ اُس کو ہمیشہ پیش کے ساتھ اور اِس کو ہمیشہ زیر کے ساتھ لکھیے۔ پرانے زمانے میں جن لوگوں نے و سے کام لیا چنداں بے جا نہ تھا۔ انھوں نے اوس پیدا لکھا اور کاتب کی محنت بچانے کو "اس" کو بغیر اظہارِ حرکت لکھا۔ (ع۔ س)

میں بھی بکثرت ملتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

ضمائر :

اوس	(اُس)	(۱)
اونہے	(اُنھیں)	(۸۶)
اون	(اُن)	(۱۰۵)
اونہوں	(اُنھوں)	(۱۱۱)
دوہی	(وُہی)	(۱۵)

افعال اور اسما :

بورائی	(بُرائی)	(۵۸)
کوتے	(کتے)	(۷۸)
دوکہہ	(دُکھ)	
چوپکے	(چُپکے)	(۸۷)
اوجڑا	(اُجڑا)	(۱۱۴)
اوداس	(اُداس)	(۱۱۸)
کوپی	(کُپّی)	(۳۰)
گوڈّی	(گُدّی)	(۱۳۱)
بولائے	(بُلائے)	(۵۷)
سونا	(سُنا)	(۵۷)
پہونچ	(پُہنچ)	(۵۸)
چھوپا	(چُھپا)	(۶۰)
چوبہا	(چُبھا)	(۶۸)

بوجھائے	(بُجھائے)	(۶۸)
اوٹھا	(اُٹھا)	(۸۳)
سولائی	(سُلائی)	(۸۶)
چوکے	(چُکے)	(۹۳)
پوکارا	(پُکارا)	(۱۰۲)
چون	(چُن)	(۱۵)
اوتریں	(اُتریں)	(۳۸)
جھونجلا	(جُھنجلا)	(۱۳۰)[ے]

مصوتوں کی اس تبدیلی سے صرف دیسی الفاظ متاثر ہوئے ہیں، عربی فارسی الفاظ میں ضمہ برقرار ہے: رُسول (۱۰۰) خُصوص (۹۸) حُرمت (۱۰۱) مُصیبت (۱۱۳) شُجاع (۱۱۷) جُرات (۱۱۷) دُشمن (۱۲۷) حُکم (۸۵)

مصوتہ زیر کے یاے مجہول میں تبدیل ہونے کی مثالیں بہت کم ہیں:

پہیر	(پِھر)[ے]	(۴۲، ۹۰)
ایدھر	(اِدھر)	(۶۶، ۹۴)

ہکار آوازیں اُردو میں ہاے مخلوط، بندشی آوازوں پ ب، ت د، ٹ ڈ، اور ک گ؛ اور ایفرکیٹ (AFFRICATE)

ے اصل یہ ہے کہ ہم لوگ ایک مدت تک فارسی کتابت کی طرح اُردو لکھتے رہے اور رسمِ خط کی درستی کی طرف اس لیے توجہ نہیں کی کہ یہ تو ہماری زبان ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہاں مکتوب لفظ کا تلفظ کیوں کر کرنا چاہیے۔ جب کچھ انگریز اس طرف متوجہ ہوئے مثل گِل کرسٹ کے تو بھی ہمارے لکھے پڑھے لوگوں نے پروا نہ کی۔ (ع۔ص)

ے یہ دونوں صورتیں قدیم زمانے میں مستعمل تھیں۔ (ع۔ص)

آوازوں پر ج کے ساتھ ملتی ہے۔ اُردو کی ہکار[1] (ASPIRATED) آوازیں دس[10] ہیں: پھ بھ، تھ دھ، ٹھ ڈھ، کھ گھ اور چھ جھ[2]۔ یہ خالص ہند آریائی اصوات ہیں اور بندشی آوازوں میں مکمل حیثیت سے صرف ہندوستانی زبانوں میں ملتی ہیں۔ گو ہند آریائی اور ہند ایرانی دونوں کا تعلق ہند یورپی خاندانِ السنہ سے ہے، لیکن ہند ایرانی میں ان کا وجود نہیں۔ اس کے برعکس اُردو نے انھیں ہندی کی طرح تمام وکمال محفوظ رکھا ہے۔ اُردو نے اپنا رسم الخط چونکہ فارسی سے لیا اور فارسی میں یہ آوازیں نہیں تھیں، اس لیے اُردو والے بھی ایک مدت تک ان کی اصلیت سے بے خبر رہے۔ چنانچہ کربل کتھا میں انھیں ہر جگہ ہ سے لکھا گیا ہے اور اس میں ہائے دوچشمی کا وجود ہی نہیں۔ کربل کتھا کے طرزِ املا میں دھرا اور دہر، کھا اور کہا، بھر اور بہر، پھر اور پہر؛ اور بھار اور بہار میں کوئی فرق نہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ محمد شاہی

---

[1] "ہکار" سے بہتر 'کھکھار' یا 'کھکار' ہوگا۔ "مخلوط ہ" اُردو میں مدت سے رائج ہے۔

(ع۔ص)

[2] ہائے مخلوط ل، م، ن، ر، ڑ اور عوامی بول چال میں ی، و اور ز آوازوں کے ساتھ بھی ملا کے بولی جاتی ہے۔ مثلاً دولھا، تمھارا، کنھیا، پڑھ، یہاں، وہاں وغیرہ۔ اس میں شک نہیں کہ ان الفاظ ہ کی آواز مصمتے کے فوراً بعد جڑواں حالت میں آتی ہے اور کسی حد تک پہلی آواز میں ضم ہو جاتی ہے، لیکن اس حد تک نہیں جیسا کہ ہکار آوازوں پھ بھ وغیرہ میں ہوتا ہے۔ وہ انضمام کامل ہے اور یہاں جزوی۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: "اُردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو" (طبع دوم) گوپی چند نارنگ، صفحہ ۳۱-۳۶ بیان ہ، ح۔

(گ۔چ۔ن)

زمانے تک ہکار آوازوں کے لیے ہائے دوچشمی کا رواج نہ ہوا تھا اور اُردو والے انھیں دو آوازوں یعنی ب + ہ اور پ + ہ سے مرکب ہی سمجھتے تھے۔ کربل کتھا میں یہ آوازیں لفظ کے آغاز، وسط اور آخر ہر حالت میں استعمال ہوئی ہیں اور ہر جگہ انھیں ہ سے ظاہر کیا گیا ہے۔ البتہ آخری حالت میں املا کے قاعدے متعین نہیں تھے، مثلاً مجھ کو مجہ بھی لکھا ہے اور مجھہ بھی۔ یعنی آخری حالت میں اکہری ہ اور دوہری ھ دونوں کا استعمال ہوا ہے۔ ہ کے استعمال میں یہ بے قاعدگی اُردو میں اب تک چلی آتی ہے ۔۔۔۔۔۔۔ کربل کتھا میں سوائے مجہ، تجہ، بوجہ اور دکہ کے تقریباً وہ تمام الفاظ جن میں ہکار آواز آخری حالت میں آئی ہے، دوہری ھ سے لکھے گئے ہیں، یعنی رکھہ، ساتھہ وغیرہ۔ دھ اور ڈھ حروف چونکہ بعد کے حرف سے ملا کے نہیں لکھے جاتے، انھیں دوہری ھ سے لکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لیے ان میں ہکار عنصرہ کی شکل میں ملتا ہے:

آغاز: بہر (۱۲) کہولے (۱۵) پہنساتا (۲۹) گہوڑا (۳۰) جہالر (۳۰) چہاتی (۵) دہڑ (۵) تہارا (۱) ٹہوکر (۳۵)

وسط: اندہیر (۳۵) آنکہوں (۳۵) چکہایا (۱۴) بجہا (۴۸) بیٹہے (۳۰) ابہی (۹۹) سیدہے (۳) کاندہے (۳) بچہڑا (۵)

آخر: کچھہ (۳۲) رکھہ (۳۴) ساتھہ (۳۱) دیکھہ (۲۵) بیٹھہ (۲۹) اوٹھہ (۳۰) مجہ (۳۱) مجھہ (۳۰) تہہ (۳) بوجہ (۳) دکہ (۳) جیبہہ (۱) بندہ (۹۹)

ہائے زائد کی مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:

کلھہ (کل) (۵۲، ۶۹) آزردہ گی (۵۳) دیدہ ونسے (دیدوں سے) (۵۹) سنکھینہ (۱۴۷)

مندرجہ ذیل الفاظ میں ہ کی موجودگی کی وجہ سے ماقبل آواز ہکار ہوگئی ہے۔ نچوڑتے میں چ کے بجائے چھ جدید اُردو میں مستعمل نہیں۔ البتہ مادہ ڈھونڈھ میں آخری حالت میں ڈھ ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں اس کی تصریفی شکلوں میں ڈھ موجود ہے۔ لیکن جدید اردو میں ان کا تلفظ سادہ بندشی آواز ہی سے کیا جاتا ہے۔ یہی معاملہ لفظ پھوپیوں کا ہے:

نچھوڑتے	(۱۳۲)
ڈہونڈہ تا	(۹۷، ۱۲۷)
ڈہونڈہ نے	(۷۵، ۸۳)
پہوپیوں	(۱۲۲)
پہوپہیاں	(۱۲۵)

بعض الفاظ میں اس کے برعکس بھی ہوا ہے؛ یعنی ہکار آوازوں کو سادہ کردیا گیا ہے یا آخری حالت میں ہ اُڑا دی گئی ہے۔

سانج	(سانجھ)	(۱۲۰)
ہات	(ہاتھ)	(۲)
گرک	(گھرک)	(۱۸۵)
پنکڑیوں	(پنکھڑیوں)	(۱۰۵)
ہمیش	(ہمیشہ)	(۸۵)

معکوسی آوازیں

اُردو کی معکوسی آوازیں تین ہیں، ٹ ڈ ڑ۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ قدیم ہند یورپی زبان میں ان

وجود نہ تھا اور ہند آریائی نے انھیں قدیم ہندوستانی لسانی اثرات کے تحت اختیار کیا۔ فارسی رسم الخط میں چونکہ ان آوازوں کے لیے کوئی علامت نہیں، اردو میں انھیں ظاہر کرنے کے لیے شروع میں کچھ دقت کا سامنا رہا اور طرزِ املا میں بتدریج تبدیلی ہوتی رہی۔ کربل کتھا کے قلمی نسخے میں انھیں تین نقطوں سے ظاہر کیا گیا ہے۔ چھوٹے ط کا اس میں کہیں وجود نہیں۔ یہ غالباً وسط اٹھارہویں صدی کے بعد کا ارتقا ہے۔ شروع شروع میں شمالی ہندوستان کی زبانوں میں آواز ڑ کا وجود نہ تھا۔ بعض ماہرینِ لسانیات اسے ڈ کا ترقی یافتہ لہجہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن پنجابی زبان میں بالعموم اور ہریانی میں بالخصوص ڈ ہی کو ترجیح حاصل ہے۔ نوادرالالفاظ میں بھی میر عبدالواسع ہانسوی کے تتبع میں اساڑھ کو اساڈھ (ص ۲۲) لکھا گیا ہے۔ یہی ڈ کھڑی بولی میں ڑ اور برج بھاشا میں ر میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ کربل کتھا کی زبان چونکہ دہلی کے لسانی سنگم سے تعلق رکھتی ہے، اس میں دونوں اطراف کے اثرات کی تانک جھانک دیکھی جا سکتی ہے:

ڈ : ر ۔ دانت میرے تورے (۴۳)

ٹ : ت ۔ کہانے کے تیئں کہاتی تہی جب پہلے چباتی تہی تجھے (۱۳۲)

ڑ : ڈ ۔ بوڑھا (۱۶۷) بوڈھیا (۶۲) ہاڑوں (۱۴۶)

زائد ۔ مڑوڑی۔ کنکرہ (۱۳۶) ڈاڑہ (۱۵۵)

غنائی آوازیں

کربل کتھا میں غنائی آوازوں کے مطالعے سے اردو کے تشکیلی دور سے متعلق بعض دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اردو میں ناک کی آوازیں تین ہیں۔ م، ن فصلی اور

ن وصلی۔ یہ تینوں مصمتے ہیں، لیکن ناک کی آوازیں مصوتوں سے مل کر بھی ادا کی جا سکتی ہیں۔ مصمتے کو ادا کرتے ہوئے منہ کا راستہ تقریباً بند کر دیا جاتا ہے اور ہوا محض ناک سے نکلتی ہے۔ لیکن غنائی مصوتہ (نون غنہ) کو ادا کرتے ہوئے [illegible] پیدا کرنے والی ہوا منہ اور ناک دونوں سے بیک وقت خارج ہوتی ہے۔ ایسی آوازیں چونکہ معنی کی تفریق میں مدد دیتی ہیں، اس لیے اہم ہیں۔ اردو رسم الخط میں نون فصلی، نون وصلی اور نون غنہ تینوں کے لیے ایک ہی علامت استعمال ہوتی ہے۔ جدید دور میں نون غنہ کو آخری حالت میں نقطے کے بغیر ظاہر کیا جاتا ہے جبکہ قدیم زمانے میں یہ تخصیص نہ تھی، چنانچہ کربل کتھا میں نون غنہ کو جگہ جگہ نقطے سے ظاہر کیا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ غنائی مصوتوں کو ادا کرتے ہوئے چونکہ ہوا کے راستے میں کم سے کم مداخلت کرنا پڑتی ہے، ایک ایسے رسم الخط میں جہاں حرف وصوت کا رشتہ مستحکم واضح نہ ہو، ان کا صحیح احساس نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ کربل کتھا کی زبان میں غنائی مصوتوں کے استعمال کی بعض دلچسپ مثالیں سامنے آتی ہیں: کہیں کلمے میں نون غنہ املا کی گرفت میں نہیں آسکا یعنی حذف ہو گیا ہے، کہیں اسے بڑھا دیا گیا ہے اور بعض الفاظ میں اس نے اپنی جگہ بدل لی ہے یعنی لسانیات کی اصطلاح میں اس کا تبدل (METATHESIS) ہو گیا ہے۔ ذیل کی مثالوں کو دیکھتے ہوئے اتنی بات خاطر نشان رہے کہ اپبھرنش کے اثرات کی وجہ سے شروع میں اردوئے قدیم میں نون غنہ کا استعمال "حد" سے بڑھا ہوا تھا۔ افضل جھنجھانوی کی بکٹ کہانی میں بھی "کو" "کوں" لکھا ہے۔ پنجابی اور ہریانی میں یہ خصوصیت اب تک ملتی ہے، لیکن جیسے جیسے

اُردو کو کھڑی بولی کی خرادِ پر اتارا جانے لگا، نون غنہ کا " حدّت سے بڑھا ہوا استعمال رفتہ رفتہ اعتدال پر آگیا۔

انحذاف : اُردو میں ضمائر اور اسماے اشارہ کے ساتھ جب کلمۂ حصر استعمال ہوتا ہے تو دو صورتیں حاصل ہوتی ہیں، مثلاً یہ ہی اور یہی۔ پہلی کو مکمّل اور دوسری کو مخفّف کہا جاتا ہے۔ فرقِ صرف یہ ہے کہ " سندھی " (संधि) کے ذریعے ہی کی ہ حذف ہو جاتی ہے یا صوتِ ماقبل ہکار ہو جاتی ہے۔ بعض ضمائر میں آخری حالت میں نون غنہ بھی بڑھا دیا جاتا ہے، جیسے انھیں، ہمیں، تمھیں وغیرہ۔ جملے میں جب کسی بات پر زیادہ زور دینا ہو تو مکمّل صورتیں استعمال کی جاتی ہیں، ورنہ مخفّف صورتیں ہی زیادہ رائج ہیں۔ ان مرکب ضمائر میں آخری حالت کی صوتی غنائیت اردوے قدیم کی یاد دلاتی ہے، 'کربل کتھا' میں درجِ ذیل الفاظ مخفّف صورت میں مع اضافۂ نون غنہ ملتے ہیں :

یونہین (۸۸) یون ہین ماں بین کر روتی تھی۔ (۱۱۴)

تونہین۔ کوئی کہے اے فلک تو نہین ترس کر ہم پر۔ (۱۱۸)

وونہین۔ وونہین ندائے الٰہی ہوئی (۴۳) نیز (۲۹، ۳۰، ۵۳، ۵۴، ۶۵، ۹۲، ۹۴، ۱۲۴)

تیون ہین۔ تیون ہین بعد مرنے کے نظر کسو کی میرے جانے پر نہ پڑے۔ (۵۳)

جدید اُردو میں یہ کلمے مخفّف صورت میں مع نون غنہ مستعمل نہیں۔

مفعولی حالت میں انھیں کو بہ انحذافِ نون غنہ لکھا ہے :

تم انہے مارو (۱۴۰)

انہے تصدیعہ نہ دسے (۱۴۰)

نہ بہر حسین کوں وہ دیکھے سنے حسین انہے (۱۴۱)

جو کوئی انہے لاوے (۸۶)

انہے لے کدہر ہی نکل جاؤں (۱۱۷)

اُردو کے اعداد توصیفی میں مصوتی غنائیت خاص عنصر ہے، لیکن کربل کتھا میں دونو (۸۷) اور تینو (۱۱۷) بہ انحذاف نون غنہ آئے ہیں۔ البتہ گیارہوں (۱۲۹) اور بارہ ویں (۱۳۵) میں نون غنہ موجود ہے۔

حرف "میں" کو اکثر و بیشتر موں لکھا ہے لیکن ایک مقام پر یہ مے کی صورت میں بغیر نون غنہ کے بھی ملتا ہے۔ (۴۴)

کربل کتھا میں چونکہ املا کی حد تک نون غنہ اور نون کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا، جگہ جگہ میں سنے کو مینے لکھا ہے۔ (۴۰، ۲۹، ۳۰، ۴۴، ۴۴، ۵۴، ۴۵)

اضافہ

بعض کلموں میں مصوتی غنائیت کا اضافہ ملتا ہے۔ اب یہ کلمے اس کے بالعکس مستعمل ہیں:

(اُو) کو : کوں (۲۸، ۲۹، ۱۷، ۳۳، ۳۸، ۴۴، ۴۷، ۱۲۴، ۱۲۵)

(اِے) سے : سوں (۹، ۵۲، ۶۱)

(") بیچا : بینچا (۹۰، ۹۴، ۱۰۸، ۷۹، ۳۸)

(اُو) کوچ : کونچ (۹۳، ۹۴، ۱۸۷، ۵۰)

(اَوْ) تو : توں (۱۷، ۳۰، ۸۰، ۳۹، ۴۴)

(اِیْ) پائنتی : پائنتیں (۱۹۱)

کربل کتھا میں گیارہ سے اٹھارہ تک کے اعداد ترتیبی کو بھی نون غنہ کے اضافے سے لکھا گیا ہے۔ لہندا اور مشرقی پنجابی میں یہ اعداد اب بھی نون غنہ کے اضافے کے ساتھ بولے جاتے ہیں جبکہ معیاری اُردو میں ان کا غنائی لہجہ حذف کر دیا گیا ہے۔ ان کلموں میں مصوتی غنائیت چونکہ لفظ کے آخری رکن پر حاوی ہے، اس لیے قدیم طریقِ املا کی گرفت میں پوری طرح نہیں آئی، چنانچہ کہیں اسے ہ سے پہلے لکھا ہے اور کہیں بعد میں :

گیارنہ	(۲۲)
بارنہ	(۳۱، ۳۶، ۱۱۰، ۱۳۳، ۱۵۳، ۱۷۴)
تیرنہ	(۵۸، ۶۹، ۹۴، ۱۵۳)
چودنہ	(۱۵۳)
پندرہ نہ	(۵۱)
سترنہ	(۵۸)
اٹھارنہ	(۱۲۴، ۱۳۳، ۱۵۰)

قلب

دھواں : دھنوا (۴۶، ۸۹)

پاؤں : پانو (۴۳، ۹۵)

پہنائے : پنہائے[1] (۱۲۳)

---

[1] کربل کتھا : آپ زرہ بکتر علی اکبر کوں پنہائے (۱۲۳)

پچھلے دنوں اُردو رسائل میں یہ بحث جاری رہی کہ پنہانا صحیح ہے یا پہنانا۔ اُردو میں دراصل یہ ملتے جلتے تین لفظ ہیں : پنھانا (بروزن فعولن) پہناتا (بروزن فعولن) اور پن ہانا (بروزن مفعولن) ←

دوہرا نون

اردو میں دوہرے مصوتوں کے لیے عموماً علامت تشدید سے کام چلایا جاتا ہے لیکن ایسے افعال میں جہاں مصدر سے پہلے نون موجود ہو، دوہرا نون لکھا جاتا ہے مثلاً جاننا، سننا، گننا وغیرہ۔ کربل کتھا میں ایسے موقعوں پر بھی علامت تشدید استعمال کی گئی ہے :

مجھے توت ان باتیں سونے کی نہیں (۵۳)

یہ مجلس ہے گی تیسری جس میں شہادت اب
شاہِ نجف کی ہے جسے سونا محال ہے (۵۷)

وصلِ غنائی مصمتہ[1]

اُردو میں لبی آواز ب سے نون کا نہیں، م کا وصل ہو سکتا ہے کیونکہ

ــــہ فیلن اور شکسپیر دونوں نے پہنانا اور پنہانا کا ذکر کیا ہے۔ نوراللغات اور سرمایہ زبان اُردو میں پنھانا موجود ہے۔ داغ کا شعر ہے :

آڑی زخموں کی جو قاتل نے پنھائی بدھی آج مقتل میں شہید آئے ہیں دولھا بن کے

آج کل بعض "فصحائے عظام" اس لفظ کو ناٹ باہر قرار دیتے ہیں، مگر جب خود انھیں میں سے ایک کے کلام سے اس کی متعدد مثالیں پیش کی گئیں تو انھیں یہ کہتے بنی :

"یہ اس دور کی غلطیاں ہیں، جب میں اس لفظ کی اہمیت سے واقف نہ تھا"

کربل کتھا میں پنھانا کی موجودگی سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ لفظ دو ڈھائی سو سال پہلے بھی اُردو میں مستعمل تھا۔ (نارنگ)

[1] وصلِ غنائی مُصمت [یا صامِتہ] بہتر اور بولنے میں زیادہ آسان ہوگا۔

نْ ساکن یا مُتحرّک کے بعد ب جب ایک لفظ میں واقع ہو تو نون میم کی آواز اختیار کر لیتا ہے۔ اور نہ صرف ہندی بولیوں بلکہ فارسی، اور عربی میں بھی ان دونوں آوازوں کے ملنے سے مّ پیدا ہوتا ہے۔

فارسی : انبار، انباشتن، تنبول، تنبولی (تمولی)، دُنب (دُم) دُمبال، دُنبالہ، دُنبل، دُنبہ (ایک قسم بھیڑ کی جس کی دُم بہت چوڑی اور موٹی ہوتی ہے) زنبیل، زنبور، شنبہ، سنبوسہ (سموسہ)، گنبد۔

عربی : جنب (اور اس سے جَنبیا، ایک طرح کا خنجر جو دکن میں رائج ہے) عنبر، قنبر، کرنب (کرم کلا)، نبی کی جمع انبیا، انبساط (ع۔ ص)

(اُردو لفظ کنبہ اس اصول سے مستثنیٰ ہے۔) نارنگ

م اور ن دونوں لبی آوازیں ہیں۔ اُردو رسم الخط سے اکثر یہ مغالطہ ہوتا ہے ۔ ہ ب سے پہلے نون استعمال ہو رہا ہے جیسے گنبد، جنبش، انبساط وغیرہ کو ہم لکھتے نون ہی سے ہیں، لیکن بولتے م سے ہیں۔ کربل کتھا سے معلوم ہوتا ہے ہ اس زمانے میں لفظ تھام کو نون اور ب سے لکھتے تھے؛ تھانب۔ بعد میں ب حذف ہوگیا اور صوتی مناسبت کے لحاظ سے نون کو م سے لکھا جانے لگا۔ لفظ لمبا کو اب م سے لکھا جاتا ہے، لیکن کربل کتھا کے زمانے میں یہ نون ہی سے مستعمل تھا؛

حضرت اوسے تہانبے نہ تھنبا (۱۲۷، ۱۳۲)

آپ ہاتھہ لنبا کر اوس کوزہ کوں اوٹھا (۶۹) نیز ۸۸، ۸۹، ۱۲۵۔

(ب) صرفی

مصادر محمود شیرانی نے اُردو کی علامت مصدری "نا" کو پنجابی سے ماخوذ بتایا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مصدری لاحقہ "نا" مشرقی پنجابی، ہریانی اور کھڑی تینوں بولیوں میں مشترک ہے۔ برج کا معاملہ جدا ہے۔ اس میں مصادر بو، اؤ اور نئو کے اضافے سے بنائے جاتے ہیں۔ کربل کتھا کی زبان اس لحاظ سے اردوے قدیم اور کھڑی بولی کے باہمی تعلق کا نیا پہلو پیش کرتی ہے۔ ان افعال میں جن کے مادّے حرفِ صحیح پہ ختم ہوتے ہیں، مصدر "نا" ہی کے اضافے سے بنتا ہے، لیکن جن مادّوں کے آخر میں حرفِ علت ہو، ان میں بجائے "نا" کے "ونا" کا اضافہ کیا جاتا تھا، مثلاً جاونا، کھاونا، پیونا، اٹھاونا، بٹھاونا وغیرہ۔ علامت مصدر "ونا" کا تعلق لہندا سے ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں واؤ

کے بعد نون معکوسی (ण) ہے اور یہاں سادہ نون استعمال ہوتا ہے۔
واؤ کربل کتھا کے افعال کا اہم عنصر ہے اور مضارع اور دوسرے مشتقاتِ فعل میں بھی برقرار رہتا ہے۔

جاونا (۷۰) ہیونا (۷۹) پاونے (۱۵)
لاوے (۱۱۰) چھوڑاوے (۱۱۰) دیکھلاویں (۱۱۷) ہیوتے (۱۱۹)
رووے (۱۲۰) کہاوے (۱۲۱) رولاوے (۱۲۱) آونے (۱۸۸)
جاوے (۴۵) آوے (۴۶) پہنچاویں (۴۷) دہووے (۵۲)
اٹھاویں (۲۸) پاوے (۷۷) لوٹاوے (۷۷) دیوے (۱۶) چمکاوے (۱۷)
سمجھاوے (۴۸) ڈراوتا (۱۵۶) جیوتا (۱۲۲) جاوتا (۹۳)

ہونا مصدر کے مشتقات میں ہو کے بجائے ہووے یا ہوئے ملتا ہے۔ ہوویں کے علاوہ کہیں کہیں ہوئیں کی جھلک بھی نظر آجاتی ہے اور ہووں کے علاوہ ہوں بھی امدادی فعل کی حیثیت سے آیا ہے :

ہوئے : آج سکینہ میری یتیم ہوئے گی (۱۳۰)
جس کو مینے ستایا ہوے یا آرزدہ کیا ہوے (۴۴)
ہووے : صالح اولاد اون کو ہووے عطا (۸)
بدل وجاں مشغول ہووے (۳۰)
ایسا کوئی صاحب شعور ہووے (۲۸)
ہوویں : سب کے دل ڈر سے سوے ہوویں (۳۷)
اس کی مقبول ہوویں سب طاعات (۸)
بیچ قیامت کے وہ بندے محشور ہوویں ہنستے ہوے (۳۸)
قلم سب شجر ہوویں تو بھی زیاد (۱۹)

ہوئیں: دریا خشک ہوئیں گے (۱۲۹)
ہم تم اوس پاس جمع ہوئینگے (۱۶۱)
ایسا مرسل کہ سارے پیغمبر چاہتے اوس کی امت ہوئیں یکسر (۱)

ہوں: میں رحم کرکے دیوں ہوں جیتی انا کانی (۱۸۹)

امر

اُردو میں علامتِ مصدر حذف کر دینے کے بعد باقی امر رہ جاتا ہے جیسے بیٹھ، سن، آ۔ لیکن امرِ مخاطب واحد کو بنظرِ ادب جمع بھی بولتے ہیں، جیسے بیٹھو، سنو۔ کربل کتھا کے زمانے میں امر کی اس صورت کو یائے زائد سے بولتے تھے، مثلاً بیٹھیو، سنیو وغیرہ۔ بعض ماہرین نے اسے امرِ دعائیہ کہا ہے اور امرِ احترامی کی تخصیص ے کے اضافے سے کی ہے، جیسے بیٹھیے، سنیے۔ کربل کتھا میں امر کی یہ تینوں صورتیں یعنی سادہ، دعائیہ اور احترامی ملتی ہیں لیکن حاوی رجحان دعائیہ ہی کا ہے۔ جن مادوں کے آخر میں یائے معروف ہو، وہاں احترامی "و" یا "ے" کے قبل ج بڑھا دیتے ہیں، جیسے کیجیو، کیجیے یا دیجیو، دیجیے۔ یہ ج دراصل یائے زائد کا بدل ہے۔ دیئیے میں ی اپنی حالت پر قائم ہے اور دیجیے میں ج سے بدل گئی ہے۔ مثالیں:

سادہ: لا (۳۰) دو (۱۱۷) چھوڑ د (۱۱۷) جانو (۱۱۹) اوٹھہ (۴۵)
لے (۴۵) کھول (۴۷) بول (۴۷) دے (۴۷)

دعائیہ مع یائے زائد: آئیو (۳۰) بخشیو (۳۴) رکھیو (۵۳) فرمائیو (۵۳)
گذریو (۵۵) سونائیو (۵۹) رہیو (۵۹) پہنچیو (۹۰) کھولیو (۹۶)
نوچیو (۹۶) جائیو (۴۶) کہیو (۴۷)

دعائیہ مع ج: کیجیو (۳۴) ہوجیو (۱۰۰) دیجیو (۱۰۵)

حال مطلق

اُردو میں حال مطلق مادۂ فعل کے بعد تا اور امدادی فعل ہے کی مختلف شکلوں کے اضافے سے بنتا ہے، جیسے جاتا ہے، کرتا ہے. کربل کتھا میں مادۂ فعل کا کام مضارع سے لیا گیا ہے، یعنی صیغہ واحد غائب کے لیے امدادی فعل سے پہلے مادۂ فعل کے آخر میں یائے مجہول بڑھادی جاتی ہے، جیسے جائے ہے، کرے ہے۔ کربل کتھا میں حال مطلق کی یہ صورت عام ہے۔ مولوی عبدالحق نے قواعدِ اردو میں اس کے تغیرات یوں بیان کیے ہیں: جاوے ہے، جاوے ہے، جائے ہے، جاوت ہے، جات ہے اور جاتا ہے. فعل حال مطلق جاوے ہے، کرے ہے وغیرہ کا استعمال راجستھانی اور ہریانی میں بھی ملتا ہے لیکن یہ کھڑی بولی سے مخصوص ہے اور آج بھی دہلی، بجنور، مرادآباد وغیرہ اضلاع میں اسی طرح بولا جاتا ہے۔ یہ انداز جدید نثر میں متروک ہو چکا ہے، لیکن شعر میں خال خال مروج ہے۔

رو لوہو کی نہ دیدۂ گریاں جاوے ہے۔ (۴۶)

حضرت پوچھے کہ کون رووے ہے۔ (۱۳۵)

کلینی بسندہائے معتبر روایت کرے ہے (۱۵۰)

علی بن ابراہیم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام
سے روایت کرے ہے۔ (۳۷)

کربل کتھا میں ہے کے ساتھ گا بھی حال کے معنی میں استعمال ہوا ہے، مثلاً:

سبزہ بھی اوگا ہے گا کہیں شور زمیں بیچ (۶۶)

الوداع اے دوستو ہے گا ہمارا اب سفر (۹۹)

پے بہ پے سب نے کیا ہے گا ظہور (۲۲)

کسے ہے گی قدرت جو اوس کی ثنا (۱۹)

قدیم اردو میں اس کا رواج تھا اور یہ خصوصیت پنجابی اور کھڑی میں مشترک ہے۔

حالیہ معطوفہ | کربل کتھا میں حالیہ معطوفہ کا استعمال بکثرت ہوا ہے۔ جدید اردو میں اس کے لیے کر اور کے کے استعمال کو ترجیح حاصل ہے گو نظم میں اس کے بغیر بھی جائز ہے، جیسے :

وہ بات سن چلتا بنا

کربل کتھا میں حالیہ معطوفہ کا کام بالعموم مادۂ فعل سے لیا گیا ہے۔ کر اور کے خال خال نظر آجاتے ہیں، ورنہ عام طور پر انھیں استعمال نہیں کیا گیا:

امت نے اوس کے فرزندوں کو بھوک پیاس سے بلکا، شربت زہر اور خنجر قہر سے ہلاک کیا۔ (۴۲)

حضرت فاطمہ نے آواز سلمان کی پہچان، جواب دیا۔ (۴۴)

حضرت ہوش میں آ، پوچھے کہ کیا ہے۔ (۴۶)

آنکھوں سے آنسو پونچھ، کہے (۴۷)

اس اندیشۂ عمیق میں سر بہ گریبان تفکر ڈال، دریاے اندوہ و تحیر میں غوطہ کھایا۔ (۴۸)

بعض جملوں میں حالیہ معطوفہ کے لیے "کے" کے بجاے کہ بیانیہ فارسی استعمال ہوا ہے[۱]:

فاتحہ ہات اوٹھا کہ با اخلاص (۲)

موناں مل کہ بہر کسب نجات (۶)

---

[۱] یہ صورت کم سواد کاتبوں کی تحریر نے پیدا کی ہے۔ (ع۔ص)

کرکے تر اوس پانی سے اونگلی شتاب (۲۱)

لیجا کہ جو باپ سے ملا دے (۹۴)

حالِ حسن کوں کر کہ یاد (۵۹)

معاون افعال کربل کتھا کے زمانے میں افعال معاون کا استعمال ابھی باقاعدہ نہ ہوا تھا۔ ہے، ہو، ہیں، ہوں اور گا، گے، گی امدادی افعال کہیں کہیں حذف کر دیے گئے ہیں اور زمانے کے تعین کے لیے حالیہ ناتمام اور مضارع سے مدد لی گئی ہے:

ہے، ہو، ہوں:

اب وہ تیرے باپ سے بدلا مانگتا (۴۴)

ایک عرب دروازے پر کھڑا ہے، بصورت مہیب و بشکل عجیب، رخصت مانگتا کہ اندر آوے (۴۶)

حسین نے کہا اے نانا میں بھاگتا نہیں بلکہ تمہیں پکڑنے میں گرم کرتا، معشوق کہ عاشق سے بھاگتا ہے، بلکہ عاشق کوں اپنی اپنی محبت میں تیز کرتا (۴۳) جو اکھٹے بیٹھتے ہو، ہمارا بھی ذکر کرتے یا نہ (۳۹)

گا، گے، گی:

قاسم کہا ... تجھے بھی شربت مرگ اسی سے چکھاؤں اور تیرے فرزندوں کنے بھجاؤں (۱۱۱)

نہ جانوں بعد میرے کپڑے میرے بچوں کے کون دھووے اور ... نہ جانوں بعد میرے ان کے سر کے بالوں کوں کون دھووے۔

(۵۲)

اگر یزید کوں قبول کرے، ملک عراق اور تخت و تاج تصرف میں آوے

اور ملکۂ عالم کہلاوے۔ (۶۶)

حالیہ میں جب ہُوا صفت کے معنی میں آیا ہے، تو اسے بھی حذف کر دیا ہے :

ارزق بدبخت چاروں بیٹھے موے دیکھا (۱۱۰)

اے ارزق کہاں روا ہے کہ مرد سپاہی کہلاوے اور سوار ہوتے
گھوڑے کے تنگ کی خبر نہ رکھے۔ (۱۱۱)

ضمائر کربل کتھا کے بعض ضمائر سے برج بھاشا کے اثرات کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ یہ کے بجائے یو (۸۰، ۸۱، ۱۹) وہ کے بجائے وو (۱۲، ۸۹، ۹۰، ۱۰۴، ۱۱۱، ۱۱۸، ۱۲۴) کس کے بجائے کسو (۳۳، ۵۰، ۹) اور اُس کے بجائے وِس (۱۲۰)[1] استعمال ہوئے ہیں۔ ضمیر شخصی مخاطب واحد تو حد سے بڑھے ہوئے غنائی اثرات کے تحت توں ہوگئی ہے (۱۵، ۳۰، ۸۰، ۹۰، ۳۹، ۴۳)

---

[1] کربل کتھا میں وِس کا استعمال زیادہ نہیں۔ لیکن صفحہ ۱۲۰ پر اس کی موجودگی (آہ وِس ملعون نے وہ ہاتھ بہی گرایا) سے معلوم ہوتا ہے کہ وسط اٹھارویں صدی کی دہلوی اُردو میں یہ ضمیر مستعمل تھی۔ اُردو میں یہ غالباً برج بھاشا کے اثر سے آئی۔ کربل کتھا کے بعد وِس کا استعمال اس مرثیے میں ملتا ہے جسے گلکرسٹ نے "گرامر آف ہندوستانی لنگویج" میں نقل کیا ہے۔ یہ مرثیہ عبد اللہ مسکین سے منسوب ہے جو محمد شاہ (۱۷۱۹-۱۷۴۸) کے زمانے میں ہوگزرا ہے۔ (درگاہ قلی خاں سالار جنگ : مرقع دہلی ص ۵۱)۔ انڈیا آفس لائبریری لندن کے ایک قلمی مخطوطے "منشات شاکر" سے بلوم ہارٹ نے نمونے کی جو عبارت نقل کی ہے، وِس اُس میں بھی موجود ہے (ہندوستانی مخطوطات، ص ۱۳۶) جان بلیٹس نے بھی اسے قدیم اُردو میں مستعمل بتایا ہے (ہندوستانی گرامر ص ۱۱۷)۔ جدید اُردو میں وِس کی جگہ اُس نے لے لی ہے، لیکن دہلی کی عوامی بولی میں یہ ضمیر اب بھی رائج ہے۔ (ر۔ک۔ اُردو سے دہلی کی کرخنداری بولی، گوپی چند نارنگ، ص ۷۱)

ضمیر موصولہ جس کے علاوہ تس بھی استعمال ہوئی ہے :

میں اکیلا رہ گیا اور بیری ایتے تس پہ ہائے (۱۴۲)

تس پہ ہوتا ہے اب مرن تیرا (۱۱۳)

فاعلی اور غیر فاعلی حالتوں میں ضمیر شخصی اپنا، اپنی، اپنے کے بجائے اپس کا استعمال ہوا ہے۔ یہ ضمیر نواح دہلی کی زبان سے تعلق رکھتی ہے اور افضل جھنجھانوی کی بکٹ کہانی میں بھی ملتی ہے :

اس کوں کروں گی کیا جو اپس آس گنوائی (۱۱۵)

آسماں لرزا اپس پر ہو گیا نیلہ تمام (۱۲۱)

کہہ اپس دو کہہ کے بچن مجھ سے سچے (۱۲۸)

اعرابی لاحقے

غنائی آوازوں کی بحث میں یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ کربل کتھا میں کو کے بجائے کوں اور میں کے ساتھ ساتھ موں اور مے استعمال کیے گئے ہیں۔ اسی طرح سے کے ساتھ سوں اور سیتی استعمال ہوا ہے۔ سیتی اور ستی فائز، حاتم، آبرو اور دیگر متقدمین کے ہاں بھی بار بار ملتے ہیں :

کوں : حاضراں مل کہ اس مطالب کوں (۹)

اس کوں ظالم پیٹ رکھے بے چین (۱۲)

جب حضرت جنگ نہروان کوں متوجہ ہوے (۵۷)

موں : دیباچۂ کتاب کا دل موں خیال ہے (۱۵)

پھرتی تھی خیمہ موں روتی بے قرار (۱۲۳)

دل موں کہا (۲۹)

سیتی : ہوا تب یہ طوفان سیتی خلاص (۱۹)

اے بچے کر اپنے بابا سیتی بات (۱۱۸)

ہو بے بس اوس گھڑی عباس سیتی شہ نے کہا (۱۱۷)

سوں: فاتحہ اب پڑھو دل و جاں سوں (۹)

ہر طرف اضطراب سوں رو رو نظر کیے (۶۱)

ابھی اوس کے ہی ماتم سوں نہ پایا تھا فراغ (۵۲)

صلات | بیچ : یہ ظرفی صلہ ہے اور اندر یا میں کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ میں، موں، سے وغیرہ لاحقے بغیر کسی وساطت کے آتے ہیں، جبکہ بیچ اضافی علامت کی مدد سے جملے میں استعمال ہوا ہے:

علم ہدایت کا اور نشان عنایت کا بیچ صحن عالم قدس کے بلند کیا (۱۸)

ایسا بادشاہ ... کہ... بندہ نوازی بیچ ملک ہندوستان کے ...

قبضہ درایت اوس کے میں آئی۔ (۲۵)

لگ، تلک : کربل کتھا میں لگ او تلک مجروری صلہ تک کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ مندرجہ ذیل مثالوں میں لگ ظروف اب جب تب کے ساتھ آیا ہے:

اب لگ کہ سن عزیز اوس کے نے ... (۲۶)

اب لگ یہیں بیٹھے (۳۰)

تب لگ کہ رات آئی (۵۰)

اے اخی کب لگ یہ بے آبی سہیں (۱۳۰)

جب لگ کہ خواند میرا نہ پہونچے کے (۱۴۲)

یہاں تلک روئیں (۵۰)

کنے: یہ ظرفی صلہ پاس کا ہم معنی ہے اور اسم کی اضافی حالت کے طور پر استعمال ہوا ہے:

تم کوں سونپے حق کنے ہم جاتے ہیں گے اپنے گھر (۹۹)
بہ خوشی تمام چچا بزرگوار کنے گیا (۱۰۶)
مینے سونپا خدا کنے دل موں (۱۴۷)

صفاتِ ضمیری مقداری | اتنا، جتنا کے قدیم روپ اِتّا، جتّا کربل کتھا میں ملتے ہیں۔ ان الفاظ میں ن بعد میں اضافہ کیا گیا اور تشدید حذف ہوگئی۔ جان بیمز کا بیان ہے کہ ن لاحقہ تصغیر ہے جس کے اصلی معنی بعد میں فراموش کر دیے گئے جبکہ جان پلیٹس نے نون کو دوسرے ت کا بدل بتایا ہے۔ کربل کتھا کے دیسی الفاظ میں چونکہ اظہارِ کسرہ کے لیے ی استعمال ہوئی ہے۔ اِتّا، جِتّا میں یائے زائد بھی ملتی ہے:

جیتا کہ حضرت تازیانہ مارتے تھے (۹۵، نیز ۸۳، ۱۲۰)
اے خرہ ایتے دن توں کہاں تھا (۱۰۱)
ایتے بیگانوں میں کوئی آشنا میرا نہیں (۱۴۲) نیز ۹۴، ۱۱۱، ۱۱۹، ۱۴۲

حرفِ استفہام کَے تعداد کے لیے آیا ہے اور غیر منصرف ہے:

اے فرزند اس مہینے سے کے دن گذرے (۵۸)

ظرف زماں جب کے لیے جدہاں بھی استعمال ہوا ہے:

جدہاں کہ کوچ بہ کوچ اوّر طرف مدد شاہ جلا (۱۸۷)

یہ بڑا اچھا اور بڑے کام کا لفظ تھا جسے ہمارے شاعروں نے متروک قرار دے کے تحت
نستہ کیا ہے۔ ...

کربل کتھا میں کبھو بکثرت استعمال ہوا ہے۔ ظرفِ زماں کب اور کلمۂ حصر ہی سے مخفف کبھی حاصل ہوتا ہے۔ برج کے اثر سے قدیم اُردو کے مخفف کلمات میں ہی کا دوسرا روپ ہو بھی رائج تھا جس سے مرکب کبھو بنا:

لیٹ جاتا کبھو بچے کوں لے اوڑھنا کبھو (۱۳۰)

ہائے اب کبھو نہ دیکھوں گی (۵۰)

وحدت و جمع فاعلی حالت میں مذکر مونث دونوں کی جمع کے لیے زیادہ تر لاحقہ "اں" استعمال کیا گیا ہے:

بیچاریاں اور محروم دوکھیاریاں بے وارث (۱۳۰)

وہ بہی دوکھیاں (۱۲۴)

ہائے بابا کیا کریں گیاں ہم دوکھیاریاں تیرے بعد

کس کوں کہہ بابا پوکاریں ہم بچاریاں تیرے بعد (۶۲)

نیز حاضراں (۹، ۱۰، ۱۴۰) مومناں (۱۲) قدماں (۳۰) گہاواں (۸۰) شتراں، اسپاں، اونٹاں (۱۴۹)۔ قدیم اُردو میں بھی مذکر مونث دونوں کی جمع "اں" سے آتی تھی۔ فائز اور حاتم کے زمانے تک اس کی مثالیں مل جاتی ہیں: (یہ پنجابی اور ہریانی کا اثر تھا)

دو بھواں تیغ جنوبی سی دراز (فائز)

لب پہ گلوں کے مہر کرے ان لباں کا رنگ (حاتم)

تذکیر و تانیث بعض الفاظ جو اب مونث بولے جاتے ہیں، کربل کتھا میں مذکر استعمال ہوئے ہیں:

اے پدر جان میرا قربان تیرے (۲۶)

جانؔ[1] اپنا جان دینے والے کوں سونپیا (۱۰۳)
بعد تیرے پناہ ہمارا کون ہوئے گا (۴۷)
جوں یہ فریاد و فغاں لڑکی کا گھرا سے بلند ہوا (۹۴)

(ج) نحوی

فعل جمع مونث اردو میں فعل تذکیر و تانیث اور واحد و جمع میں اپنے فاعل کے مطابق آتا ہے۔ کربل کتھا کی زبان اس سلسلے میں دو خصوصیات کے لحاظ سے ممتاز ہے۔ ایک یہ کہ مفرد فعل مونث کی جمع " ں " سے نہیں " یاں " کے اضافے سے بنائی جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ علامتِ مستقبل بھی اس اصول کے تحت گی سے گیاں ہو جاتی ہے:

اندر سے کئی عورتیں نکلیاں (۵۷)
اے کاش مدینہ میں دادا کی قبر پر ہوتیاں تا درد دل اپنا اس قبر سے کہتیاں (۶۲)
رو رو بانو کے تئیں دیکھلاتیاں (۱۲۴)
بہنیں بھی تیری بلکتیاں پانی بن (۱۲۵)
خاک سر پہ اوڑاتیاں تہیں (۱۱۵)
ہم بغیر تیرے دنیا میں کیوں کر بہ رہ سکیں گیاں اور بغیر تیرے دیدار کے کیوں کر زندگی کریں گیاں۔ ہائے بابا کیا کریں گیاں ہم دکھیاریاں۔ (۶۲)

---

[1] اودھ کے قصبات میں عورتیں آج بھی جان (بمعنی جسم) بولتی ہیں جیسے بچے کا سارا بدن نیلا ہو رہا ہے یا اس کے سارے جان میں دانے پڑ گئے ہیں۔ (ش۔ ص)

اعرابی حالتیں

<u>اضافی حالت</u> : اردو میں حرفِ اضافت عموماً مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان واقع ہوتا ہے۔ لیکن کربل کتھا میں عربی فارسی کی تقلید میں یہ وضع قائم نہیں رہتی[1] اور مضاف و مضاف الیہ ایک ساتھ لائے جاتے ہیں اور حرف اضافت ان کے بعد آتا ہے۔ جہاں توصیفی حالت میں یا فاعل و مفعول کے اظہار کے لیے حرف اضافت دوبار آیا ہے، وہاں دونوں حروف مضاف اور مضاف الیہ کے بعد ایک ساتھ آئے ہیں، جیسے کے کی، کی کی، کا کے وغیرہ:

ایسا شکور بے زوال کہ عام ہیں عطیات اوس کے (۱۶)
آگ عشق اوس کے کی بیچ انگیٹھی سینہ پرکینہ میں روشن ہوتی۔
ایسا احد کہ دلیل صمدیت اوس کی کی لم یلد ولم یولد ہے (۱۶)
جب لگ خواقین بیچ میدان مملکت لایزال اوس کے کی پانو سکونت سلوک راہ بندگی کا نہ رکھیں (۱۷)

<u>اضافی و مجروری</u> : اسی طرح اگر اضافی اور مجروری حالت کسی جملے میں ایک ساتھ واقع ہو تو حرف اضافت کے اور حرف جار سے ایک ساتھ آتے ہیں:

بعد از واقف ہونے سب احوال شہادت مآل جگر گوشہ ہاے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سے۔ (۲۰)
ایک فرزند فرزندان بزرگوار اوس کے سے ... دشت کربلا میں شربت شہادت کا چکھے گا۔ (۳۶)
آواز اوس کی سے ڈرے اور لرزے (۴۶)

---

[1] خیال یہ ہے کہ فارسی عبارت کا ترجمہ لفظی کیا جاتا تھا۔ اور وہی صورت بعض کتابوں کی ہے ملاحظہ ہو تحسین کی عبارت۔ (ع۔ ص)

اضافی و فاعلی :

جب مشیت بے علت اوس کی نے بیچ تمشیت امور ایجاد و تکون کے تعلق پکڑی (۱٦)

ابتدائے سن رشد اور تمیز سے تا اب لگ کہ سن عزیز اوس کے نے حدود عشرین سے دو تین منزل تجاوز کیا ہے۔ (۲۷)

سپاہ اوس کی نے جس طرف منہ دیکھایا (۲۵)

اضافی و ظرفی :

ایسا بادشاہ ... کہ ... عنان عدالت ... بیچ ملک ہندوستان کے ... قبضۂ درایت اوس کے میں آئی (۲۵)

ہمیشہ ... تصریح کرنے حکایتوں اخبار حضرت امام حسین علیہ السلام کی میں مائل و راغب رہتا تھا (۲۷)

مفعولی حالت : مفعولی ثانوی حالت میں جہاں "کے لیے" کے بجائے "کے واسطے" کا استعمال ہوا ہے، وہاں واسطے اسم یا ضمیر سے پہلے آیا ہے، یعنی بطور لاحقے کے نہیں بلکہ بطور سابقے کے :

واسطے اس خون کے کہ ہمارے تن سے گرا ہے (۳۷)

بہشت واسطے اس کے ہے (۴۰)

ظرفی حالت : ظرفی حالت میں دو خاص حروف بیچ اور اوپر استعمال ہوئے ہیں جو اب متروک ہو چکے ہیں۔ یہ بھی لاحقے کی حیثیت سے نہیں بلکہ سابقے کے طور پر آئے ہیں :

جب مشیت بے علت اوس کی نے بیچ تمشیت امور ایجاد و تکون کے تعلق پکڑی۔ (۱٦)

جب لگ خواقین بیچ میدان مملکت لایزال ... (۱۷)

اوپر ضمیر ارباب فضل اور اصحاب دانش کے مبین اور مبرہن ہوجیو (۳۱)

ذیل کے پارے میں اوپر کے تقریباً تمام نکات کی مثالیں مل جائیں گی۔

حمد بے غایت اور ثنا سے بے نہایت شائشتہ و سزاوار اوس کبریا ے واجب الوجود کوں کہ بزرگی صفات کمال اوس کی کی ورک افہام سے مبرا ہے، اور ... کمال صفات جلال اوس کے کا احاطہ اوہام سے شعرا عقل عقلاؤں کی درک کرنے حقیقتِ ذات اور صفات اوس کی سے بیچ مضیق عجز و قصور کے اور فہم بلغاوں کے پاونے بھید بلاغت اور فصاحت اعجاز کلام مجید اوس کے سے بیچ مقام حیرت و فتور کے، ذاتِ پاک اوس کی بیچ ہر جہت کے بہ حقیقت موجود ہے، اور حقیقت ہر موجود کی بیچ پرتو نور وجود اوس کے کے نابود۔ (۱۵)

حذفِ حروف

اضافی کی:

جہانِ روشن اوس آنکھوں آگے اندھیر ہوا (۱۱۰)

مفعولی کو:

یہ کہہ جان جان آفریں سونپیا (۱۲۸)

مفعولی ثانوی کے:

ایک فاتحہ مخفی اس کام بانظام لیے بھی پڑھیا (۲۹)

حق تعالیٰ بہشت میں مکان نیک اوس لیے برپا کرے (۳۹)

سببی سے: سببی حالت میں سے کے حذف سے اسم میں "وں" کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ یہ خصوصیت کھڑی اور پنجابی میں مشترک ہے:

ہم بے کسوں کوں پیاسوں مت تیا (۱۰۸)

پیا سوں آوتی ہے مجہ انکھیوں میں اندھیاری (۱۱۸)

یہ اندازِ بیان جدید اُردو میں بھی ملتا ہے۔ میں نے اسے آنکھوں دیکھا۔ وہ بھوکوں مرگیا۔

فاعلی نے : اُردو میں قاعدہ ہے کہ اکثر فاعلی حالت میں فعل متعدی کے ماضی مطلق، تمام، احتمالی اور حالِ قریب کے ساتھ علامت فاعلی نے استعمال ہوتی ہے۔ کربل کتھا میں نے کا وجود تو ملتا ہے لیکن اس کا استعمال خاصا بے قاعدہ ہے اور اکثر و بیشتر اسے حذف کر دیا گیا ہے۔ شمالی ہند کی جن بولیوں سے اُردو سے قدیم کا خمیر اُٹھا تھا، ان میں علامتِ فاعلی نے پنجابی اور کھڑی بولی سے مخصوص ہے[1]۔ پوربی ہندی اور برج بھاشا میں اس کا وجود نہیں۔ ہریانی اور گجراتی میں نے مفعولی اور فاعلی دونوں حالتوں میں آتا ہے۔ مگر اُردو میں یہ فاعلی حالت سے مخصوص ہے۔ کربل کتھا میں نے کے استعمال میں جو بے ضابطگی ملتی ہے، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خود کھڑی بولی میں وسط اٹھارہویں صدی تک "نے" نے علامت فاعلی کی شکل میں جڑ نہیں پکڑی تھی۔

ماضی مطلق میں نے کے استعمال سے اصل فعل لازم ہی کے طریقے پر آتا ہے یعنی مادۂ فعل پر اضافہ الف کی شکل میں، جیسے اس نے کہا، انھوں نے فرمایا، لیکن کربل کتھا میں جہاں جہاں نے استعمال نہیں ہوا مادۂ فعل پر اضافۂ الف کے بجائے اضافہ "ے" یعنی مضارع سے کام چلایا گیا ہے، جیسے وہ فرمائے، وہ کہے، وغیرہ۔ پہلی حالت میں وحدت و جمع اور تذکیر و تانیث کا فعل پر کوئی اثر نہیں ہوتا جبکہ دوسری حالت میں مندرجہ ذیل صورتیں حاصل ہوتی ہیں :

[1] نے کے بارے میں میرا خیال ہے کہ پنجابی لفظ "نو" اصل تھی، جس نے اُردو میں داخل ہو کر ایک نیا روپ اختیار کر دیا۔ (ع۔ ص)

غائب	واحد	جمع
مذکر	وہ فرمایا	وہ فرمائے
مونث	وہ فرمائی	وہ فرمائیں

یعنی نے کے حذف سے واحد، جمع، مذکر، مونث کی صورتیں مختلف ہو گئیں۔ کربل کتھا میں یہ سب استعمال ہوئی ہیں، لیکن زیادہ تر جمع مذکر ہی ملتی ہے جو بنیادی طور پر مضارع سے مختلف نہیں۔

جمع مذکر:

پھیر فرمائے اوس آگے (۳)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرمائے (۳۷)

جوں نظر حضرت کی مجبہ پر پڑی، فرمائے (۴۰)

پاس اپنے بٹھلا فرمائے (۴۰)

حضرت امیر دروازۂ مسجد کوفہ میں پہونچ، گھوڑے سے اتر، قدم مسجد میں رکھے اور نماز ادا کر منبر پر سدھارے اور ایک خطبۂ الٰہی اور نعتِ رسالت پناہی ادا فرما، حاضروں کوں عذاب الٰہی سے ڈرائے اور ثوابِ جاودانی سے امیدوار کیے پھر منبر کے داہنی طرف دیکھے، حضرت امام حسن کوں دیکھ پوچھے (۵۸)

حضرت نگاہ دوڑا دیکھے (۱۲۸) سلام کہے (۵۴)

پھر پیشانی دونوں کی چوم رخصت کیے اور فرمائے (۴۹)

واحد مونث:

تب حضرت فاطمہ فرمائی (۴۳)

جوں دولہن وہ آواز جاں نواز سونی، خیمہ سے باہر دوڑ کر دیا (۱۰۸)

فاطمہ کہی (۵۳)

کچھہ جواب نہ سونی، پھر رو کر کہی (۵۳)

جمع مونث:

زینب کہیں (۱۳۲)

شہر بانو اوٹھیں اور ایک خلعت قیمتی شیریں کو پہنائیں (۱۶۵)

سکینہ کہیں (۱۳۲)

حضرت فاطمہ یہ خبر وحشت اثر سن رونے لگیں اور کہیں (۴۶)

استعمال نے:

شاہزادوں نے کہا اے اسما کبھو دیکھا ہے توں نے کہ بغیر ماں کے کہا اکہاتے ہیں (۵۳)

جوں حضرت فاطمہ نے یہ بات سونی (۴۴)

حضرت نے فرمایا (۴۵، ۴۶، ۳۹، ۴۳)

کربل کتھا میں استعمال نے کی مثالیں کم ہیں عام طور پر اسے حذف کر دیا گیا ہے۔ حذف نے کا یہ انداز قدیم اُردو اور دکنی زبان میں مشترک تھا حامد حسن قادری صاحب نے کربل کتھا کی اس لسانی خصوصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے فضلی کو "دکنی الاصل" قرار دیا ہے (داستان تاریخ اُردو، ص ۵۰)

اوپر کی بحث سے واضح کیا جا چکا ہے کہ متعدی افعال کی ماضی مطلق میں مضارع کا استعمال دکنی سے مخصوص نہیں، یہ نتیجہ ہے محض علامت فاعلی نے کے استعمال میں بے قاعدگی کا جو دہلوی اُردو میں بھی میر و سودا کے زمانے یعنی شروع انیسویں صدی تک پائی جاتی تھی۔ حاتم کی ایک غزل کی ردیف ہے — "ہیں ہم" اور قوافی کیے، دیے، پیے ہیں۔ فائز کہتے ہیں ایک

یمی میں بھنگیرن دلربا۔ میر کا مصرع ہے : گل کو محبوب میں قیاس
یا۔

ضمائر بعض حالتوں میں ضمائر کی منصرف صورتوں میرے، ہمارے
تمھارے وغیرہ کے بجائے مجھ، تجھ اور ہم استعمال ہوئے ہیں :

تجھ جود سے عرش و فرش آئے بوجود (۱۵)
تجھ لطف اگر مدد نہ کرتا یارب (۵)
مردوں سے جو کوئی کہ پہلے حوض کوثر پر مجھ پاس پہونچے تو ہووے گا (۴۵)
مسند جنت بنی ہے ہم لیے (۶۰)
مجھ لیے مرے گا (۱۰۶)
ہم ساتھہ محشور ہو (۳۹)

کربل کتھا میں اضافی حالت میں ضمیر چونکہ مضاف کے بعد آتی ہے
اس لیے جمعیت سے متاثر ہوکر لاحقہ "وں" یا "یں" اختیار کرتی ہے :

دریغ ان مونہوں تمھاروں سے کہ گرد غریبی بھریں گے اور افسوس
ان بالوں تمھاروں سے کہ غبار یتیمی سے آلودہ ہوویں گے (۴۷)
باتیں میریں گر ہیں سوتیں سن لو پھر پچھتاوگی (۱۳۷)
پس قائم رکھو حکم ہماروں کوں (۳۹)
نعمتوں اپنیوں کو تمھارے اوپر تمام کیا (۴۲)

ترتیبِ الفاظ کربل کتھا کے جملوں میں الفاظ کی ترتیب عام ہندوستانی
ترتیب سے قدرے مختلف ہے اور بہت کچھ عربی فارسی
کا انداز لیے ہوئے ہے۔ ہندوستانی میں اسم یا ضمیر جملے کے شروع میں
اور فعل ہمیشہ آخر میں آتا ہے۔ لیکن کربل کتھا میں اکثر فعل جملے کے وسط

میں اور اسم یا ضمیر اس کے بعد لائی جاتی ہے۔ عربی فارسی کی تقلید میں مضاف، مضاف الیہ اور جار مجرور کی ہندوستانی ترتیب بھی الٹ گئی ہے۔ جس کی مثالیں اعرابی حالتوں کے ذیل میں اوپر پیش کی جا چکی ہیں شمالی ہند میں یہ اندازِ بیان مرزا رفیع سودا، میر محمد حسین عطا خاں تحسین، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر دہلوی وغیرہ کی نثر میں بھی ملتا ہے۔ دکنی اُردو چونکہ عربی فارسی کے حد سے بڑھے ہوئے اثرات سے نسبتہً آزاد تھی، اس میں بخلاف شمالی ہندوستان کی نثر کے یہ ترتیب نہیں ملتی، بلکہ وہاں فعل اکثر جملے کے آخر ہی میں آتا ہے۔ ہندوستانی میں عام قاعدہ ہے کہ پہلے مبتدا، پھر خبر اور بعد میں فعل ربط ؛ اور متعدی افعال کی صورت میں اوّل فاعل، اس کے بعد مفعول اور اس کے بعد فعل خبر ہوتا ہے ۔ کربل کتھا کے جملوں میں یہ ترتیب اکثر قائم نہیں رہتی، کبھی خبر پہلے اور مبتدا بعد میں اور کبھی خبر بعد میں اور فعل ربط پہلے آتا ہے۔ اسی طرح فعل متعدی کا مفعول بھی اس کے متصل قبل نہیں، مابعد بھی آسکتا ہے۔ نیز صفت اور تمیز بھی موصوف، اسم صفت یا فعل سے پہلے نہیں بلکہ بعد میں لائی جاتی ہے :

پیش ازیں کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع اور اب لگ ترجمہ فارسی بہ عبارت ہندی نہیں ہوی مستمع (۲۸)

کس سن ہجری میں تصنیف یہ کتاب ہوئی (۳۱)

ادب چوکھٹ ہماری کا بجالایا (۴۶)

خواب میں دیکھا میںنے (۴۵)

روزِ عاشورا حضرت امام رضا علیہ السلام کی خدمت موں گیا میں (۴۰)

المسمیٰ بفضل علی والمتخلص بہ فضلی ... کہ خوشہ چیں سب سخن فہموں کے کہلیان کا ہے (۲۶)

یا الٰہی مجہ سے کیا واقع ہوئی خطا (۳۵)

تجہے بہی اوس درد کا شریک کیا ہم نے (۳۵)

ایسی خبروں خوش افزا سے بوجہہ غم کا دل سے تیرے نہیں اوٹہتا (۴۸)

الفاظ و املا | زیرِ نظر کتاب کا متن نسخۂ اشپرنگر کی مدد سے تیار کیا گیا ہے۔ اس کی بعض خصوصیاتِ املا کی طرف حروفِ علت اورغنائی، معکوسی اور ہکار آوازوں کے ذیل میں اشارے کیے جاچکے ہیں؛ یعنی یہ کہ ہ اور ہائے مخلوط میں امتیاز نہیں کیا گیا۔ نون اور نونِ غنہ میں آخری حالت میں بھی کوئی فرق نہیں۔ ٹ ڈ ڑ معکوسی آوازوں کو تین نقطوں سے ظاہر کیا گیا ہے۔ دیسی الفاظ میں کسرہ کے لیے اکثر؛ اور ضمہ اور فتحہ کے لیے کہیں کہیں بالترتیب واؤ اور الف کا استعمال کیا گیا ہے۔

کاتب نے الفاظ عام طور پر ملا کے لکھے ہیں۔ مرکزوں اور نقطوں میں بھی کفایت شعاری سے کام لیا ہے۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق غنائی مسموع اور غیر مسموع آوازوں یعنی ک اور گ میں؛ اور یائے معروف و مجہول میں امتیاز نہیں کیا۔ اس کے علاوہ بعض دیسی الفاظ میں صفیری آواز س کو ث سے ظاہر کیا ہے۔ ذیل میں کر بل کتھا سے بعض ایسے لفظ درج کیے جاتے ہیں جو موجودہ مروج املا سے مختلف انداز میں لکھے گیے ہیں:

اثی ۸۰، ۱۱۹ (اسی) ثات ۷، ۷۹، ۸۵، ۹۳ (سات) مثیں ۱۱۳ (مسیں) ڈہارث ۱۳۰ (ڈھارس) خواوند ۸۶، ۸۸ (خاوند) خانہ دان ۱۱

(خاندان) توباہ ۱۷۳ (توبہ) مردانہ گی ۱۲۰ (مردانگی) سکہینہ ۱۱۹ (سکینہ) دعوا ۱۰۸ (دعوے) پیٹ تا ۱۱۲ (پیٹتا) پیٹ تی ۱۱۳ (پیٹتی) کوملہا ۱۲ (کمّلا) ہیہاتہہ ۴ (ہیہات) وسلچہ ۱۶۳ (وسلچہ) معن ۲۹ (معاً) ثانی ۲۸ (ثوانی)

غریب الفاظ:

ترڑپہنا ۷۰، ۹۱، ۹۵، ۱۱۲، ۱۲۰، ۱۲۸ (ترڑپنا)

کہوکرا ۱۸۰ (کھو کھلا)

چہنالی ۸۸، ۸۹، ۱۰۲، ۱۶۲ (چھین لی)

اندہلا ۶۷ (اندھا)

ہلکم: میں خرابیوں میں خراب ہوتا پہروں ہوں ہلکم (۸۷) ہلکم: تہلکہ، ہلچل، اودھم (فرہنگ آصفیہ جلد ۴ ص ۷۲۴)

ابرن: اب رنڈاپا ملے ہے دولہن کوں؛ تو چپتی ہے وہ اپنے ابرن کوں (۱۱۳): زیور

تپہن: دیکہہ قاسم توں اوس کی تپہن کون؛ یاد کرتی ہر ایک سخن تیرا (۱۱۳)

اوکنا: اوکتا تے کرتا رہا (۶۷)

(ڈالنا - قے کرنا۔ استفراغ کرنا، زمین دیکھنا، جی برا کرنا۔ آصفیہ جلد اول، ص ۲۱۸)

بلچنا: ایدھر قاسم کی ماں لاش سے بلچی اور مونہہ سے مونہہ مل کہتی تہی۔ (۱۱۳)

(گتھنا، لپٹنا، چمٹنا۔ آصفیہ اول ص ۴۱۱)

الچہوں: تجہ کوں پائی تہی دو کہیا لے بیچے؛ ہائے کن الچہوں کن مرادوں سے (۱۱۴)؟

کاہلا : اسمانے کہیا ماں کا جیو کا ہلا ہے۔ (۵۴) شاید کاہل سے بمعنی بیمار۔

نجہانا : میرا شفیق پدر مرگیا نجہاتی قبر (۵۱)
سبہوں نے جو نجہاکر دیکہا (۱۶۷)
اس سر کوں تنور سے نکال نجہاکر دیکھی (۱۵۴) (غور سے دیکھنا)
جب خوب نجہاکر دیکہا تو سر امام حسین ہے (۱۵۰)
نجہاتی ہوں وہ مچہاتی جوانی (۱۵۰)
جو تیری لو تہہ مچہی کوں نجہا (۱۱۳)
نجھانا : غور سے دیکھنا (پلیٹس : ۱۱۲۵)

مچہاتی : اوس بہتیجے نوجوان کی مچہاتی لاش جب ... (۱۱۲)
میرے بیٹے کی مچہی لاش دیکہائی (۱۱۴)
(مچہانا : مستی کے جوش میں آنا، گرمانا : آصفیہ جلد ۴ ص ۳۰۰)
بہونڈ پیری : اے لوگو میں بہونڈ پیری تہی کیا جو میرے آتے
دولہہ موا تہی مجہ قدم ہی کی یہ بورائی (۱۱۴)
(واؤ لکھا جاتا ہے، پڑھا نہیں جاتا۔ لکھنؤ۔ منحوس، سبز قدم۔)
(نور اللغات طبع اول جلد اول ص ۷۰۳)

ہتہواسنا : ڈہال ہتہواسنے کر پہر اوس ... پہ حملہ کیا۔ (۱۱۰)
(تلوار سونتنا، قبضہ پر ہاتھ ڈالنا۔ آصفیہ ۴ ص ۷۰۰)
ہُڑکنا : دودہ بن اس شیر خوارے کا ہوڑکنا دیکہیے (۱۳۰)
(بچوں کا کسی چیز کو یاد کرنا، کسی چیز کی جدائی میں بچوں کا مغموم
اور افسردہ ہونا۔ آصفیہ، ج ۴، ص ۷۱۴)

گِگِیا : مظلوموں نے گِگِیا کر کہا (۸۹)
(ا) گھگی بندھ جانا۔ خوف یا ڈر کے مارے سکتہ کا عالم ہونا۔
(ب) گڑگڑانا۔ عاجزی کرنا۔ منت سماجت کرنا۔
(آصفیہ، جلد چہارم ص ۱۳۴)

ڈاک لگنا : تمام رات ڈاک سے بے قرار رہے (۶۷)
دردِ پیٹ کا امام کوں شروع ہوا، زمین پہ لوٹنے لگے اور
ڈاک نے غلبہ کیا (۷۰)
(متواتر قے ہونا، آصفیہ، جلد دوم، ص ۳۱۸)
ع کیا بیوں میں ہجر میں ساقی کہ لگ جائے گی ڈاک
بس گلو میرا ابھی شیشہ کا گلو ہو جائے گا (ناسخ)
(سرمایۂ زبانِ اردو، جلالؔ لکھنوی۔ معاون الشعرا میں پہلا مصرع
یوں ہے : ع کیا بیوں میں ہجرِ ساقی میں کہ لگ جائے گی ڈاک)
لیکن اصل شعر یوں ہے :
کیا پیوں مے ہجرِ ساقی میں کہ لگ جاوے گی ڈاک الخ
(دیوانِ ناسخ دوم، صفحہ ۳۲ طبع کانپور ۱۹۰۰ء)

تیرہ تیزی : تیرہ تیزی کی بیسویں تاریخ کہ وہ دن حضرت کے جہلم کا تھا
(۱۹۱) نیز ۶۹، ۱۰۰۔ (تیرہ تیزی صفر کا مہینہ جس کی تیرہویں تاریخ
بُری مانی جاتی ہے)

ہٹ پٹانا : پڑے گا چین تبھی جب کہ باپ کی گود کی
مجھے ملے گی میرا جیو ہٹ پٹاتا ہے (۱۸۶)

سار : توں سار یا ہے کی کیا جانے ہے کنارِ فرات (۱۱۹)

(سار، قدر، قیمت، منزلت۔ آصفیہ ۳ ص ۶)

انا کانی دینا: میں رحم کرکے دیوں ہوں جیتی انا کانی
یہ باز آتے نہ میرا غضب ہی بہاتا ہے (۱۸۹)

(اغماض کرنا۔ جان کر انجان بننا۔ سنی ان سنی کرنا۔ ٹال جانا ؎
دل میں کیا ہے کیا نہیں پر کان سے غیروں کا ذکر
سن کے اس نے لے ظفر کچھ آنا کانی دے تو دی

فرہنگ آصفیہ، جلد اول، ص ۱۵۰)

نال: اس مجلس نویں میں شہادت پڑھوں ہوں میں
عباس علی محمد انس کی کہ نال ہے (۱۱۶)

(پنجابی، نال بمعنی ساتھ؛ آصفیہ ۴ ص ۵۳۴)

خرنت ہونا: مرد پیر ہے اور خرفت ہوا ہے (۱۵۴)
(خرِف: (ع) صفت۔ وہ شخص جو پیرانہ سالی سے بدحواس ہوگیا ہو۔
مہل۔ بے ہودہ) نور اللغات طبع اول جلد دوم صفحہ ۴۸۹

کلکلانا: ام کلثوم نے کلکلا کہا (۱۶۲)
(بدمزاج اور ترش رو ہونا، فرہنگ آصفیہ، جلد سوم، ص ۵۴۳)

الہا: لوہو کے الہے میں موہنہ اپنا چھپایا۔ (۱۶۲) (آلہا = طاقچہ)

اونٹنا: ایک اصغر طرف اونٹے تہا جگر (۱۲۳) (جوش کھانا، غصہ میں جلنا؛
آصفیہ اول ص ۲۳۴)

ایانی: اب آئی ہوں گی عقل و شدہ سے ایانی (۱۵۲)
(ایانی: سیانی کی ضد)

گہکنا: .. کہ دوڑے گہک شامی سب ایک بارہی (۱۵۲)

(گھکنا: تیز آواز سے بولنا، نہایت تپاک اور گرم جوشی سے کلام کرنا۔
آصفیہ ۴ ص ۱۳۳)

بوہارنا: پلکوں سے تج کوں بوہارے جا بہ جا
تیری اب جاروب مجہ مژگان ہے (۱۴۳)
(بُہارنا: جھاڑنا، جھاڑ دینا، صاف کرنا۔ آصفیہ ۱ ص ۳۲۰)

چیتا ہونا: دشمنوں کے ہوئے ہیں اب چیتے
شیرِ نر باپ کے کہاں گیا تو (۱۲۷)
(چیتیا: فہم، عقل، خیال؛ آصفیہ ۲ ص ۱۴۹)

کلول ٹلنا: ہاں ماں جایا ہمارا ہم سے کل
بچھڑے گا کیوں کر یہ کلول جاوے ٹل (۹۸)
(آفت و بلا رفع ہونا، مصیبت دُور ہونا:
ہمیں غش آگیا تھا وہ بدن دیکھ تری کلول ٹلی ہے جان پر سے
آصفیہ ۳ ص ۵۴۵)

اینچ: کربل کتھا میں یہ لفظ کھینچ کے معنی میں ۳۸ بار استعمال ہوا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے: "کھینچنا، کشش کرنا، گھسیٹنا، تاننا، کسنا، اپنے ذمہ لینا، ضامن ہونا، اوٹنا" (جلد اول ص ۲۴۲) دو مرکب الفاظ، اینچا تانا: "ایک طرح کا بھینگا" اور اینچا تانی: "کشاکش، لڑائی جھگڑا" میں بھی یہ جزو اول کے طور پر آتا ہے۔ جدید اُردو میں اینچنا یعنی کھینچنا مستعمل نہیں، گو علاقہ جامع مسجد دہلی کی عوامی بولی میں یہ ابھی تک اس معنی میں بولا جاتا ہے اور کھڑی بولی کے بعض اضلاع میں کھینچنا اینچنا، یعنی اینچنا بطور تابع مہمل استعمال ہوتا ہے۔ کربل کتھا

سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

جواہر الفاظ چون کر تیج رشتہ بیان کے اینچے (۱۵)

پانو میری زیارت سے نہ اینچیو (۵۳)

سلام مجہ ... دل جلے کا اور غم ودوکہہ اینچے ہوئے کا عرض کیجیو (۵۴)

آگ دشمنی اس کی نے شعلہ اینچا (۵۸)

آہِ دردناک اپنے جگر جلے سے اینچے (۱۳۶)

یحییٰ ذوقِ محبت سے شمشیر اینچا (۱۶۳)

کربل کتھا میں مندرجہ ذیل ہندی الفاظ بھی ملتے ہیں جو اب اردو میں متروک ہو چکے ہیں:

جیو، ۵۳ (جی) بہیتر (۹۷) سٹ، ۸ (پھینک) چنگے: "جو ہیں بیمار چنگے ہوویں سب" (۸) نیٹ، ۱۲۰ (بہت، پوری طرح) تج (۴) سیس (۵) نین (۲) موندنا (۴۶) بسرام (۱۲) جگ (۲۲) نت (۲۷) لوتہہ، ۱۵۱ (لاش) رن (۱۲۱) جیبھہ (۱۱۸) جیبہ (۱۲۴) پدان، ۱۲۸ (بعد میں، پیچھے) رن سینگی ۹۹ (جنگ کا نقارہ) اندہیار، ۱۱۷ (اندھیرا) انجھو ۱۱۸ (آنسو) گھنیرا، ۱۲۰ (بہت، گھنا) بھوئین، ۱۲۰ (زمین) دوہاگن ۱۰۵ (ضد سوہاگن) سوہاگی، ۱۱۴ (راس آئی)

کربل کتھا کا لسانی مطالعہ

ڈاکٹر خلیق انجم

کربل کتھا کمال الدین حسین بن علی واعظ کاشفی کی مشہور و مقبول کتاب روضۃ الشہدا کا تقریباً آزاد ترجمہ ہے۔ جو کسی ادبی مقصد سے نہیں بلکہ مذہبی ضرورت کے پیشِ نظر کیا گیا تھا۔ فضل علی فضلی نے لکھا ہے کہ وہ ہر سال روضۃ الشہدا کا خلاصہ مجلسوں میں سنایا کرتے تھے۔ لیکن عورتیں فارسی سمجھنے سے قاصر تھیں اس لیے انھوں نے اس کتاب کو اُردو میں ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ لکھتے ہیں۔

(میں) خلاصہ روضۃ الشہدا کا ... سوناتا تھا۔ لیکن معانی اوس کے نساء عورات کی سمجھ میں نہ آتے تھے .... مجہ احقر احقر کی خاطر میں گذرا کہ اگر ترجمہ اس کتاب کا برنگینی عبارت وحُسنِ استعارات ہندی قریب الفہم عامۂ مومنین و مومنات کیجے .... پھیر دل میں یہ گذرا کہ ایسے کام کرام کوں عقل چاہیے کامل، اور مدد کسو طرف کی ہووے شامل، کیونکہ بے تائیدِ صمدی و بے مددِ جناب احمدی یہ مشکل

صورت پذیر نہ ہووے اور گوہر مراد رشتۂ امید میں نہ آوے' لہٰذا پیش ازیں
کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع' اور اب تلک ترجمہ فارسی بہ عبارت ہندی
نہیں ہوئے مستمع [1]

اس عبارت سے یہ اہم نتائج نکلتے ہیں۔

۱۔ اس زمانے میں روضۃ الشہدا کو بہت مقبولیت تھی اور دلی کی مجلسوں میں سنائی جاتی تھی۔

۲۔ ایسی عورتوں کی تعداد بہت کم تھی جو فارسی سمجھتی ہوں۔

۳۔ شمالی ہند میں اس سے پہلے کوئی کتاب فارسی سے اُردو میں ترجمہ نہیں کی گئی۔ یا کم از کم ہماری طرح فضلی کو بھی اس کا علم نہیں تھا۔

ترجمہ ہوتے ہوئے بھی لسانی اعتبار سے کربل کتھا ایک اہم ترین کتاب ہے۔ اگرچہ بقول فضلی ۱۱۴۵ھ (۳۲-۱۷۳۲ء-۳۳-۱۷۳۳ء) میں ترجمہ ہوئی اور ۱۱۶۱ھ (۴۷-۱۷۴۷ء-۴۸-۱۷۴۸ء) میں اس پر نظر ثانی کی گئی۔ لیکن شمالی ہند میں لکھے جانے والے نثری کارناموں میں یہ قدیم ترین کتاب ہے۔ اب تک ہمارے بعض ماہرین لسانیات پنجابی، ہریانی، برج بھاشا اور دکنی زبانوں کی بنیاد پر اردو زبان کی ارتقائی منزلوں کے متعلق گفتگو کرتے رہے ہیں لیکن کربل کتھا شمالی ہند کی قدیم اُردو یا کھڑی بولی کی پہلی نثر ہے جو اُردو زبان کے بہت سے تاریک پہلوؤں کو روشن کرے گی۔ ایسے شواہد موجود ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ کربل کتھا دہلی میں ترجمہ ہوئی۔ لیکن فضلی کہاں کے رہنے والے تھے؟ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت کہاں ہوئی؟ یہ اہم ترین سوال تحقیق طلب ہیں۔ کربل کتھا میں ایسے الفاظ اچھی خاصی تعداد میں ملتے ہیں جو اُس عہد کے دہلوی شعرا کے

---

[1] کربل کتھا، ص ۲۸

کلام میں نہیں۔ پھر اس نثر میں پنجابی، ہریانی، برج بھاشا اور راجستھانی کی کچھ خصوصیات ملتی ہیں۔ اُن کی توجیہہ پیش کرنے کے لیے فضلی کے وطن کی تحقیق لازمی ہے۔

کربل کتھا کے لسانی مطالعے سے قبل ضروری ہے کہ فضلی کے اسلوبِ بیان کی دو اہم خصوصیات بیان کر دی جائیں۔ پوری کتاب میں نثر رواں دواں اور سلیس ہے۔ غالباً اس لیے کہ فضلی نے کاشفی کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے لیکن جہاں کہیں وہ اصل متن کے پابند ہوتے ہیں، عبارت میں سلاست اور روانی نہیں رہتی بلکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ لفظی ترجمہ کیا گیا ہے۔ مثلاً یہ عبارت ملاحظہ ہو :

"حمد بے غایت اور ثنا بے نہایت شایستہ و سزاوار اوس کبریاے واجب الوجود کوں، کہ بزرگی صفاتِ کمال اوس کی کی درکِ افہام سے مبرّا ہے اور لالی حمد و جوہرِ ثنا تحفۂ وارثایان اوس بادشاہِ عالی بارگاہ کوں، کہ کمال صفاتِ جلال اوس کے کا احاطہ اوہام سے معرّا، عقل عقلاؤں کی درک کرنے حقیقتِ ذات اور صفات اوس کی سے، بیچ مقام حیرت و تحیر کے، ذات پاک اوس کی بیچ ہر جہت کے بہ حقیقت موجود ہے۔"[1]

کربل کتھا کے ابتدائی صفحوں پر ترجمہ کا یہ انداز بہت زیادہ ہے۔ بعد میں شاذ و نادر ہی ایسی مثالیں ملتی ہیں۔ فضلی کے بعد کافی عرصے تک فارسی اور عربی کتابوں کے اردو تراجم میں یہ انداز موجود رہا۔

کہیں کہیں عبارت مقفّیٰ ہو گئی ہے۔ مثلاً :

اے بھائی اپنی سکینہ اور فاطمہ کی دلداری کر، کہ ان کے دھوپ میں جل گئے تیور۔

---

[1] کربل کتھا، ص ١٥

> اے بھائی اپنے زین العابدین سے پیارے کی خبر لے، اور اوس بیمار کوں دوا دے۔ کیونکہ وہ ایک تو بیمار ہے، اور دوسرے بیٹھہ اوس کی زخمی بے شمار ہے، دل اوس کا پیاس سے جلا، اور سر اوس کا ظلم سے کہوٹا ہے[1]

لسانی خصوصیات

اسم کے جمع بنانے کے طریقے

۱۔ اردو میں جب بھی اسم کے ساتھ حرفِ ربط آتا ہے تو "وں" لاحقہ بڑھا کر جمع بناتے ہیں مثلاً فرزندوں کوں (۳۶) دشمنوں سے (۳۸) آنکھوں سے (۴۵) وغیرہ۔ فضلی نے سب سے زیادہ اسی قاعدے سے اردو اور فارسی الفاظ کی جمع بنائی ہے۔ تقریباً ہر صفحے پر اس کی مثالیں موجود ہیں کہیں کہیں اسم کی جمع اسی قاعدے سے بنائی ہے لیکن حرفِ ربط کا استعمال نہیں کیا۔ مثلاً "پھیران سارے حاضروں خاطر" (۱۴) یہ دراصل "حاضروں کی خاطر" ہے۔

۲۔ دہلی کے گرد و نواح میں بولی جانے والی زبانوں پنجابی اور ہریانی میں "آں" لاحقہ بڑھا کر جمع بناتے ہیں۔ فضلی نے مندرجہ ذیل الفاظ میں اس لاحقے کا استعمال کیا ہے "حاضراں" تیرہ دفعہ استعمال کیا گیا ہے۔ (۲، ۲، ۹، ۱۰، ۱۰، ۱۱، ۱۱، ۱۲، ۱۲، ۱۳، ۱۳، ۵۹، ۱۷، گیارہ دفعہ شعر اور دو دفعہ نثر میں)۔ ان میں بارہ دفعہ یہ الفاظ ندائیہ حالت (VOCATIVE CASE) اور صرف ایک بار فاعلی حالت (NOMINATIVE CASE) میں استعمال

---

[1] کربل کتھا، ۱۶۲

ہوا ہے۔ دینداراں (۶) محباں (۵) موناں (۶) دوستاں (۸۴) شعر میں نظم ہوئے ہیں اور نثر میں محباں (۴۲) حالت ندائیہ میں استعمال ہوئے ہیں۔ مسافراں (۸) حاجیاں (۸) بطور قافیہ حالت ظرفی (DATIVE CASE) میں اور شہیداں (۷) ولیاں (۷) فرزنداں (۶) زلفاں (۸۸) نظم میں مفعولی حالت (ACCUSATIVE CASE) میں، ناظراں (۳۲) قاریاں (۳۲) سامعاں (۳۲) نثر میں اخراجی حالت (ABLATIVE CASE) میں، اور مرداں (۶۵) نظم میں فاعلی حالت میں استعمال ہوئے ہیں۔ دینداراں (۸) اور نائراں (۸) نثر میں DATIVE CASE آئے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ عہدِ فضلی میں جمع بنانے کا یہ طریقہ کچھ زیادہ رائج نہیں تھا۔ فضلی نے سب سے زیادہ ندائیہ حالت میں اور وہ بھی نظم میں اس قاعدے سے جمع بنائی ہے۔ جو غالباً شعری ضرورتوں کا تقاضا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس قاعدے سے جمع ابتدائی صفحوں میں بنائی گئی ہے۔ اور بعد کے صفحوں میں اس کی مثال شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ جمع بنانے کا یہ طریقہ فارسی میں بھی ہے لیکن فضلی پر پنجابی اور ہریانی کا اثر ہے۔ ممکن ہے کہ کھڑی بولی میں بھی یہی طریقہ رائج رہا ہو جو بعد میں متروک ہوگیا۔

۳۔ جن واحد الفاظ کے آخر میں ا یا ہ ہوتی ہے۔ اگر اُن کے ساتھ حرفِ ربط آ رہا ہو تو وہ یائے مجہول سے بدل جاتی ہے۔ جیسے "وہ قلعے میں گیا" یا "لڑکے نے کہا" وہ اسم جو عزیزوں اور رشتے داروں کے معنوں میں آتے ہیں۔ اس قاعدے سے مستثنیٰ ہیں۔ مثلاً ابا، نانا وغیرہ۔ لیکن فضلی نے چچا کو "چچے" (۱۸۲) اور دادا کو "دادے" (۱۶۱) لکھا ہے۔ اگرچہ پوری کتاب میں ایسی مثالیں چھ سات سے زیادہ نہیں ہے۔

۴۔ کہیں کہیں فارسی اور عربی جمع الفاظ کی جمع الجمع کر دی ہے۔ مثلاً بلغا سے بلغاؤں (۱۵) احادیث سے احادیثوں (۳۷) اصحاب سے اصحابوں (۴۲) حاجات سے حاجاتیں (۱۴) اور مطالب سے مطالبوں (۹) وغیرہ۔

۵۔ ایک دو مقامات پر واحد کے بدلے جمع اسم کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً الٰہی مجھ سا کمترین مخلوقات تیرا کوئی نہیں (۳۱)۔ عجائب وقت دیکھتا ہوں۔

۶۔ ایسے فارسی اور عربی الفاظ کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ جن کی جمع ان کی اصل زبان کے قاعدے کے مطابق بنائی گئی ہے۔ مثلاً سلاطین (۱۷) خواقین (۱۰) سادات (۸) اوطان (۸) محنت کشیدگاں (۱۶) مقربین (۳۴) وغیرہ۔

۷۔ کہیں کہیں فارسی اور عربی الفاظ کی جمع انھیں زبانوں کے قاعدے کے مطابق بنائی گئی ہیں۔ حالانکہ وہ عام طور پر اردو میں مستعمل نہیں مثلاً عورات (۱۷۲) پیمبرین (۳۶) اور طاعات (۹) وغیرہ۔

۸۔ بعض مقامات پر اگر اسم جمع ہے تو اس کی صفت کو بھی جمع کر دیا ہے۔ مثلاً گنہ گاروں لئیموں کوں (۱۷۴)، بچوں بے گناہوں کوں (۱۸۸) حکم ہماروں (۳۹) وغیرہ۔

ضمیریں

اردو میں اضافی ضمیریں اسم سے پہلے استعمال ہوتی ہیں۔ مثلاً میرا قلم، تیری کتاب وغیرہ۔ لیکن فارسی میں یہ ضمیریں اسم کے بعد آتی ہیں۔ جیسے کتابِ من، قلم شما وغیرہ۔ فضلی نے چونکہ فارسی سے ترجمہ کیا ہے۔ اس لیے عام طور پر اضافی ضمیروں کا استعمال فارسی قاعدے سے ہوا ہے۔ مثلاً "اے حبیب میرے، اس جگر گوشے تیرے کوں کربلا کے جلتے توے پر امت تیری بریاں کرے (۴۳)" یہ حبیبِ من، جگر گوشۂ تو اور امتِ تو کا لفظی ترجمہ ہے۔

جدید اردو میں کسی اسم کی خوبی یا خرابی پر زور دینے کے اضافی ضمیر بعد میں لاتے ہیں۔ جیسے یہ لڑکا اچھا ہے۔

ضمیر شخصی متکلم

	واحد	جمع
فاعلی	میں	ہم
ظرفی / مفعولی	مجھے، مجکوں[1]	ہمیں
اضافی	میرا، میری، میرے، مجہ[2]	ہمارا، ہماری، ہمارے، ہماروں[3]، ہم[4]

ضمیر شخصی حاضر

	واحد	جمع
فاعلی	توں[5] - تم[6]	تم - تمھوں[7]
ظرفی / مفعولی	تجھے، تجکوں[8]	تمہیں
اضافی	تیرا، تیری، تیرے، تمہارا، تمہاری، تجہ[9]	تمہارا، تمہاری، تمہارے، تم، تمہاروں[10]

---

[1] نقلی نے جہاں کہیں مجہ (مجھ) اور کوں ملا کر لکھا ہے۔ "جھ" کو "ج" کر دیا ہے۔

[2] مثلاً "تا لب حوضِ کوثر مجہ پاس پہنچیں (۴۲)۔ یہ روایت مجہ آگے نقل کی (۳۸)

[3] یہ اضافی ضمیر صرف ایک بار استعمال ہوئی ہے۔ بس قائم رکھو حکم ہماروں کوں (۳۹)

[4] اضافی ضمیر "مجہ" کی طرح ہم کا بھی استعمال ہوا ہے۔ بس دوست رکھو ہم کوں، تا ہم ساتھ محشور ہو (۳۹)

[5] کھڑی بولی کے اُس علاقے میں جہاں ادبی اُردو کا اثر نہیں ہے۔ مثلاً مظفر نگر میں یہ ضمیر آج

ضمیر شخصی غائب

	واحد	جمع
فاعلی	وو، وہ	وو، وہ
مفعولی/ظرفی	اوسے، اس (کو)	اونہے، انہوں (کو)
اضافی	اُن، اُس، وِس	اون، انہوں
	(+ کا، کے، کے)	(+ کا، کے، کی)

---

۱۲ پوری کتاب میں یہ ضمیر ۲۳ دفعہ نظم اور ۳۶ دفعہ نثر میں استعمال ہوئی ہے۔ کتاب کی ضخامت کے پیشِ نظر یہ تعداد بہت کم ہے۔ یہ ضمیر کہیں واحد اور کہیں جمع کے لیے آئی ہے۔

۱۳ کربل کتھا میں یہ ضمیر صرف ایک بار استعمال ہوئی ہے۔ اور وہ بھی نظم میں۔ تمہوں نے اتنی ہی کی زندگانی (۱۳۲)

۱۴ تجہ اور کوں اگر ملا کر لکھا ہے۔ تو "جھ" کو "ج" میں بدل دیا ہے۔

۱۵ مثلاً تجہ درگاہ میں سدا مجہ عاجزی رہے منظور (۳۴)

۱۶ مثلاً بالوں تمہاروں (۴۷) موہوں تمہاروں (۴۷) یہ ضمیر صرف دو بار استعمال ہوئی ہے۔

---

۱ مثلاً حضرت فرمائے تا اونہے حجرۂ خاص میں لے گئے (۶۳)۔ وو طفل صغیر رکھتے تھے کر اونہے بہت پیار کرتے تھے (۶۴)

۲ انہوں کو گلے لگا، دعائے خیر کر، رخصت کیے۔ (۶۳)

۳ "وِس" (۱۲۰) بجائے اُس صرف ایک بار استعمال ہوا ہے۔ یہ ضمیر آج بھی دِلّی کی کرخنداری بولی میں موجود ہے۔ (۶۴)

۴ مثلاً تب ہوئی اونہوں کی زینت مندر کا واقعہ (۶۲)

ضمیر اشارہ

واحد۔ یہ، یو، اسے

جمع۔ یہ، یو، انہے

ضمیر معکوس

	واحد	جمع
فاعلی	آپ	آپ
مفعولی	اپس	اپس
اضافی	اپنا، اپنی، اپنے اپس	اپنا، اپنی، اپنے، اپس اپنیوں[1]

ضمیر موصول

	واحد	جمع
فاعلی	جو	جو
مفعولی	جس، جن	جن

صلہ کے طور پر "جو" کے ساتھ "وہ" اور جس کے ساتھ تس آتے ہیں۔

ضمیر متلازمہ

	واحد	جمع
فاعلی	تس	تنہے[2]

---

[1] اس اضافی ضمیر کا استعمال صرف تین دفعہ اس طرح ہوا ہے کہ اسم پہلے آیا ہے اور ضمیر بعد میں۔ باتوں اپنیوں (۱۶) خواص اپنیوں (۶۷) نعمتوں اپنیوں (۴۲)

[2] یہ ضمیر صرف ایک بار ص ۱۵۱ پہ استعمال ہوئی ہے۔

شخصی احترامی ضمیر

جدید اُردو میں یہ ضمیر "آپ" ہے۔ لیکن فضلی نے پوری کتاب میں صرف ایک بار (۴۴) یہ ضمیر استعمال کی ہے۔ دہلی کے گرد و نواح میں بولی جانے والی زبانوں ہریانی اور پنجابی میں یہ ضمیر نہیں ہے۔ جن مقامات پہ ادبی اُردو میں "آپ" کا استعمال لازمی ہے۔ وہاں بھی فضلی نے توں اور تیرے استعمال کیا ہے۔ مثلاً (حضرت فاطمہ نے کہا) پدر بزرگوار کوں رات خواب میں دیکھا میں نے کہ کھڑا ہے اور ہر طرف دیکھتا ہے۔ گویا منتظر کسو کا ہے۔ میں پوکاری کہ اے بابا توں کہاں ہے کہ جدائی تیری سے جان میرا لب آیا (۵۲)" بعض مقامات پہ ضمیر "توں" ہے لیکن فعل وہ ہے جو "آپ" کے ساتھ آتا ہے۔ مثلاً حضرت علی اکبر اپنے والد حضرت امام حسین سے کہتے ہیں: "اے پدر مہربان و اے دلدارِ غریباں، وہ وقت نہ ہوئے کہ بغیر تیرے ایک پل اس دہرِ سراسر قہر میں جیوتا رہوں اور روا مت رکھو کہ بعد تیرے اکیلا ان ظالموں میں مروں۔ اپنی لڑائی اتنے موقوف فرمائیے۔ ... (۱۲۲)" کہیں فعل کی شکل یہ ہو جاتی ہے "اگر تیری خدمت میں مجھ سے کچھ تقصیر ہوئی ہو، معاف فرمائیو (۵۳)

"نے" کا استعمال

جدید اُردو میں اگر فعل لازم ہو تو فاعلی ضمیریں استعمال کرتے ہیں اور فعل کا اثر صرف کام کرنے والے تک محدود رہتا ہے۔ مثلاً وہ ہنسا، تم روئے، لیکن فعل متعدی کے ساتھ AGENTIVE ضمیریں استعمال کرتے ہیں۔ اس کا اثر فاعل سے گزر کر مفعول تک پہنچتا ہے۔ جیسے اُس نے کھانا کھایا۔ تم نے پانی پیا۔ فعل لازم اپنے فاعل کے مطابق ہوتا ہے۔ ضمیر یا اسم کی تعداد یا

جنس کے مطابق فعل بدلتا ہے۔ مثلاً (تعداد) لڑکا ہنسا۔ لڑکے ہنسے (جنس) لڑکا ہنسا۔ لڑکی ہنسی۔ ان مثالوں میں فعل ہنسا۔ ہنسے۔ ہنسی استعمال ہوا ہے۔ فعل متعدی اپنے مفعول کی تعداد یا جنس کے مطابق بدلتا ہے۔ مثلاً (تعداد) اس نے کتاب پڑھی۔ اس نے کتابیں پڑھیں (جنس) اس نے میز توڑی۔ اس نے قلم توڑا۔

فضلی عام طور پر ان قاعدوں کے پابند ہیں۔ لیکن کہیں کہیں وہ روگردانی بھی کر جاتے ہیں۔

انھوں نے متعدی افعال کو لازم افعال کی طرح بغیر "نے" کے استعمال کیا ہے۔ مثلاً

فاطمہ کہی (۵۳) بجائے فاطمہ نے کہا۔

حضرت کہے (۷۰) بجائے حضرت نے کہا۔

حضرت رسول پیار سے تصدق کیے (۴۲) بجائے حضرت رسول نے پیار سے تصدق کیا۔

وہ بے حیا عرض کی (۶۷) بجائے اس بے حیا نے عرض کیا۔

اسی طرح ماضی معطوفہ میں "نے" کا غلط استعمال کیا ہے۔ مثلاً

ملعون نے آپ اوٹھ چراغ جلا اوس گھر میں گیا (۸۷)

تب حضرت آدم نے اپنا در دہول مصیبت حسین پر زار زار روے (۳۵)

پھر حضرت نے کچھ باتیں عباس سے کہہ رخصت کیے (۱۱۷)

ملعون نے شمشیر اپنی اوس ملعونہ کو گرو دے کر، حضرت کے پاس آیا (۵۸)

اسمانے اون کوں ایک اور مکان میں بٹھا کھانا لائی (۵۳)

تب حرام زادہ نے ہاتھ مسلم کا پکڑ کوٹھے پرے گیا (۸۰)

حروفِ ربط

جدید اُردو میں جو حروفِ ربط استعمال ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ مندرجۂ ذیل بھی استعمال ہوئے ہیں۔

کوں (کو کا استعمال بہت کم ہوا ہے) تئیں، سوں، سیتی، سوں، بیچ، لگ (بجائے تک)

حروفِ عطف

جدید اُردو میں جو حروفِ عطف استعمال ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ مندرجۂ ذیل بھی استعمال ہوئے ہیں۔

دا لانہ (ورنہ)

لیک (لیکن)

معکوسی آوازیں

ہریانی، پنجابی اور قدیم اُردو میں "ڑ" اور "ڑھ" کی بجائے "ڈ" اور "ڈھ" کا تلفظ زیادہ ملتا ہے۔ کربل کتھا میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً

بُوڈھیا (۷۶۔۷۷۔۷۸) جدید اُردو بُڑھیا

بڈھاؤں (۱۳۲) جدید اُردو بڑھاؤں

بڈہی (۷۵) جدید اُردو بڑھی

کہیں "د" کی بجائے "ڈ" استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

ڈاڑھی (۱۴۹، ۱۸۸) جدید اُردو داڑھی

ڈاڑھ (۷۷۔ ۱۵۵) جدید اُردو داڑھ

کہیں "ڑ" کی بجائے "ر" استعمال ہوا ہے۔ جیسے گھُرکنا (۱۳۰-۱۴۳)
جدید اُردو گھڑکنا۔

کہیں "ر" کی بجائے "ڑھ" استعمال ہوا ہے۔
کنکڑہ (۱۳۶) جدید اُردو کنکر۔

معکوسی آوازوں کے یہ تمام تلفظ قدیم اُردو میں ملتے ہیں۔

ہاکار آوازیں

بعض الفاظ میں ہائے ہوّز کی تخفیف کردی گئی ہے۔ جیسے

پنکڑیوں (۱۰۵) بجائے پنکھڑیوں۔

سانج (۱۲۰، ۱۳۳) بجائے سانجھ۔

مُج (۱۳۳) بجائے مجھ۔

تُج (۱۳۳) بجائے تجھ۔

سات (۱۳۳) بجائے ساتھ۔

گوا (۱۳۸) بجائے گواہ۔

بعض ایسے لفظوں میں ہائے ہوّز موجود ہے۔ جن میں جدید اُردو نے تخفیف کردیا ہے۔ مثلاً

تڑپھتا (۹۱) بجائے تڑپتا

جھوٹھا (۱۵۵) بجائے جھوٹا

بھوکھا (۷۶) بجائے بھوکا

کلھہ (۱۷۹) بجائے کل

جیبھہ (۱۱۸) بجائے جیب

مصوّتے کو طویل یا تخفیف کرنا

ایسا عام طور پر شعری ضرورت کی وجہ سے کیا گیا ہے۔
لفظ کے آخر میں طویل مصوّتہ ہے تو اُسے تخفیف کر کے تلفّظ کیا گیا ہے۔ مثلاً

دولہہ (۱۰۴) بجاے دولہا۔
درگہ (۹۹) بجاے درگاہ
کوتہ (۱۰۵) بجاے کوتاہ

اگرچہ ایسی مثالیں بہت کم ہیں۔
بعض الفاظ کے پہلے رکن تہجّی کے مصوّتے کو کھینچ کر تلفّظ کیا ہے۔ مثلاً

جاگہہ (۳۷) بجاے جگہ۔ (اس لفظ کو جگہ بھی تلفّظ کیا گیا ہے۔)
لاگا (۷۰) بجاے لگا
راکھ (۹۰) بجاے رکھ
پھاٹے (۱۵۰) بجاے پھٹے
ماٹی (۹۳-۱۵۰) بجاے مٹّی
پھاٹا (۱۴۶) بجاے پھٹا
پاتوں (۱۵۸) بجاے پتّوں

ان تمام لفظوں میں صرف جگہہ نثر میں استعمال ہوا ہے۔ باقی تمام نظم ہوئے ہیں۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ مصوّتے کو کھینچ کر تلفّظ کرنے کی خصوصیت برج بھاشا کی ہے۔

مصوّتوں کو انفیانے کا رجحان

فضلی بعض لفظوں کے پہلے رکن تہجّی کے مصوّتے کو انفیا دیتے ہیں۔ مثلاً

بینچنا (۳۸، ۷۹) بجاے بیچنا۔

پونچھ (۴۷) بجائے پوچھ
کونچ (۵۰، ۸۴، ۹۹) بجائے کوچ وغیرہ
دہلی کی کرخنداری بولی میں بھی یہ رجحان موجود ہے۔

افعال

کربل کتھا میں افعال کی کچھ متروک صورتیں ملتی ہیں۔ مثلاً

جیونا (۶۹، ۱۱۱) بجائے جینا۔
جاؤنا (۹۳، ۹۷، ۱۰۹، ۱۵۲) بجائے جانا۔
آؤنا (۱۱۸، ۱۸۸) بجائے آنا۔
ٹکراؤنا (۱۴۶) بجائے ٹکرانا۔
پاؤنا (۱۵، ۱۵۱) بجائے پانا۔
کہانا (۱۱۴، ۱۸۵) بجائے کہلانا۔
ڈہونڈانا (۱۳۲) بجائے ڈھنڈوانا۔
"چھنا" یا چھنالینا (۸۲، ۸۸، ۸۹، ۱۰۲، ۱۶۶، ۱۶۷) بجائے چھیننا یا چھین لینا۔
دکھلانا (۳۳) بجائے دکھانا۔

بعض فارسی اور عربی الفاظ امدادی افعال کے بغیر استعمال کیے ہیں مثلاً

قبولنا (۵۷، ۱۶۱) بجائے قبول کرنا۔
بحثنا (۱۷۷) بجائے بحث کرنا۔

بعض فارسی و عربی الفاظ کے ساتھ جو امدادی افعال استعمال کیے ہیں وہ جدید اردو سے مختلف ہیں۔ مثلاً

نماز کرنا (۱۸۵) بجائے نماز پڑھنا۔

حکم کرنا (۷۹) بجائے حکم دینے

نشان کرنا (۶۷) بجائے نشان لگانا

خبر کہنا (۷۷) بجائے خبر دینا

بہم مارنا (۱۱۲، ۱۲۶) برہم کرنا

برباد دینا (۱۰۷) بجائے برباد کرنا

سرمہ دینا (۳۵) بجائے سرمہ لگانا

دیدار دیکھنا (۶۲-۱۲۰) بجائے دیدار کرنا

دعوت کرنا (۴۳) بجائے دعوت دینا

وعدہ دینا (۴۲) بجائے وعدہ کرنا

اگر "رہنا" بطور امدادی فعل استعمال ہو تو یہ صورت ہوتی ہے۔ "وہ جاتا رہا"۔ "وہ کھاتا رہتا ہے"۔ "وہ کھاتا رہتا تھا" وغیرہ۔ اس طریقے سے فضلی نے "رہنا" کہیں استعمال نہیں کیا۔

"سکنا" امدادی فعل کا استعمال پوری کتاب میں غالباً تین دفعہ سے زیادہ نہیں ہوا۔ اور وہ اس انداز سے۔

اور نہ اوٹھہ سکی (۸۷)

یا رسول اللہ پیش دستی نہ کر سکا (۶۵)

مسلم نے کہا اے ماں تھوڑا پانی دے سکے گی (۷۶)

فعل ماضی

ماضی مطلق، ماضی تمام، ماضی احتمالی اور حال قریب میں متعدی اور لازم افعال کے استعمال میں اکثر و بیشتر کوئی فرق نہیں کیا گیا۔ لازم افعال میں فعل فاعل کے مطابق اور متعدی افعال میں مفعول کے مطابق بدلتا ہے۔ کربل کتھا میں

متعدی فعل بھی لازم کی طرح بدلتا ہے۔مثلاً
ایک ملعون شامی کہا (۱۷۴)
اونٹ پر سوار کیے (۱۷۳)
وہ لوگ آہِ دردناک بھر کہے (۱۷۲)
کھانا حاضر کئی (۸۶)
حضرت فاطمہ فرمائی (۴۳)
بعض افعال کی ایسی صورتیں بن جاتی ہیں جو جدید اُردو میں رائج نہیں ہیں۔مثلاً
(شہربانو) پچاس لونڈی آزاد کئی اور چالیس لونڈیوں کو خطِ آزادی دیئی۔ (۱۶۵)
جواب دیئی کہ یہ وقت ملاقات کا نہیں۔ (۴۶)
اگر فاعل جمع مونث ہو تو فعل بھی جمع ہو جاتا ہے۔ جیسے :
عورتیں گریبان اپنے چاک کیاں ..... بے اختیار زار زار روئیاں۔ (۱۸۰)
بہت عورتیں اور لڑکی ننگے اونٹوں پر سوار آئینی (۱۷۲)
دو کہیاریاں خیموں سے باہر بھاگیاں۔ (۱۴۸)

ماضی احتمالی

کربل کتھا میں جدید اُردو سے مختلف یہ دو صورتیں ملتی ہیں۔
۱۔ نظر میں لاؤ کہ کیا وقت گذرا ہوئے گا۔ (۱۴۱)
۲۔ جس کو میں نے ستایا ہوئے یا آزردہ کیا ہوئے۔ (۴۴)

فعل حال

فعل حال میں "ہے" اور "ہیں" کے ساتھ کہیں کہیں گا، گے، گی کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مثلاً

یہ مجلس ہے گی (۵۰)

مشکل ہے گی (۲۰، ۱۳۰)

کہ ہے گا سند (۵)

اولیں ہیں گے (۷) وغیرہ

حال مطلق

جدید اردو میں فعل کے ساتھ "ہے" "ہیں" "ہو" اور "ہوں" استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً

بدلا اُس کا چاہتا ہوں (۴۴)

ایک تخت ہوا میں جاتا ہے (۴۵)

سرنگے روتے جاتے ہیں (۴۵)

لیکن ایسے جملے بھی ہیں جن میں امدادی فعل کا استعمال نہیں کیا گیا مثلاً

تجھے بھی اوس پاس بھیجتا (۱۱۰)

حاملانِ عرش روتے (۴۷)

امبر مثل ابر بہار زار زار روتے (۵۳)

اگر دو جملے حرف عطف کے ذریعے ملائے گئے ہیں تو کبھی تو دونوں جملوں کے فعل بغیر امدادی فعل کے استعمال کیے گئے ہیں اور کبھی ایک جملہ میں امدادی فعل استعمال کیا گیا ہے اور دوسرے میں نہیں۔ دونوں طرح کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

اے قاسم کیا خیال رکھتا اور کہاں جاتا (۱۰۶)
طاقت تا ز یانے کی نہیں رکھتا اور لا علاج وہ ضرب سہتا (۴۴)
اے پدر بزرگوار یہ کیا فال ہے کہ فرماتے اور دل ہم دردمندوں کا جلاتے (۶۰)

اب دوسری طرح کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

اے فرزند کیوں بھاگتا ہے۔ حسین نے کہا کہ اے نانا میں بھاگتا نہیں بلکہ تمہیں پکڑنے میں گرم کرتا معشوق کہ عاشق سے بھاگتا ہے بلکہ عاشق کوں اپنی محبت میں تیز کرتا (۴۳)

تم جاتے ہو اور مرگ تمھارے پیچھے جاتی (۹۵)

حسن کے گھر بھی آمد و رفت رکھتی ہے اور اوس کی جور و اسما سے بھی ملاقات کرتی (۶۶)

رانڈ ہے یا خصم رکھتی، کہی رانڈ ہوں لیکن خصم چاہتی (۵۷)

ایسا ہی ماضی ناتمام میں بھی کیا گیا ہے۔

حال مطلق میں مرکب افعال کی وہ صورتیں بھی ملتی ہیں جو اب اردو میں متروک ہوگئی ہیں۔ مثلاً

دم تمہاری محبت کا مارے ہے (۸۶)

یہ کیا کرے ہے۔ (۱۶۳)

سپاہِ دشمن دلیری کرے ہے اور قاسم بے اختیار دل دوری پہ دھرے ہے (۱۰۹)

روایت کرے ہے (۱۶۳)

ہونٹوں پہ چھڑی مارے ہے (۱۶۶)

جس طرف دیکھوں ہوں (۱۴۲)

کروں ہوں تجہ آگے فریاد (۱۸۰)

اس میدان میں سیر کرتی پھروں ہوں (۱۳۶)

تم کوں سونپے حق کنے ہم جاتے ہیں گے اپنے گھر (۹۹)

سب کہتے ہیں گے (۱۰۰)

فعل امر

جدید اردو میں فعل امر کی جو صورتیں ہیں وہ کربل کتھا میں بہت کم استعمال ہوئی ہیں۔ عام طور پر فعل کی جو صورت استعمال ہوئی ہے وہ جدید ادبی اُردو میں متروک ہے۔ وہ صورت یہ ہے کہ علامت مصدر گرا کر ی اور و بڑھا دیتے ہیں۔ جیسے:

ایک ضرب سے زیادہ اسے نہ ماریو (۶۱)

مجہ عاصی کو بخشیو (۳۴)

محشور مجھے شہداے کربلا سے کیجیو (۳۴)

"ہوجیو" اردو میں بالکل متروک ہوچکا ہے۔ فضلی نے کئی بار استعمال کیا ہے۔ مثلاً

مت ہوجیو غافل (۱۱۹)

گواہ ہوجیو (۱۰۰)

پس بشارت ہوجیو (۱۷۷)

فعل کی یہ صورت "تم" اور "تو" کے ساتھ استعمال ہوتی ہے۔ لیکن فضلی نے احترامی ضمیر "آپ" کے ساتھ بھی استعمال کی ہے مثلاً

(آپ) نا امید نہ ہوجیے (۱۵۸)

جدید اُردو میں مصدر "فرمانا" صرف احترامی ضمیر کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ لیکن فضلی نے "تو" ضمیر کے ساتھ بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً

(تو) قول کوفیوں پر اعتماد نہ فرمائیو (۸۰)

اگر تیری خدمت میں مجھ سے کچھ تقصیر ہوئی ہو تو معاف فرمائیو (۵۴)

فعلِ مستقبل

جدید اُردو میں مضارع کے بعد گا، گے، گی اضافہ کرنے سے مستقبل بنتا ہے، جیسے کھائے گا۔ آئے گا وغیرہ۔ مصدر ہونا اس قاعدے سے مستثنیٰ ہے۔ "ہونا" سے فعل مستقبل "ہوئے گا" نہیں "ہوگا" بنتا ہے۔ فضلی نے پہلی صورت استعمال کی ہے مثلاً:

دریا خشک ہوئیں گے (۱۲۹)

بے سر ہوئیں گے (۱۰۰)

جماعت آخر ہوی گی (۹۸)

نصیب نہ ہوئے گا (۴۷) وغیرہ

اگر فاعل جمع مونث ہے تو فعل کی یہ صورت ہوگئی ہے۔

پھریں گیاں (۶۲)

زندگی کریں گیاں (۶۲) وغیرہ

کربل کتھا میں اُردو کے ایسے الفاظ کی تعداد اچھی خاصی ہے جن کا استعمال جدید اُردو میں متروک ہے مثلاً:

ابرن (۱۱۳) زیور

اچرج (۱۵۱) حیرت

آدر (۱۴۷) عزّت

اندھیار کرنا (۱۱۷) اندھیرا کرنا
اندھلا (۶۰، ۱۷۷) اندھا
انجھو (۱۱۸) آنسو
انجھوؤں کی مار (۱۲۶) آنسوؤں کی دھار
اماں جائی (۱۵۱) بہن
اماں کے جائے (۷۱، ۹۸، ۱۳۵، ۱۳۸، ۱۴۷، ۱۵۲) بھائی۔
اوکنا (۶۷) قے کرنا
ایک بھوئی پانی (۱۳۱) تھوڑا سا پانی
ایانی (۱۵۲) مذکر ایانا، انجانی
باؤ (۱۱۱) ہوا
بھاکسی (۱۸۰) قید خانہ، اندھا کنواں، بھاڑ
بھال (۶۷) برچھی کا پھل، پیکاں
بتہا (۱۶۹) بیتا
بر (۱۰۸) شوہر، منگیتر
بُرا بیرا (۱۱۴) منحوس قدم
بسرام کرنا (۱۳) آرام کرنا
بھوئیں (۱۲۱، ۱۴۳) زمین
بھونڈ بیری (۱۱۴) منحوس، سبز قدم
بہارنا (۱۲۳) صاف کرنا، جھاڑو دینا
بیرو (۱۸۸) دشمن
بیری (۱۴۲) دشمن

بے ڈھیل (۶، ۷۶) جلد

پٹی کرنا (۱۰۵) بال بنانا

پربیتی (۱۸۷) جو دوسروں پر بیتی ہو

پرچانا (۱۸۶) بہلانا، مانوس کر لینا

پڑھوتیہ (۱۵۷) پڑھنے والا

پلچنا (۵۴، ۶۱، ۱۱۳) چمٹنا، لپٹنا، گلے لگنا

پیرنا (۶۱) خنجر یا تلوار کا آر پار ہونا

تالو گرنا (۱۳۱) پیاس سے بُرا حال ہونا

تپانا (۱۰۸) دکھ دینا، ستانا

جدھاں (۱۸۷) جدھر

جلوہ دینا (۱۰۵) آرسی مصحف

جیو (متعدد بار) جان، زندگی

جیوڑا (۱۵۰) جان

چاؤ (۱۰۵، ۱۰۷، ۱۳۳) پیار، محبت

چتیرا (۱۲۰) تصویر بنانے والا

چلچلانا (۱۳۰) مچلنا

چنگا (۵۲) اچھا، تندرست

چوا (۱۱۸) چشمہ، سوتا

چوانا (۱۳۱) ٹپکانا

چوٹیاں اتارنا (۱۳۳) منت کے بال اتارنا

دوہاگن (۱۰۵) وہ عورت جو پہلے شوہر کے مرنے کے بعد دوسرا نکاح کرے

ڈاک (۶۷، ۷۰) قے، الٹی

ڈپٹنا (۱۱۹) دوڑانا

رسمسی (۱۱۳) جوانی کے رس میں ڈوبا ہوا

رکھ پت (۱۵۱) باعزت طریقے سے

رنڈسالا (۱۴۷) یہ وہ لباس ہے جو بیوہ عدت ختم کرکے پہلا نیا جوڑا پہنتی ہے۔ یہ لباس بیوہ کی ماں یا اُس کا قریب ترین رشتہ دار دیتا ہے۔

روپا (۱۰۸) چاندی

سار (۱۱۹) دُکھ، تکلیف

ست (۱۰۸) سچائی

ستھراؤ (۱۴۹) مقتولوں کا ڈھیر

سٹنا (۸) ترک کرنا، چھوڑنا

سونانی ۱۴۰) (سنانی، سناؤنی) موت کی خبر

سنین (۱۱۱، سونئیں) نیزے کے اوپر کا حصہ

سنگت (۱۳۵، ۱۳۷) صحبت

سنگ (۷) ساتھ

سورنی (۱۵۱) جوان عورت

سہانا (۱۸۷، سوہانا) پسند آنا

سیاپا (۱۵۰) کسی کی موت پر ماتم کرنا، رونا

شہانے (۱۰۴) شادی پر گائے جانے والے گیت

صندل کا چھاپا (۱۲۳) عورتیں منت پوری ہونے پر مسجدوں میں صندل کا چھاپا لگاتی ہیں۔

کاڑھنا (۸۸) نکالنا

کا بلانا جی ہونا (۵۳) طبیعت خراب ہونا

کرن پھول (۱۴۸) کانوں کا ایک زیور

کست (۱۰۸، کوست) ناراضی، گمراہی

کلانی (۱۵۱) تکلیف

کلکلانا (۱۶۲) چڑچڑانا

کلول ٹلنا (۹۸) مصیبت دور ہوتا

کنڈ سوکھ جانا (۱۳۱) شدید پیاس سے بُرا حال ہونا

کنے (۸۰، ۱۳۸، ۱۸، ۱۸۵، ۱۸۶) پاس، نزدیک

کوتل (۱۱۱) وہ گھوڑا جو امیروں کی سواری کے ساتھ بغیر سوار کے آگے آگے چلتا تھا۔

گھالنا (۱۴۷، ۱۶۹) برباد کرنا، تباہ کرنا

گھڑوی (۱۳۳) گھڑی ہوئی

گوجری (۱۴۸) پیروں کا ایک زیور

گہک (۱۵۲) تیزی

گھنیرا (۱۲۰) بہت زیادہ

لال (۱۵۷) گونگا

لالن (۱۶۹) محبوب

لتّا (۱۵۰) کپڑا، جدید اُردو میں "کپڑا لتّا" استعمال ہوتا ہے۔

لوتھ (۵) لاش

لون لگانا (۱۲۷) نمک چھڑکنا

لہنا (۳۱) نفع، حاصل

مارسلانا (۸۶) جان سے مار ڈالنا

مچھاتی (۱۱۲، ۱۱۴، ۱۵۰) جوانی سے بھری ہوئی

من ہرن (۱۵۷) محبوب

من موہن (۱۳۷) محبوب

مونڈاسا (۱۵۰) پگڑی، سر

موسنا (۱۳۷) اُجاڑنا

موندنا (متعدد بار) بند کرنا

نال (۵) ساتھ

نپٹ (۱۲، ۱۹۰) بالکل، سرتاسر

نت (۸، ۱۷، ۲۷) ہمیشہ

نجھانا (متعدد بار) دیکھنا، مشاہدہ کرنا، غور کرنا

ندان (۱۲۸) بعد میں، پیچھے، آخرکار

نراس (۱۱۸) ناامید

نمن (۶۱ وغیرہ) مثل، طرح

نیر (۴) آنسو

ورہونا (۶۹) غالب ہونا، فائق ہونا

وسواس (۴) بھروسہ

ہتھوانسے کرنا (۱۱۰) ہاتھ میں لینا[1]

---

[1] جامع اللغات نے ہتھوانسے کا مطلب لکھا ہے قبضے سے پکڑنا، تلوار ہاتھ میں لینا۔ کاشفی نے اس مقام پر "بردہ دست گرفتہ" استعمال کیا ہے

ہنپٹانا (۱۸۶) کسی کام کے لیے مضطرب ہونا

ہرنا (۱۳۱) کاٹھی کا اگلا حصّہ

ہلجان (۱۰۵) شادی کے بعد عورتیں ہر ایک سے پیسے لے کر پوری وغیرہ پکاتی ہیں۔ جامع اللغات ۴ ؛ ۵۶۲) عورتیں میدے کی روٹی اور قیمہ میتھی میں پکا ہوا بھوتنے ہوئے پانوں پر رکھ کر رتجگے کے بعد تقسیم کرتی ہیں (نور اللغات ۴ : ۸۶۷)

ہلکم (۸۷) تہلکہ، ہلچل

ہوڑکنا (۱۳۱) بچوں کا ماں، دایہ یا کسی اور کو جس سے وہ مانوس ہو یاد کرنا اور اس سے نہ ملنے کا رنج کرنا

اُردو کے ایسے الفاظ جن کے مفہوم میں تبدیلی ہو گئی ہے۔

دونو آنچل چیرے کے (۱۰۷) جدید اُردو میں صرف دوپٹے کے سروں کو آنچل کہا جاتا ہے۔

بت (۱۸۵) عمر، سن

توڑانا (۸۰، ۱۵۲، ۱۸۶) کسی کو کسی سے چھڑانا

توڑنا نام و ننگ (۱۰۹) بے عزّت کرنا

تہلکہ (۱۳۹) موت، بربادی

تیور (۱۶۵) بصارت، روشن چشم

دہسنا خیمہ میں (۱۴۸) خیمے میں داخل ہونا

رنڈی (۶۷) عورت

کاری پیاس (۱۲۵) جدید اردو میں "کاری" پیاس کی صفت کے طور پر استعمال نہیں ہوتا۔

اُردو کے وہ الفاظ جن کا جدید اُردو میں تلفظ بدل گیا ہے۔

اندہلا (۶۷، ۱۱۷) اندھا

اوڑھنا (۴۸) اوڑھنی، دوپٹہ

ایک زری (۱۳۲) ایک ذرا

ایکلے (۱۴۱) اکیلے[۱]

اینچنا (متعدد بار) کھینچنا[۲]

بپت (۱۲۱، ۱۵۰) دُکھ، تکلیف

بہینا (۹۹) بہن

بُنگھوڑ (۱۳۳) بنگھوڑا

بوڑہی (۳۰) بُڑھیا

پیاسوں مرنا (۱۰۸، ۱۱۸) پیاسے مرنا[۳]

تباہی کرنا (۹۹) تباہ کرنا

تل اوپر (۱۰۲) اوپر تلے

ٹھکٹھکانا (۱۶۵) کھٹکھٹانا

جیوتے جی (۵۳) جیتے جی

دودہا (۱۳۳) دودھ

سراٹا (۱۲۶) سَراٹا

کھوکھرا (۱۸۰) کھوکھلا

---

[۱] [۲]۔ یہ دونوں لفظ آج بھی دلی کی کرخنداری بولی میں مستعمل ہیں۔

[۳] جدید اُردو میں بھوکوں مرنا محاورہ ہے لیکن پیاسوں مرنا نہیں۔

گردن ڈھونکنا]
گردن ڈھولنا] (۱۳۰، ۱۳۱) گردن ڈھلکنا

گھٹنیاں چلنا (۱۳۳) گھٹنیوں چلنا

مچھی (۷۰) مچھلی

من مانتے (۹۰) من مانے

ناہ (۸۸) نہیں

عربی و فارسی الفاظ کے تلفظ میں تصرّف۔

انباری (۱۶۸) بجائے عمّاری

جامہ دانی (۱۰۶) بجائے جامہ دان

جم (۱۱۳) بجائے یم

حوال (۵۰) بجائے احوال

ملالہ (۱۶۶) بجائے ملال یا ملیلہ

درخشانی (۱) بجائے درخشاں

روحانی (۱۵۳) بجائے روح

سالی گرہ (۱۳۳) بجائے سالگرہ

مقرّری (۱۲۱) بجائے مقرّر

ہمیش (۵۱ - ۵۸) بجائے ہمیشہ

کربل کتھا میں بعض فارسی اور عربی الفاظ کی املا جدید اُردو سے مختلف ملتی ہے۔

استطلاحات (۳۲) بجائے اصطلاحات

آبِ فراط (۱۱۸) بجائے آبِ فرات

تصدیعہ (۱۳۶) بجائے تصدیع

تنگہ (۷۵) بجائے تنگ

توباہ (۱۰۰) بجائے توبہ

خدیجۃ اکبرا (۴) بجائے خدیجۃ الکبریٰ

خواوند (۲۰ وغیرہ) بجائے خاوند

خوار (۱۰۹) بجائے خار

دعوا (۱۷، ۱۰۷) بجائے دعویٰ

دسترخان (۱۸۱) بجائے دسترخوان

سلیقہ (۵۷ - ۵۹) بجائے سلیطہ

طوبا (۲۰) بجائے طوبیٰ

عمّوں (۱۵۳) بجائے عمّو

کتاب خانی (۲۸) بجائے کتاب خوانی

کلثم (۷۱) بجائے کلثوم

کے (متعدد بار) بجائے کہ

معن (۲۹) بجائے معاً

منا (۴۸) بجائے منیٰ

نہایہ (۳۶) بجائے نہایت

فارسی وعربی کے الفاظِ غریبہ

آب اور آش (۹۷) آب آش (۱۵۱)	کھانے کی پکّی ہوئی چیزیں

اتم (۵۰) کامل، تمام تر۔ اُردو میں یہ فارسی ترکیب میں تو استعمال ہوتا ہے علیحدہ نہیں۔ فضلی نے لکھا ہے "خواب و آرام کو تج رونے میں سکھ بوجھی اتم"

اَکم (۲۹) اونچا، بلند۔

آئین بندی (۱۷۱، ۱۷۲)
آئینہ بندی (۱۶۴) | سلاطین کے شہر میں داخل ہونے سے پہلے جو گلی کوچوں کی زیب و آرائش کی جائے۔

اُسرا (۸) اسیر کی جمع، قیدی

بانگی (۱۸۵) موذن

برات (۶) تحریری حکم، شاہی فرمان

بجد (۰) مُصر

بند (۱۵۰) قید

بندی خانہ (۶۱، ۸۵، ۸۰) قید خانہ

بے پر (۱۶۲) بے، عاجز، لاچار

پدر مردہ (۱۳۰) وہ لڑکا یا لڑکی جس کا باپ مر گیا ہو۔

پردگیانِ عصمت (۴۰) پاک دامن پردہ نشین خواتین

پیادۂ بندی خانہ (۸۵) شاہی ہرکارہ، کوتوال یا حاکم کا نوکر، یہاں محافظِ قید خانہ کے مفہوم میں آیا ہے۔

تنگ (۱۰۰) زین کسنے کا تسمہ

تنگہ (۵، تنگ) فوج کا دستہ

تتق (۱۲۹) پردہ، نقاب

جنگی (۷۴) سپاہی، بہادر

جامہ دانی (۱۰۶) صندوق

جامۂ خز (۱۶۲) ریشمی لباس

چوگرد (۴۹) چاروں طرف

چوطرف (۱۰۲) چاروں طرف

حلالہ (۱۶۶) حلال سے مراد منکوحہ بیوی ہے۔ فضلی نے حلال کو حلالہ کر دیا ہے۔ عربی میں حلیلہ بمعنی منکوحہ بیوی ہے۔

خطور (۳۶) دماغ میں خیال آنا

خرف ہونا (۱۵۴) کمزور، نہایت ضعیف، معمر ہونا

خدمت گاری (۱۶۵) جدید اردو میں اس مقام پر "خدمت" استعمال کرتے ہیں۔

خوزادے (۴۸، ۱۶۴) خواجہ زادے

درخت (۲۵) بڑا درخت

دغدغے (۱۵۰) خوف، اندیشے

دینارِ سرخ (۶۶) سونے کا سکّہ

رہی (۲۸) غلام، بندہ

زندان بان (۸۶) محافظ قید خانہ

زور آوری (۱۶۶، ۱۶۷) زبردستی، جبریہ

زیبون (۱۳۳) اوڑھنے کا کپڑا

سگِ مست (۸۷) پاگل کتّا

سلیطہ (۵۷، ۵۹) زبان دراز عورت

سمند کرنا (۹۸) گھوڑا تیز کرنا

شیرخوارہ (۱۳۰) دودھ پیتا بچّہ

شہانے (۱۰۴) خوشی کے گیت، شادی کے موقع کے گیت

عصابہ (۴۳) زخم باندھنے کی پٹی، سر پہ لپیٹنے یا اوڑھنے کی کوئی چیز

غلّ وزنجیر (۱۵۶) طوق وزنجیر

غم وعنا (۱۶) غم و رنج

غبرا (۱۶) زمین

فرنگ (۱۷۸) اٹلی، فرانس یا یورپ کا رہنے والا، عیسائی

فرنگی (۱۷۹) فرنگ کے مفہوم

فند (۶۶) مکروفریب

قلبہ (۱۱۸) کھیتوں میں پانی دینے کے لیے جو نالی بنائی جاتی ہے

کد بانو (۲۲) شادی شدہ عورت، مالکہ

کر (۱۹۰) بہرا

کشندہ (۱۸۲) قاتل

گزی (۱۵۰، ۱۶۲) سوتی کپڑے کی ایک معمولی قسم، اُردو میں گاڑھا گزی استعمال ہوتا ہے۔

معجر (۶۲) اوڑھنی، عورتوں کا سر پہ اوڑھنے کا کپڑا

موکّل (۱۱۸) محافظ

موالی (۹۹، ۱۴۱) دوست، ملازم، ساتھی

مندیل (۶۳، ۱۶۳) پگڑی

نمازِ پیشیں (۸۵، ۱۴۴) نمازِ ظہر

نداکرنا (۴۳) لوگوں کو جمع کرنے کے لیے پکارنا

ہامون (۱۰۷) جنگل، صحرا

ہوا دار (۹۱، ۱۰۷) خیر خواہ، دوست، عاشق

والانہ (متعدد بار) ورنہ

وصی (۲، ۱۳۶) وہ شخص جس کو وصیت کی گئی ہو

ایک دفعہ (۶۰) اچانک، فارسی میں یک مرتبہ استعمال ہوتا ہے۔

فارسی و عربی کے وہ الفاظ جن کے اصل زبان میں دو مفہوم ہیں اور کربل کتھا میں اُس مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں جو جدید اردو میں رائج نہیں۔

البتہ (۱۸۳۔ یقیناً، ضرور، بے شک) جدید اردو، مگر، لیکن۔

آوارہ (۱۳، ۱۴۸۔ سرگرداں، پریشان، مارا مارا پھرنے والا) جدید اردو، بدکار، بدچلن، اوباش۔

اثر (۵۰۔ نشان، کھوج) جدید اُردو، تاثیر، کیفیت، نتیجہ وغیرہ۔

بانگ (۱۸۴، ۱۸۵۔ اذان) جدید اُردو، آواز، صدا، مرغ کی بانگ۔

بے پناہ (۳۳۔ بے آسرا) جدید اُردو، جس سے پناہ نہ مل سکے۔

پناہ (۴۷۔ سہارا، حامی) جدید اُردو، بچاؤ، حفاظت کی جگہ۔

پیادہ چلنا (۵۔ پیدل چلنا) جدید اُردو میں پیادہ سوار کے مقابل کو کہتے ہیں اور پیادہ چلنا کی بجائے پیدل چلنا کہتے ہیں۔

پیدا ہونا (۱۴۹۔ ظاہر، آشکار) جدید اُردو، دستیاب ہونا، عالمِ وجود میں آنا، حاصل کرنا وغیرہ

تاکہ (متعدد بار۔ تا آنکہ) جدید اُردو میں اس مفہوم کے لیے "یہاں تک" استعمال کرتے ہیں۔

تردد (۴۷۔ کوشش کرنا، اِدھر اُدھر پھرنا) جدید اُردو، سوچ، فکر، تشویش، تذبذب۔

حرم (۹۷ - شرفا کے گھر کی خواتین) جدید اُردو، لونڈی، باندی۔

خلاص ہونا (۸، ۶۱، ۶۹ - آزاد ہونا) جدید اُردو میں میری خلاصی ہوئی کا مطلب ہے میری نجات ہوئی۔ مجھے چھٹکارا ملا۔

خراب ہونا (۸۶ - سرگرداں ہونا، پریشان ہونا) جدید اُردو، تباہ ہونا، برباد ہونا، ناقابل استعمال ہونا۔

خصم (۵۰ - دشمن، بدخواہ) جدید اُردو (خَصَم) شوہر

دامادی (۱۰۶ - شادی، کتخدائی) جدید اُردو میں "ی" یائے مصدری ہے۔

رخصت (۴۴ - اجازت) جدید اُردو، روانہ ہونا، روانگی، وداع، جانا وغیرہ۔

زبوں (۱۳ - کمزور، لاغر) جدید اُردو، خراب، تباہ۔

سزا (۳۷ - عوض، بدلا، جزا) جدید اُردو میں بُرائی کے بدلے کے لیے مستعمل ہے، عقوبت۔

سیاست (۱۱۱ - قہر و غضب، سختی، خوف، جسمانی یا روحانی تکلیف) جدید اُردو میں ملکی معاملات یا انتظام کے معنی میں مستعمل ہے۔

ضعف کیا (۶۸ - بیہوش ہوا) جدید اردو، ضعف کمزوری کے معنی میں۔

ضم ہونا (۵۶ - اکٹھا ہونا) جدید اُردو، شامل ہونا، ملنا۔

عمدہ (۱۰۹ - سردار، اعلیٰ افسر) جدید اُردو، پسندیدہ، منتخب، اعلیٰ درجے کا وغیرہ۔

فرزند (۴۷ - بیٹی، بیٹا) جدید اُردو، بیٹا۔

کینہ (۵۷ - بدلہ) جدید اُردو، بغض، عداوت۔

مبالغہ (۴۴، ۷۶، ۱۰۵ - زور دینا، اصرار کرنا) جدید اُردو، خلافِ واقعہ

بُرائی یا تعریف کرنا، بڑھا کر بیان کرنا۔

مجموعہ (۵۹۔ سب، کل) جدید اُردو، اکٹھا کیا ہوا، کلیات، ذخیرہ وغیرہ۔

محاسن (۵۸، ۸۷۔ داڑھی) جدید اردو، خوبیاں، نیکیاں۔

محکم ہونا: فضلی نے لکھا ہے دروازہ محکم موندیں (۷۵) مَردوں کو محکم باندھیو (۱۴۰) جدید اُردو میں یہ لفظ غیر مرئی چیزوں کی صفت کے طور پر آتا ہے۔ مثلاً محکم ارادہ، محکم وعدہ وغیرہ۔

محنت (۳۴، ۷۶۔ تکلیف، پریشانی، آزمائش وغیرہ) جدید اُردو مشقت، کوشش وغیرہ۔

مصلحت کرنا (۱۵۷۔ مشورہ کرنا) جدید اُردو، خوبی۔ بہتری وغیرہ۔

معیوب (۳۳۔ فضلی نے یہ لفظ اسم کے طور پر استعمال کیا ہے، پردہ پوشی مجھ معیوب کا توں ہے) جدید اُردو میں صفت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

مغرور ہونا (۷۹۔ دھوکا کھانا) جدید اُردو متکبّر ہونا، گھمنڈی ہونا۔

مکان (۸۶۔ جگہ) جدید اُردو گھر۔

مگر (۷۳۔ شاید) جدید اُردو لیکن، حرف استدراک۔

ملازمت (۷۴۔ ملاقات) جدید اُردو نوکری۔

مہمانی (۱۴۶۔ سامانِ ضیافت) جدید اُردو مہمان داری، مہمان نوازی وغیرہ

ناموس (۹۷۔ حرم، اہل خانہ) جدید اردو لاج، شرم وغیرہ۔

واقعہ (۲۹۔ خواب، ۶۱۔ حادثہ، مصیبت: فضلی نے دونوں مفہوم میں استعمال کیا ہے۔) جدید اردو سرگزشت، حال، ماجرا وغیرہ۔

یتیم (۵۴۔ فضلی نے یتیمانِ زہرا فاطمہ استعمال کیا ہے۔) جدید اُردو وہ

بچہ جس کا باپ مرگیا ہو۔

کربل کتھا میں فارسی محاوروں، فعلوں اور ترکیبوں کا بکثرت اُردو ترجمہ کیا گیا ہے۔ ان میں ایسے بھی تراجم ہیں جو اُردو میں رائج نہیں ہو سکے مثلاً:

محبت میں تیز کرنا (۴۳) در طلب تیز کردن۔

دوست رکھنا (۴۳) دوست داشتن۔

پاؤں زمیں پر اینچنا (۴۳) پا در زمین کشیدن۔

معلوم کرو کہ اجل میری نزدیک پہنچی ہے (۴۳) بدانید کہ اجلِ من نزدیک رسیدہ است۔

برائیوں سے امان میں رکھنا (۴۳) از بدیہا باز داشتن۔

گھر سے دھواں اٹھانا (۴۶) دودِ مرگ از دودماں برآمدن۔

دم گنتی میں پڑنا (۵۲) نفس بہ شمار افتادن۔

کار تمہارا کہاں تک پہنچے گا (۵۲-۵۳) کار شما بہ کجا خواہد رسید۔

پاؤں زیارت سے اینچنا (۵۳) پاے از زیارت باز گرفتن۔

دیگ جاہلیت جوش میں آنا (۵۸) دیگِ حمیتِ جاہلیت بجوش آمدن۔

تنگ بغل میں لینا (۷۱) تنگ در بر گرفتن۔

باغ وصال سے میوۂ مراد چننا (۷۴) از بوستانِ وصل میوۂ لقا چنیدن۔

ورطۂ بلا میں ڈالنا (۷۶) در ورطۂ بلا گذاشتن۔

حق مرکز پر بیٹھنا (۷۹) حق بہ مستحق رسیدن۔

محبت کا دم مارنا (۸۶) لافِ محبت زدن۔

سر تلے کرنا (۸۷) سر در پیش انداختن۔

لرزہ بدن پر پڑنا (۱۱۱) لرزہ بر اعضا افتادن۔

لشکر پہ نعرہ مارنا (۱۰۲) با[illegible] زدن۔
سر زانوئے غم والم میں رکھ رونا (۱۰۵) سر بہ زانوئے اندوہ نہادن۔
ہاتھ کام سے رہنا (۱۲۱) دست از کار فرو ماندن۔
کمر کو محکم باندھنا ([illegible]) میانہا استوار بندیدن۔
خون ڈالنا (۱۴۳) خون ر[illegible]
چرخ مارنا (رقص کرنا) (۱۸۷) چرخ زدن۔
آرام نہ پکڑنا (۵۲) نیاسودن۔
تکیہ دینا (۵۳) تکیہ زدن۔
گوش کرنا (۵۳) گوش کردن۔
شمشیر اینچنا (۶۰) شمشیر کشیدن۔
نماز کرنا (۶۰) نماز گذاردن۔
آزار اینچنا (۶۵) آزار کشیدن۔
بیعت دینا (۷۴) بیعت کردند۔
پناہ لانا (۷۷، ۸۶) پناہ آوردن۔
فریاد کو پہنچنا (۹۶) بہ فریاد رسیدن۔
زخم چلانا (۱۰۴) زخم زدن۔
برباد دینا (۱۰۷) برباد کردن۔
مبارز بولانا (۱۰۹) مبارز طلبیدن۔
تیرباران کرنا (۱۱۲) تیرباران کردن۔
اقرار رکھنا (یقین رکھنا) (۱۳۸) اقرار داشتن۔
بات دراز کرنا (۱۳۹) قصہ دراز کردن۔

لذتوں کا توڑنے والا (۴۶) شکستۂ لذات۔

آرزوؤں کا کاٹنے والا (۴۶) قطع کنندۂ آرزوہا۔

دشمن ہنسائی (۹۶) شماتتِ اعدا۔

آرامِ سینہ (۹۹) سرورِ سینہ۔

فضلی نے اُردو اور فارسی الفاظ ملاکر بھی ترکیبیں بنائی ہیں۔

دکھ کشیدہ (۳)

بحرِ دکھ (۵)

محبان یک تن و یک من (۷)

صاحب بعید سید البشر (۲۰)

کام کرام (۲۸)

کام با نظام (۲۹)

آنکھیں مبارک (۳۶)

دہارِ اشک (۴۰)

غم و دکھ (۵۴)

صحنِ گھر (۵۹)

لگاوانِ بے شمار (۷۸)

مانند کھیل (۷۸)

نالہائے دکھ (۱۰۷)

بھالِ نیزہ (۱۱۲)

دریائے لڑائی (۱۱۲)

مانند مچھلی بن پانی (۱۱۲)

ارادۂ لڑائی (۱۱۷)

دشمن ہنسائی (۹۶، ۱۱۴، ۱۲۹)

اونٹانِ بے پالان (۱۴۹)

عقل و سدھ (۱۵۲)

کپڑۂ حریر (۱۹۵)

ازبک اور اردو زبانوں میں مشترک الفاظ

جناب خال مرزا الف تاش مرزا ماسکو یونی ورسٹی

تاریخی پس منظر: ہندستان اور وسط ایشیا کے قدیم تعلقات

وسط ایشیا اور ہندستان کے باشندوں کے تعلقات بہت پرانے ہیں۔ قدیم یونانی عالم سترابون (STRABON) نے سکندر کے رفیق ارستوبل (ARISTO BUL) کے حوالے سے لکھا تھا' ہندستانی مال آمو دریا کے راستے سے بحیرۂ کیسپین تک اور وہاں سے بحیرۂ اسود (BLACK SEA) تک لے جایا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ وسط ایشیائی دریا سے مال لے جانے والے ہندستانی تاجر اس آمو دریا کے ساحل پر رہنے والوں کے ساتھ بھی تجارت کرتے ہوں گے۔ سکندر کا ہندستان پر حملہ ۴ ویں صدی ق.م میں ہوا تھا اور سترابون کا بیان اس بات کا ثبوت ہے کہ دونوں خطوں کے تعلقات کم از کم چوتھی صدی قبل مسیح سے ضرور رہے ہیں۔ ۱۰۲۶ء میں محمود غزنوی نے پنجاب پر قبضہ کرلیا اور ۱۱۹۳ء میں محمد غوری کا سپہ سالار قطب الدین ایبک دلی آگیا اور ۱۳ سال بعد یہاں کا بادشاہ بن گیا۔

۱۳ ویں صدی سے ہندستان میں دلی، بہار، قنوج، گوالیار، اجین میں سلمانوں کی حکومت قائم ہوئی۔ تاریخ میں انھیں SLAVE KINGS کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یہ سلمان وسط ایشیا کے رہنے والے تھے جو وہاں سے اپنی تہذیب و تمدن بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان کے بارے میں ہندستانی پروفیسر ح۔ بجری اپنی کتاب Persian in fluence on hindi میں لکھتے ہیں:

SLAVE KING'S WERE OF PURE TURKISH BLOOD THE KHILJE'S WERE ALSO TURKISH WHO HAD BECOME AFGAN IN CHARACTRE.

اور Slave Kings کی سلطنت ۳۵۰ سال تک رہی یعنی اُس وقت تک جب بابر نے ہندستان میں قدم رکھا۔

اس وقت وسط ایشیا سے اور اس کے ذریعے روس سے ہندستان کے تجارتی تعلقات قائم تھے۔ اسپینین کلاویو (KLAVIO) نے ۱۴۰۳ء میں سمرقند کا سفر کرنے کے بعد لکھا تھا کہ سمرقند میں مختلف اقسام کے مال کثرت سے ہیں جو دوسرے ملکوں سے لائے جاتے ہیں۔ ہندستان سے دارچینی، لونگ (قرنفل)، ادرک جیسے مسالے آتے ہیں۔ ہندستان میں اُس زمانے میں وسط ایشیائی تاجر جا بجا دکھائی دیتے تھے۔ وہ خشک میوے، تازہ پھل، گھوڑے رنگین کپڑے بیچا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض لوگ وہاں بس بھی جاتے تھے یہاں تک کہ دکن میں بھی وسط ایشیا سے آئے ہوئے لوگ رہا کرتے تھے۔ مثلاً قلی قطب شاہ اور اس کے ساتھی بخارا، سمرقند اور فرغانہ کے رہنے والے تھے۔[1]

---

[1] حیدرآباد میں آج کل بھی ایسے لوگ ملتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ان کے آباواجداد ترکستان کے رہنے والے تھے۔

۱۵۲۶ء میں فرغانہ کا سابق بادشاہ بابر افغانستان سے شمالی ہندستان میں داخل ہوا اور وہاں ایک بڑی مغلیہ سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ مغلیہ سلطنت نے وسط ایشیا کے ہندستان سے ثقافتی، تجارتی اور سفارتی تعلقات کو جو پہلے قائم تھے، نہ صرف اور زیادہ مستحکم کیا بلکہ تاریخ میں ایک نیا باب کھولا۔ اکبر، شاہ جہاں، اورنگ زیب اپنے اپنے ایلچی بخارا سلطنت کے بادشاہوں کے درباروں میں بھیجتے تھے اور ان کے ذریعے اپنی 'دائمی دوستانہ خواہشات' کا اظہار کرتے تھے۔ اپنی طرف سے بخارا سلطنت کے بادشاہ بھی اپنے نمائندوں کو مغلوں کے پاس بھیجا کرتے تھے۔ یہ رشتہ نہایت فائدہ مند رہا۔ شمالی ہندستان اور وسط ایشیا کے باشندے ایک دوسرے کے تمدن، رہن سہن سے متاثر ہوئے۔ یہ تو ہمیشہ دو پڑوسی ممالک کے درمیان ہوتا رہا ہے لیکن وسط ایشیا کے باشندوں نے شمالی ہندستان کے رہنے والوں پر جو اثر چھوڑا ہے اس کی ایک نوعیت اور بھی ہے جو شاذ ہی دوسرے پڑوسی ملکوں کے تعلقات میں ملتی ہو۔ اور وہ یہ ہے کہ مغل بادشاہ خود وسط ایشیا کے رہنے والے تھے اس لیے بابر اور اس کے ساتھیوں نے ہندستان میں نہ صرف نئی سلطنت قائم کی بلکہ ایک نیا تمدن، نئے رسم و رواج وغیرہ بھی اپنے ساتھ لائے۔ (ہم نے پہلے ذکر کیا تھا کہ خلجی سلطنت کے بانی بھی وسط ایشیا کے رہنے والے تھے) اور شمالی ہندستان کے باشندے ۱۳ ویں صدی سے وسط ایشیا سے آئے ہوئے لوگوں کے رقص، موسیقی، فن تعمیر، لباس، رواج، زبانوں سے متاثر ہونے لگے۔ اس کا مطلب ہے کہ وسط ایشیا کا اثر ہندستانیوں پر دو طرف سے ہو رہا تھا۔ ایک تو خارجی طور پر وسط ایشیائی حکومتوں سے گہرے تعلقات کے نتیجے میں اور ایک اندرونی طور پر یعنی مغلیہ سلطنت میں رہنے والے ترک اور دوسرے وسط ایشیائی تارک الوطنوں سے میل جول کے نتیجے میں۔ اور یہ اندرونی اثر بیرونی اثر کی نسبت

کئی گنا زیادہ تھا۔ یہاں ہمارا مقصد صرف اس بات کا مطالعہ کرنا ہے کہ ہندستان میں آکر بسنے والے مسلمانوں کی زبانوں نے اُردو زبان کے لغات پر کیا اثر ڈالا ہے اور اس کے نتیجے میں اُردو اور ازبک زبانوں میں کیا کیا مشترک الفاظ ملتے ہیں۔

بابر کے زمانے میں وسطِ ایشیا کے علوم کی زبان عربی بھی جاتی تھی، دربار کی زبان فارسی تھی جس میں شعر و شاعری ہوتی تھی اور سارا سرکاری کام بھی ہوتا تھا۔ اور کئی بادشاہوں مثلاً بابر کے گھر کی زبان ترکی[1] تھی۔ بابر اور اس کے رفقا[2] فرغانہ کے باشندے ہوتے ہوئے بھی اپنی مادری زبان اچھی طرح جانتے اور بولتے تھے۔ یہی خیال ڈاکٹر محمد عبدالحق کا بھی ہے۔ آپ کا کہنا ہے "وہ، جن کو ہم مغل کہتے ہیں اصل میں ترک تھے۔ مغلیہ بادشاہ اور بڑے بڑے عہدہ دار فارسی کے علاوہ ترکی بھی جانتے اور بولتے تھے"۔

اُردو کی پیدائش کب، کہاں، اور کس بولی سے ہوئی، ان سوالوں کے مختلف جواب ہیں۔ مثلاً میر امن، انشاء اللہ خاں، T. R. HOERNLE، ر۔ چ۔ شکلا وغیرہ کا خیال ہے کہ اُردو زبان کی پیدائش دلّی کے گرد و نواح ۱۲-۱۱ ویں صدیوں میں ہوئی۔ پروفیسر شیرانی، T. T. BAILEY، س۔ ک۔ چیٹرجی کہتے ہیں کہ اُردو کا جنم پنجاب میں اور لاہور کے آس پاس ہوا۔ کئی کہتے ہیں کہ اُردو برج بھاشا سے نکلی۔ دوسرے کہتے ہیں کہ کھڑی بولی سے اور کئی علما (SCHOLARS) کا خیال ہے کہ اُردو ہریانی کی بنیاد پر وجود میں آئی۔ یہ سوالات اس وقت ہمارا

---

[1] ترکی زبان کو ہم موجودہ ازبک زبان کی پرانی شکل سمجھتے ہیں جس کو چغتائی بھی کہتے تھے۔

[2] بابر کو ازبکستان کے لوگ ایک بہت مشہور ازبک شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اس کی چغتائی میں غزلوں کو نہ صرف ازبکوں میں مقبولیت ملی بلکہ سوویت یونین کی زبانوں میں ان کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

موضوع نہیں ہیں ۔ اُردو کی پیدائش کسی بھی بولی سے کیوں نہ ہوئی ہو لیکن اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہندستانیوں اور وسط ایشیا کے لوگوں کے میل ملاپ کی بدولت ہندستان کی علاقائی زبانوں پر وسط ایشیائی زبانوں کا اثر گیارہویں صدی سے ہونا شروع ہوا۔ ہاں وسط ایشیا والوں نے ہندستان میں کسی نئی زبان کو جنم نہیں دیا۔ گو کہ اُردو زبان کی نشوونما میں ان کی بڑی اہمیت رہی۔ فارسی اور ترکی زبانوں کی خوبیوں کو اُردو نے جذب کر لیا۔ بول چال کی زبان میں عام فہم 'آسان' ہلکے الفاظ' بھاری اور مرکب لفظوں کی جگہ استعمال ہونے لگے۔ اس سے اُردو زبان میں وسعت اور جان پیدا ہوئی لیکن یہ زبان پھر بھی ہندستان کی تھی کیونکہ اس کا قواعد ہندستانی رہا۔ آہستہ آہستہ یہ دخیل الفاظ اپنے بیرونی لباس کھو کر ایک زبان کے الفاظ کی حیثیت سے استعمال ہونے لگے۔ لفظ اس وقت تک بیرونی سمجھا جاتا ہے جب تک وہ کسی زبان میں آ کر گھل مل نہ گیا ہو۔ مثال کے طور پر ایک اَن پڑھ کسان 'بس' دفتر' سگریٹ' جیسے الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے یہ نہیں سوچتا ہے کہ یہ الفاظ اُردو' ہندی کے ہیں یا بیرونی زبانوں سے داخل ہو کر آئے ہیں۔ ان الفاظ کو وہ اس لیے بولتا ہے کیونکہ وہ آسان' صاف اور عام فہم ہیں۔

وہ لوگ حق پر نہیں جو زبان میں رائج دخیل الفاظ کو نکال کر ان کی جگہ بوجھل مصنوعی اور پُرانے الفاظ داخل کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ یاد دلانا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ اس طرح کی کوشش پرانے روس میں بھی کی گئی تھی۔ اس وقت بعض لوگ روسی زبان میں رائج سب فرانسیسی الفاظ نکالنا چاہتے تھے۔ بعد میں اُزبک زبان سے بھی روسی الفاظ نکال کر ان کی جگہ پُرانی ازبک زبان یا عربی کے الفاظ گھسانے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن وہ سب ناکام رہے۔

کیونکہ ہر ایک زبان کا ارتقا اپنے اپنے قانون کے مطابق ہوتا ہے اور اس کے نشو ونما کو ایک مصنوعی راستے میں لے جانے کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔

۲۔ مشترک الفاظ۔ وہ کیسے اور کتنے ہیں؟

عربوں کے وسط ایشیا کے باشندوں پر فتح حاصل کرنے اور اسلام کے پھیلنے کے نتیجے میں عربوں کے تمدن اور ان کی زبان نے مقامی باشندوں کے رہن سہن اور ان کی زبانوں پر کافی اثر ڈالا۔ آہستہ آہستہ عربی الفاظ یہاں کی زبانوں میں استعمال ہونے لگے اور بیک وقت فارسی اور ترکی زبانوں کے لغات نے انھیں قبول کیا۔

ترکی اور فارسی بولنے والے ساتھ ساتھ رہتے تھے اور ان کے بیچ تمدنی اور اقتصادی تعلقات گہرے تھے اور کئی صدیوں سے ایک دوسرے سے متاثر ہوتے آئے تھے۔ یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ترکی زبان میں فارسی کے کافی الفاظ رائج ہو چکے تھے اور اس وقت جب بابر ہندستان جا رہا تھا، ترکی زبان میں عربی اور فارسی کے بہت الفاظ موجود تھے اور بابر کے سپاہی، جو شاید زیادہ تر اس کے ہموطن تھے، اپنے ساتھ ہندستان میں یہ فارسی اور عربی آمیزش والی مادری زبان چغتائی لائے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اُردو میں رائج فارسی کے الفاظ کی کافی تعداد براہ راست فارسی زبان سے نہیں، بلکہ ترکی زبان کے ذریعے آئی۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فارسی الفاظ فارسی زبان سے بھی براہ راست اُردو میں آئے اور اُردو کے فروغ میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ لیکن شاید یہ بات بابر کے ہندستان آنے کے بعد ہوئی۔ اس بات کے لیے ایک علیحدہ تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔ اس وقت مجھے اس موضوع سے بحث نہیں ہے اور

نہ اس مقالے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ اُردو اور ازبک زبانوں میں اتنی تعداد فارسی الفاظ کی، اتنی عربی الفاظ کی اور اتنی تعداد ترکی الفاظ کی ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اُردو اور ازبک زبانوں میں مشترک الفاظ کل کتنے ہیں، ان کی کیا کیا خصوصیات ہیں، ان میں کتنا فرق ہے، ان میں کیا کیا تبدیلیاں آئیں اور ان کا استعمال کیا ہے۔

مشترک الفاظ دو گروپوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ پہلے گروپ میں وہ الفاظ شامل ہیں جو ازبک اور اُردو زبان میں وسط ایشیا اور ہندستان کے کئی صدیوں پرانے تعلقات کے نتیجے میں آئے (ان تعلقات کا ذکر ہم کر چکے ہیں)

دوسرے گروپ میں جو پہلے کی بہ نسبت چھوٹا ہے وہ الفاظ آتے ہیں جو ہمارے عوام کے براہ راست تعلقات کے نتیجے میں نہیں بلکہ دوسرے عوام اور دوسرے ملکوں کے ذریعے آئے۔

اقتصادیات اور فن کی ترقی سے، سماجی زندگی اور حالت میں ہونے والی تبدیلیوں کے نتیجے میں ہمیشہ نئے نئے خیالات، تصورات آتے رہتے ہیں اور ان کے ساتھ ہی ساتھ نئے نئے الفاظ بھی پیدا ہوتے ہیں۔ جن کو آہستہ آہستہ دوسرے عوام بھی نئے خیالات کے ساتھ اپنا لیتے ہیں۔ مثلاً "بولشویک، سوویت، کالخوز، اسپوتنک" جیسے الفاظ نے پہلے روس میں جنم لیا مگر اب دنیا کی مختلف زبانوں میں ملتے ہیں، وہ اُردو اور ازبک میں بھی موجود ہیں۔ اس گروپ کے الفاظ کی تاریخ اتنی پرانی نہیں ہے جتنی پہلے گروپ کی ہے۔ ہندستان میں انگریزوں کے آنے اور یورپ کے ساتھ تعلقات بڑھنے سے اُردو میں مغربی زبانوں کے کافی الفاظ داخل ہو گئے۔ ازبک زبان میں مغربی زبانوں کے الفاظ روسی زبان کے ذریعے آئے۔ کئی الفاظ کے کئی زبانوں کے ذریعے مستعار لینے کی وجہ سے ان کی شکل اتنی بگڑ گئی کہ اُردو اور ازبک زبانوں میں آج کل ہم ان کو مشترک الفاظ

نہیں کہہ سکتے۔ اور کئی ایسے بھی ہیں جو نہیں بدلے اور ان کے تلفظ میں بھی کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ مثلاً ان سب ذیل الفاظ کا تلفظ اُردو اور اُزبک زبانوں میں ایک جیسا ہے۔ آرگینک، کلوگرام، گراموفون، اوپیرا، لفٹ، آرگن (میوزک)، اَٹلس (نقشہ) وغیرہ۔

دوسرے الفاظ میں تھوڑی سی تبدیلی آئی لیکن ازبک کے ان الفاظ میں جیسے AVTOMATIK ‘SPIRT ‘LIMDNAN ‘LIKYOR ‘ ARMIYA ‘LIMON LAMPA میں[۲] ہم آسانی سے اُردو کے آرمی، لکر، لیمونیڈ، اسپرٹ، آٹومیٹک، لیمن، لیمپ الفاظ پہچان سکتے ہیں۔

ہمارے ہاں اُردو اور اُزبک زبانوں کے مشترک الفاظ ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے ہی میں ازبک روسی لغت قابلِ ذکر ہے۔ اس لغت میں جو ازبک لفظ ایک حرف سے شروع ہوتے ہیں اور جو اُردو میں بھی ملتے ہیں ایک ایک کارڈ میں اپنے سارے معنوں کے ساتھ درج کیے گئے ہیں اور اس کے بعد اُردو۔ روسی لغت سے وہی اُردو کے مشترک الفاظ اپنے پورے معنوں کے ساتھ نقل کیے گئے ہیں۔ اس طرح ایک کارڈ میں ایک مشترک لفظ کے اُردو اور اُزبک میں پورے معنی دیکھے جا سکتے ہیں۔ ازبک روسی لغت میں، جو ۷۶۴ صفحوں پر مشتمل ہے، مختلف جگہوں سے ۱۷ حروف سے شروع ہونے والے الفاظ ملتے ہیں یہ اندازاً ۲۱۲ صفحوں پر حاوی ہیں۔ ان میں ۱۳۰۰ مشترک الفاظ ملے ہیں (اور ۸۰ ہمنام الفاظ) اور ان میں تین حروف یعنی Y، H، O سے شروع ہونے والے اور ۲۱ صفحوں پر حاوی الفاظ میں ایک بھی مشترک لفظ نہیں ملا۔[۳]

---

[۱] سہولت کے لیے یہاں اور آگے ازبکی الفاظ رومن لی پی میں لکھے جائیں گے۔ یاد رہے ازبک زبان نے سنہ ۱۹۴۰ء میں روسی خط اپنایا۔

[۲] اُردو میں Y، H آوازیں غیر موجود ہیں۔ 'O' اُردو میں 'یو' کے برابر ہے۔

اس کا مطلب ہے کہ ۱۳۰۰ مشترک الفاظ ۱۷ حروف سے شروع ہونے والے الفاظ میں سے نہیں بلکہ ۱۴ حروف سے شروع ہونے والے الفاظ میں ملے۔ باقی ۱۶ حروف سے شروع ہونے والے الفاظ میں کوئی بھی ایسا نہیں ملا جس میں مشترک الفاظ موجود نہ ہوں۔ اگرچہ ۱۳۰۰ الفاظ ۱۹۱ صفحوں سے ملے اس کا مطلب ہے کہ ہر ایک صفحے میں اوسطاً ۶۳ مشترک لفظ ملے۔ اس حساب سے بقیہ ۴۳۴ صفحوں میں کوئی ۲۷۵۰ مشترک الفاظ ملیں گے۔ یعنی اُردو اور ازبک زبانوں میں مشترک لفظوں کی کل تعداد چار ہزار سے ہرگز کم نہیں ہوگی اس کے علاوہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کئی الفاظ جو روسی۔ اُردو یا ازبک روسی لغت میں درج نہیں ہیں، دونوں زبانوں میں مل جائیں۔ اسی سلسلے میں ایک اور اہم بات یہ ہے کہ دو زبانوں کے نئے الفاظ بنانے کی علامتیں ایک جیسی ہیں۔ لیکن ایسا بھی ہوسکتا ہے اُردو اور ازبک زبانوں میں نئے الفاظ کے لاحقے مختلف ہوں۔ مثلاً لفظ 'داستان' سے ازبکی زبان میں نیا لفظ SUFFIX 'چی' کے ذریعے بنتا ہے 'داستانچی'، اور اُردو میں SUFFIX 'گو' کی مدد سے 'داستان گو'۔ ازبک میں 'درس' سے 'درسخانہ' اور اُردو میں 'درسگاہ'۔ مگر ایک ہندستانی جو SUFFIX 'گو' اور 'چی' کے عمل کو جانتا ہے (جیسے مشعلچی، خزانچی، یا 'دواخانہ' سے خانہ') آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ ازبکی 'درس خانہ' اور 'داستانچی' اُردو کے درس گاہ اور داستان گو ہیں۔ یہی صورت ہوگی اگر کوئی ازبک اُردو کے 'درس گاہ' اور 'داستان گو' کو دیکھے گا۔

ان دو زبانوں کے کئی مشترک لفظ اب پرانے ہو گئے ہیں۔ اگر اُردو اور ازبک زبانوں کے لغات کا انیسویں صدی کے بیچ یا آخر میں مقابلہ کیا جاتا تو تو بلاشبہ پہلے گروپ کے مشترک الفاظ کی تعداد زیادہ ملتی آج کل کی بہ نسبت۔

لیکن یہ کہنا کہ ان کی کل تعداد . . اسال پہلے زیادہ تھی یا اب مشکل ہے کیونکہ عربی فارسی ترکی زبانوں کے مشترک الفاظ کم ہو گئے تو دوسرے گروپ کے (جو مقابلتاً کم ہیں) بین الاقوامی الفاظ آگئے ہیں جو انیسویں صدی کے آخر میں نہیں تھے۔

۳۔ مشترک الفاظ کی صوتیاتی خصوصیات

مشترک لفظوں کو صوتیاتی نقطۂ نظر سے دو گروپ میں بانٹ سکتے ہیں یعنی جن کے تلفظ میں کوئی فرق نہیں ہے اور جن میں صوتیاتی فرق موجود ہے۔

ا ۔ الفاظ جن کا تلفظ اُردو اور ازبک زبانوں میں ایک ہے۔

بدنیت	لب	لبریز	لرزہ	لطیفہ
اکثریت	عکس	لغت	ازل	عزت
وصیت	وزن	علم	ابلیس	عشق
عصب	عسل	عقل	گردن	گرد

اُردو کی اَ، آ، یا (آوازوں) پر توجہ کرنا ضروری ہے۔ اُردو کے الفاظ جن میں یہ آوازیں موجود ہیں، ازبک میں ان کے تلفظ میں چھوٹا سا فرق ہے۔ اس قسم کے لفظوں کو ہم ان دونوں گروپوں میں رکھ سکتے ہیں کیونکہ ان میں دونوں گروپوں کی خصوصیات موجود ہیں۔

ازبک زبان میں اُردو کے 'اَ'، 'آ'، 'یا' جیسی آوازوں کے تلفظ کو ادا کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے۔ 'اَ' 'آ'، بولتے وقت منھ زیادہ کھولا جائے اور لبوں کو گول کیا جائے۔ اب جو آوازیں نکلیں گی وہ اُردو کی اَ، آ جیسی ازبکی آوازیں ہوں گی۔ آسانی کے لیے اس آواز کو جو اُردو میں نہیں ہے، اس ^ علامت سے معین کر سکتے ہیں۔

اُردو میں :	التماس	آسمان	عاشق
اُزبک میں :	ILTIMÂS	ÂSMÂN	ÂSHIK
	آہو	واحد	گناہ
	ÂHU	VÂHID	GUNÂH
	گمان	آفتاب	اجازت
	GUMÂN	ÂFTÂB	NÂZAT
	بےپایاں	یاراں	بیاباں
	BEPÂYÂN	YÂRÂN	BIYÂBÂN
	یکساں	گریباں[1]	یاد
	YAKSÂN	GIRIBÂN	YÂD
	دیار		
	DIYÂR		

آ اور Â کے درمیان کا فرق اتنا کم ہے کہ اگر اُزبک نے ASHIK سنا تو وہ سمجھے گا کہ یہ ÁSHIK ہے۔ کبھی کبھی ازبک زبان کے کئی لفظوں میں آ، اَ۔ کے تلفظ میں کوئی فرق نہیں ملتا۔ مثلاً

اِجازہ	لفظاً	اوّل[2]	ادب
IJARA	LAFZAN	AVVAL	ADAB

---

[1] ازبک زبان میں 'ں' غنہ کے برابر کوئی آواز نہیں ہے۔ اس لیے اُردو کے ان الفاظ کو جن کے آخر میں 'ں' یا "اً" موجود ہیں، ازبک میں 'ن' یا 'ان' کا تلفظ کرتے ہیں۔ مثلاً ازبک میں 'زراں' لفظ کے 'ن' کا تلفظ ایسا ہی ہوگا جیسے کہ 'بیان' میں 'ن'

[2] اگر اُردو میں 'و' ملی ہوئی آواز DIPHTHONG کی حیثیت سے استعمال ہوتی ہے تو ازبک میں وہ 'V' کی طرح ادا کیا جائے گا۔ مثلاً اوج AVJ ۔ دورہ DAVRA دوران DAVRÂN اولاد AVÂLD الاؤ ÂLÂV

گماشتہ	بچکانا
GUMASHTA	BACHKANA

ب۔ اردو اور ازبک کے وہ الفاظ جن کے تلفظ میں فرق ہے۔

اُردو میں :	بے گم	دارو	آتون
ازبک میں :	BEGIM	DÂRI	ÂTIN
	عہد وپیمان	بہادر	دمادم
	AHD PAYMÂN	BAHÂDIR	DAMBADAN
	آشفتہ	آب وہوا	برداشت
	ÂSHIFTA	ÂB-I-HAVÂ	BARDÂSH
	بزرگ	بیمار	گنبد
	BUZRUK	BEMÂR	GUMBAZ
	استاد	دلربا	درندہ
	USTÂZ	DILRABÂ	DARRANDA

۴۔ مشترک الفاظ کے معنی

مشترک الفاظ کے معنی عام طور پر دونوں زبانوں میں ایک سے ہیں۔ اس قسم کے الفاظ پر نظر ڈالنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اوپر دی گئی ساری مثالیں اس میں شمار کی جا سکتی ہیں۔ لیکن اگر سنجیدگی سے دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کئی لفظوں کے معنی ازبک کے مقابلے میں اُردو میں وسیع تر ہیں اور بعض کے محدود ہیں۔ یہاں ایسی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن میں الفاظ کے معنوں میں فرق نظر آتا ہے۔

حسب ذیل الفاظ میں اُردو زبان میں معنی زیادہ وسیع ہیں۔

	الفاظِ مشترک	اُردو میں	اُزبک میں
۱۔	وکالت	تین معنی ہیں[ا]	ایک معنی
۲۔	ادب	چھ معنی	دو معنی
۳۔	دفتر	چار معنی	دو معنی
۴	وعدہ	تین معنی	ایک معنی
۵۔	برق	دو معنی	ایک معنی

حسب ذیل الفاظ میں اُردو میں معنی محدود ہیں

۱۔	باغیچہ	ایک معنی	دو معنی
۲۔	دنت	ایک معنی	دو معنی
۳۔	دریا	دو معنی	تین معنی
۴۔	گدا	ایک معنی	دو معنی
۵۔	بہا		دو معنی

اگر ان مذکورہ بالا الفاظ کے معنوں میں فرق ہو تب بھی ان کو ہم مشترک کہیں گے کیونکہ ان کے بنیادی معنی دونوں زبانوں میں ایک ہیں۔ مثلاً ' وعدہ' کا بنیادی مطلب ' اقرار۔ بچن' دونوں زبانوں میں موجود ہے' برق کے معنی بجلی ؛ باغیچے کے معنی چھوٹا سا باغ' چمن وغیرہ۔ تاریخی وجوہات سے لفظوں کے معنوں میں بھی تبدیلی آ گئی مثلاً لفظ ' دفتر' کا مطلب ازبک زبان میں صرف ' کاپی '

[ا] اردو الفاظ کے معنی فیروز اللغات سے لیے گئے ہیں۔ ان کی فہرست کافی لمبی ہے۔ اس لیے ان کے سارے مطلب یہاں نقل کرنا غیر ضروری سمجھا گیا۔ ازبک میں مشترک الفاظ کے معنی ازبک روسی لغت سے لیے گئے ہیں۔

نوٹ بک تک محدود ہوگیا اور باغیچے میں اضافہ ہوگیا اور اب اس لفظ کا کنڈر گارڈن کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔

ہمیں کچھ ایسے بھی الفاظ ملے ہیں جو دیکھنے میں ایک سے لگتے ہیں یعنی ان کی شکل میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن معنی بالکل مختلف ہیں۔ انھیں ہمنام الفاظ کہنا چاہیے جن کا مخرج ایک ہو۔ لیکن جو ازبک اور اُردو زبانوں میں الگ الگ معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے اُردو معنی سب جانتے ہیں۔ اس لیے صرف ان کے ازبک معنی دیے جاتے ہیں۔

دگانہ: سہیلی۔ اوقات: کھانے کی چیزیں۔ یقین: وہ جو قریب میں ہو۔

بروقت: مقررہ وقت سے پہلے۔ یسیر: وہ عورت جس کا شوہر مرا ہوا ہو۔

وجدان: وقار، ایمان۔ آزادہ: پاکیزہ، صفائی پسند

آچا: نانی، دادی ماں استحصال: پیداوار

لیکن اس طرح کے لفظ کم ہیں جیسے کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے ہمیں اس قسم کے ۸۵ الفاظ ملے ہیں۔

۵۔ مشترک الفاظ کا دائرۂ استعمال

مشترک الفاظ کے اس جائزے سے پتا چلتا ہے کہ وہ زندگی کے کسی ایک پہلو تک محدود نہیں رہتے۔ یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ انسان کے دائرۂ عمل کا کوئی بھی ایسا پہلو نہیں ملتا ہے جہاں اُردو اور ازبک زبانوں کے لغات کا کافی سرمایہ مشترک نہ ہو۔

۱۔ انسان، اس کی زندگی، صحت، خاندانی تعلقات، اس کی خصوصیات سے متعلق

آدم زاد بیمار دست والدہ

حاملہ	عیار	اختلاف	آدمیت
گردن	علت	اجداد	عمر
بے گناہ	نفرت	انسان	اسم
درد	بابا	حیات	عادل
انتقام	دشمن	دل	طبیب
آپا	لاش	انصاف	بدنیت
دوست	قامت	ڈاکٹر	آقا
دفن	ایمان	اہانت	برادرانہ
بدن	وبا	بے غم	اجل
عار	اعتراض	خاتون	قد
دوا	اقربا	وفات	وفا
بے حیا	امیر	پیشانی	شفا
خالہ	وصیت	احترام	عیش
غریب	لب	آرام	بیگانہ
گرد	عالی ہمت	بے شرم	انسانیت
اندام	استراحت	اجنبی	قبرستان
اعتماد	عیاش		

ب۔ گھر، کپڑے، کھانے پینے سے متعلق

عمارت	مخمل	الاؤ	پیاز
عرق	بنا	لتا	آتش
گوشت	بوزہ	طاقچہ	رومال

توا	اُستخواں	لمونیڈ	بالاخانہ
اطلس	کفگیر	کباب	بادہ
مکان	پوستین	دیگچہ (دیغچہ)	قیمہ
لکر	دہلیز	دستمال	دسترخوان
قورمہ	شراب	دیوار	شال
اِشتہا	شوربہ	خُم	خانہ
اَستر	آش	سموسہ	پیالہ
گنبد	لباس	نان	حلوا
کاسہ	محراب	توشک	خمیر
مُربا	ساقی		

ج۔ تجارت اور پھلوں سے متعلق

سوداگر	بازار	میوہ	بادام
کان	عطار	لیمن	انجیر
بہا	بزاز	پستہ	شفتالو
اَرزاں	بقال	کشمش	ناشپاتی
حمّال	تاجر	بہی	خُرما
قیمت	خریدار	انار	

د۔ مذہب سے متعلق

دین	روزہ	وعظ	امام
نبی	جنّت	دُعا	درویش
ارواح	اذان	حج	مسجد

عبادت	عزا	دوزخ	بندہ
افطار	اولیا	عید	نماز

ھ۔ علم وفن سے متعلق

فن	دوربین	آرہ	کتاب
اسکیم	عینک	وتر	تاریخ
جغرافیا	عالم	افکار	اختراع
دارالفنون	عاقل	دانا	استعداد
درس	افلاطون	علامہ	لیاقت
سبق	علوم	علم	انجنیر

و۔ ملک اور فوج سے متعلق

وطن	انتخاب	اسیر	عسکر
حکومت	گواہ	گرفتار	لشکرگاہ
قانون	ادارہ	حملہ	سردار
وزیر	انقلاب	خنجر	بم
پاے تخت	بغاوت	نیزہ	راکٹ
استعفیٰ	باج	تپنچا	توپچی
اقتدار	امپورٹ	اسلحہ	توپخانہ
عدالت	اکسپورٹ	آرمی	قلعہ
اصلاح	ڈپلومیٹک	لشکر	بیراق

ز۔ شعروادب سے متعلق

مصنف	مربع	انجمن	بوسہ

زمین	ادبیات	وزن	بہار
بلبل	باغ	ادیب	عروض
دنغگار	سروقامت	آسمان	مرثیہ
استعارہ	گل اندام	لطیف	گلاب
قطعہ	مصرع	دل آزار	آہو
آبِ حیات	نظم	بیت	دلنواز
پروانہ	آئنہ جہان	شعر	یار
وصال	گلستاں	دیو	غزل
عِشق	گلبدن	لالہ	اِبلیس
افسانہ	بزم	بوستاں	قدرت
حنا	شاعر	محبت	ویران
کائنات	عاشق	مشاعرہ	محبوب
چمن	آفتاب	محفل	

آخر میں یہ بات ایک بار اور کہنا ضروری ہے کہ مدّتوں پرانے تعلقات کے نتیجے میں وسطِ ایشیا اور ہندستان کے باشندے ایک دوسرے کی تہذیب و تمدن سے کافی متاثر ہوئے۔ یہ تعلقات گہرے تھے۔ آج کل ہمیں یہ مشابہت نہ صرف ان کے رسم و رواج میں ملتی ہے بلکہ یہی بات اُردو ازبک بانوں کے لغات میں بھی ملتی ہے اور مشترک الفاظ انسان کی زندگی کے ہر ایک پہلو میں موجود ہیں۔

سوویت اور ہندستانی عوام کی مشابہت پر جو چاہے تہذیب میں ہو یا فنِ تعمیر میں، شعر و شاعری میں ہو یا زبان میں، گہری تحقیق کرنا ضروری ہوگا۔ اس سے ہم ایک دوسرے کو اور بہتر جان سکیں گے اور ہماری موجودہ دوستی اور زیادہ بڑھے گی۔

زمانۂ حال کے صیغے

ڈاکٹر مِس سونیا چرنی کووا۔ تاشقند یونی ورسٹی

زمانہ، افعال کے ان صیغوں کا نام ہے جو یہ دکھاتے ہیں کہ کام بولنے کے وقت سے کیا تعلق رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر حال یہ ظاہر کرتا ہے کہ کام بولنے کے وقت میں ہو رہا ہے یا بولنے کا وقت اس وسیع زمانے کا ایک حصہ بن جاتا ہے جس پر کام پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ اردو اور ہندی میں حال کے اظہار کے لیے صرف ایک صیغہ نہیں بلکہ خبری صورت کے معروف طور میں صرف کام دکھانے والے افعال کے ۱۰ صیغے ہیں جیسے: پڑھتا ہے، پڑھ رہا ہے، پڑھتا جاتا ہے، پڑھتا جا رہا ہے، پڑھے جاتا ہے، پڑھے جا رہا ہے، پڑھا کرتا ہے، پڑھتا رہتا ہے، پڑھتا رہا کرتا ہے، پڑھتا آ رہا ہے۔

صیغوں کی یہ تعداد بہ ظاہر عجیب سی معلوم ہوتی ہے لیکن اس کا سبب

۔ ہے کہ یہ صیغے زمانے کے اظہار کے علاوہ فعل کی بعض دیگر خصوصیتوں کو بھی
اہر کرتے ہیں۔ مثلاً بہ اعتبارِ زمانہ تمام صیغے تقریباً یکساں ہیں، لیکن یہ سب کام
مختلف کیفیتوں کو نمایاں کرتے ہیں اور اسی لیے ان پر الگ الگ بحث کرنے
ی ضرورت ہے۔

"صورت" وہ اصطلاح ہے جو کام کے تسلسل کے طریقوں میں ان
ھوٹے یا بڑے اختلافات کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو کچھ زبانوں میں
اعد کے صیغوں کے ذریعے متعین ہوتے ہیں۔ مثلاً ترقی پذیر صورت کے
یغوں کی خصوصیت کام میں اضافہ ہوتے رہنا ہے۔ جیسے پڑھتا جاتا ہے۔
قفہ پذیر صورت کے صیغے کام کو وقفے کے ساتھ ہوتے ہوئے دکھاتے ہیں۔
یسے پڑھا کرتا ہے۔ صورت، زمانے سے قطع نظر کام کی خصوصیت بتاتی ہے۔
ردو اور ہندی میں افعال امدادی کا ایک گروہ ہے جن کے اپنے معنی
ہیں اور جو فعل کی حیثیت سے مفرد طور پر تنہا بھی استعمال ہوتے ہیں۔ ساتھ
ہی دوسرے فعلوں سے مل کر یہ ان کی صورت پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔
مندرجہ ذیل مصدروں کو دیکھیے :

پڑھتے رہنا ——— طویل صورت
پڑھتے جانا ——— ترقی پذیر صورت
پڑھا کرنا ——— وقفہ پذیر صورت
پڑھ رہا ہونا ——— استمراری صورت

صیغے کی بناوٹ میں زمانے کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یہاں
صیغے اور صورت کے فرق کو واضح طور پر پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ مثلاً "طویل
صورت" اس وقت تک خود صیغہ نہیں ہو سکتی جب تک اس میں زمانے کو شامل

نہ کیا جائے۔ صیغے میں صورت اور زمانہ دونوں شامل ہوتے ہیں، لہٰذا ماضی، حال، اور مستقبل کی طویل صورت کے صیغے ہو سکتے ہیں۔

اس مقالے کا مقصد جملوں کو دیکھ کر حال کے کام دکھانے والے افعال کے صیغوں کی خصوصیتیں متعین کرنا ہے۔ یہ اُردو اور ہندی کے افعال کا ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا ابھی تک تفصیل سے مطالعہ نہیں کیا گیا ہے۔ یہ مضمون فعل کی خبری صورت تک محدود ہوگا۔

حالِ مطلق کا صیغہ

صیغے کی ساخت :

حالِ مطلق کا صیغہ اصل فعل کے حالیہ ناتمام اور "ہونا" کے حال کے مفرد صیغوں کا مرکب ہے، جیسے کرتا ہے۔

اس کا استعمال مختلف مفہوم ادا کرنے کے لیے کیا جاتا ہے جن کی تفصیل درجِ ذیل ہے :

۱۔ ایسے کام کے اظہار کے لیے جو معمول کے ساتھ عمل میں آتا ہے۔ جیسے:

"نوّاب۔ اور لطف یہ کہ کھیلتے بھی ہیں، تماشا ناچ رنگ بھی دیکھتے ہیں کلب میں بھی جاتے ہیں، ہوا بھی دو وقتہ کھاتے ہیں، سیر بھی کرتے ہیں، شکار پر بھی جاتے ہیں اور پھر بھی اپنا کام کرتے ہیں اور کتابیں پڑھتے ہیں اور مطالعۂ اخبار کرتے ہیں اور کتابیں بھی تصنیف کرتے ہیں اور آرٹکل بھی لکھتے ہیں۔"

(سرشار : سیرِ کہسار، جلد دوم، ۸۱)

"ممتن۔ دیکھیے سرکار! جو اس کے منہ میں آتا ہے واہی تباہی بک دیتا ہے ....." (سرشار : سیرِ کہسار، جلد اول، ۶۸)

"....مگر ہم سے لوگوں نے کہا تھا کہ پہاڑ پر بڑا خطرہ ہے۔ لوگ گر پڑتے ہیں، مرجاتے ہیں، ڈوب جاتے ہیں....." (سرشار : سیر کہسار، جلد دوم، ۸۶)

اگر معمول کے ساتھ ہونے والے کام کا وقفہ متعین کرنا ہوتا ہے یعنی یہ کہ کام کم وقفے کے ساتھ ہوتا ہے یا زیادہ وقفے کے ساتھ بار بار دہرایا جاتا ہے یا نہیں، تو اس کے لیے جملے میں مناسب تمیزی الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں، جیسے :

"مگر اس میدان میں کبھی کبھی ایسے سپاہی بھی آجاتے ہیں جو موقع پہ قدم بڑھانا جانتے ہیں۔" (پریم چند : رانی سارندھا، ۸۶)

"اس میں اب وہ عمل نہیں ہے۔ اسے جلد غصہ آجاتا ہے۔ دو ہلکی کٹی باتوں کا اکثر جواب بھی دے دیتی ہے۔" (پریم چند : بازار حسن، ۶)

کام کسی خاص حالت کے تابع ہو کر اسی کے ساتھ دہرایا جاسکتا ہے، جیسے :

"....جب سوچتی ہوں تو پہروں دل قابو میں نہیں رہتا...."

(سرشار : کامنی، ۵۱۲)

"اور برسات میں یہ حال ہوتا ہے کہ آفتاب ہفتوں نہیں نکلتا ہے۔"

(سرشار : سیر کہسار، جلد اول، ۳۹)

"....جس دن تمھاری گھر والی کا منہ ترکے دیکھ لیتا ہوں۔ اسی دن کچھ نہ کچھ جرور ہاتھ لگتا ہے :...." (پریم چند : گودان، ۳۱)

۲۔ مسلمہ حقیقتوں اور صداقتوں کو ظاہر کرنے کے لیے، جیسے :

"....خربوزے کو دیکھ کے خربوزہ رنگ پکڑتا ہے......"

(سرشار : کامنی، ۴۶۴)

"آگ پانی سے بجھ جاتی ہے۔" (پریم چند، راجپوت کی بیٹی، ۶۲)

"زینب: اے بی بی! یہ تو دنیا جہان ہے کوئی روتا ہے کوئی گاتا ہے، کوئی ناچتا ہے کوئی بجاتا ہے، کوئی جیتا ہے کوئی مرتا ہے۔۔۔۔"

(سرشار: کامنی، ۴۰۲)

"دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔" (شرر: قیس و لبنیٰ، ۱۵۰)

۳۔ ایسے کام کے لیے بھی جو بولنے کے وقت جاری ہو۔ مگر استمراری صیغے کی طرح توجہ کا مرکز کام کا جاری ہونا نہیں ہوتا بلکہ کام کا ہونا ایک حقیقت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، جیسے:

"۔۔۔۔ اس کے بھائی نے گائے کو بس کھلا کر مار ڈالا ہے۔ اب جو میں تھانے میں رپٹ لکھانے جاتی ہوں تو یہ ہتیارا مجھے مارتا ہے۔۔"

(پریم چند: گودان، ۱۷۸)

"۔۔۔۔ اب میں مرتا تو ہوں، ایسا نہ ہو بن باپ کے بچے کا مال میرے ذمے رہ جائے۔۔۔۔" (راشد الخیری: صبحِ زندگی، ۵۴)

حالِ مطلق[۵] کا صیغہ

- کام بولنے کے وقت میں ہوتا ہے جیسے: "اس نے جلدی سے پوچھا کہاں جاتے ہو۔" (پریم چند: منتر، ۳۸)
- مسلمہ حقیقت۔ جیسے: محبت میں انسان کو صرف ایک چیز نظر آتی ہے۔ اور وہ وصالِ یار ہے۔" (پریم چند: راجپوت کی بیٹی، ۶۲)
- کام معمول کے ساتھ عمل میں آتا ہے۔ جیسے: "دن کو لوگ اپنے دھندے سے لگتے ہیں مگر ساڑھے پانچ بجے سے پھر کسی بنگلے میں انسان کی صورت

۵۔ ص ۱۷۰ پر دیکھیے۔

نظر نہیں آتی۔ سب ہوا
کھاتے ہیں۔"
(سرشار: سیر کہسار، جلد
دوم، ۹۱)

(حاشیہ متعلق صفحہ ۱۶۹) ماضی تمام کا صیغہ زمانہ حال مطلق کے معنی دیتا ہے لیکن ضروری ہے کہ عبارت کے سیاق و سباق سے حال مطلق کا مفہوم واضح طور پر ظاہر ہوتا ہو۔ اس صورت میں بار بار کے یا روزمرہ کے ہونے والے واقعہ کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے گویا یہ محض ایک بار یا ایک دن ہوا ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ سننے والے کی توجہ اس واقعے پر مرکوز ہو جاتی ہے اور واقعہ زیادہ واضح طور پر اس کے ذہن نشین ہو جاتا ہے جیسے:

"محفل بھر میں سب کی نگاہ ان کی طرف۔ ہے یہ آنکھ اُٹھا کے بھی نہیں دیکھتیں۔ پھر جدھر دیکھ لیا، ادھر سب دیکھنے لگے۔ جب پر ان کی نگاہ پڑتی ہے اس پر ہزاروں نگاہیں پڑتی ہیں۔ (مرزا رسوا: امراؤ جان ادا، ۵۰)

"اس کی یہ کیفیت ہے کہ ادھر محمد عسکری دروازے پر آئے اور وہ کودتی ہوئی دوڑی کہ "عسکری میاں آئے"۔

(سرشار: فسانۂ آزاد، جلد دوم، ۲۵۲)

"بھئی ان ماسٹروں کے خوب ٹھاٹھ ہیں۔ مزے سے سائیکلوں پر دندناتے پھر رہے ہیں۔ جسے جب جی چاہا ٹھوک دیا۔ مرغا بنا کر کرسی رکھ دی اور غصہ آیا تو کونے میں منہ دے کر جھینٹی کے گھنٹے میں کھڑا کر دیا۔ کوئی جملہ پانچ سو دفعہ لکھنے کو دے دیا۔ نظمیں رٹوا لیں۔"

(عصمت چغتائی: تین اناڑی، ۷۷)

حال کی استمراری صورت

حال کی استمراری صورت کے اجزاے ترکیبی میں اصل فعل کا مادّہ فعل "رہنا" کا حالیہ تمام اور "ہونا" سے حال کا مفرد صیغہ شامل ہوتا ہے۔ جیسے: ہو رہا ہے۔

حال کی استمراری صورت یہ ظاہر کرتی ہے کہ کام بولتے وقت جاری ہے۔ جیسے:

"اس آشا کو دیکھو، وہاں وہ نرمل اپنے ٹوٹے ہوئے دل کو سنبھالے خون کے آنسو رو رہا ہے اور یہ کمبخت ادھر ہیرے کی انگوٹھی پاکر پھولی نہیں سما رہی ہے۔"
(عباس: کہتے ہیں جس کو عشق، ۱۹)

"میرا سانس اکھڑ رہا ہے اور وقت آخر ہے۔۔۔۔۔۔"
(راشدالخیری: رواج کی بھینٹ، ۳۵)

"۔۔۔۔۔ دیکھتی ہو بجلی کیا غضب ڈھا رہی ہے۔۔۔۔"
(راشدالخیری: نئی دلھن، ۸۹)

کام کو بولنے کے وقت ہوتے ہوئے دکھانا حال کی استمراری صورت کا ایک اہم استعمال ہے مگر اس کا صرف یہی ایک استعمال نہیں: حال کی استمراری صورت سے ظاہر کیے ہوئے کام کا وقتی پیمانہ زیادہ وسیع ہو سکتا ہے۔ کام کو آج کل، ان دنوں ہوتے ہوئے دکھایا جاتا ہے جس سے موجودہ زمانہ مراد ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ کام اس وقت بھی ہو رہا ہو جب کہ اس کے بارے میں بتایا جا رہا ہے، بلکہ بولنے کا وقت اس وسیع زمانے کا ایک حصہ بن جاتا ہے جب یہ کام پھیلا ہوا ظاہر کیا

جاتا ہے۔ جیسے :

"..... آپ کو کچھ خبر ہے کہ عدالتوں میں کتنی رشوت چل رہی ہے، کتنے غریبوں کا خون ہو رہا ہے، کتنی عورتیں بدراہ ہو رہی ہیں ....."

(پریم چند : گودان، ۲۸۴)

"..... یہاں ایم۔ اے میں پڑھ رہا ہوں ....."

(پریم چند : حسن و شباب، ۲۹)

"لڑکیوں کی پرورش میں مسلمان جو امتیاز کر رہے ہیں اس پر مجھے مفصل بحث کی ضرورت نہیں۔ ہر باپ خود اس کا فیصلہ کر سکتا ہے کہ وہ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں پر کیا صرف کر رہا ہے۔"

(راشدالخیری : کلنک کا ٹیکا، ۱۶)

حال کی استمراری صورت اپنے دامن میں ماضی کے کچھ وقت کو بھی سمو لیتی ہے، لیکن یہ زمانہ اس قدر طویل نہیں ہوتا جیسا طویل استمراری صورت کے ذریعے ظاہر کیا جاتا ہے۔ (مثلاً: کرتا آ رہا ہے) اور نہ صرف قرینے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے بلکہ جملے میں مناسب لفظوں کا استعمال بھی اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ کام کو ہوتے ہوئے کچھ وقت گزر گیا گویا کام ماضی کے ایک خاص لمحے سے شروع ہو کر جاری رہا اور حال میں بھی برابر جاری ہے۔ جیسے :

"سات دن سے مینہ لگاتار برس رہا ہے۔"

(سرشار : کامنی، ۳۹۸)

"..... میں تو پندرہ سولہ برس سے یہ کام کر رہا ہوں ....."

(صالحہ عابد حسین : راہ عمل، ۵۸)

یہ صیغہ لگاتار ہونے والے کاموں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے ظاہر کیا ہوا کام اگرچہ لگاتار ہوتا رہتا ہے لیکن اس کا لگاتار ہونا پس منظر میں چلا جاتا ہے اور صرف کام کا بولنے کے وقت جاری رہنا اہمیت رکھتا ہے[1]، جیسے:

"..... زمین گیند کی طرح لڑھکنیاں کھاتی ہوئی آفتاب کے گرد چکر لگا رہی ہے۔" (نذیر احمد: بنات النعش، ۱۲۵)

"سنسار میں جو کچھ ہو رہا ہے بھگوان شو کی آنکھ سب دیکھتی رہتی ہے"۔

(عباس: آسمانی تلوار، ۹۸)

"چاند، سورج، زمین، آسمان، جنگل، پہاڑ، دریا، میدان، قدرت کا جلوہ ہر جگہ چمک رہا ہے۔" (راشد الخیری: صبح زندگی، ۱۰۲)

"استانی جی۔ وہ کشش کچھ صرف زمین میں نہیں ہے ہر ایک چیز ایک دوسرے کو کھینچ رہی ہے۔ زمین، چاند، سورج، ستارے سب ایک دوسرے کو اپنی اپنی طرف کھینچ رہے ہیں ....." (نذیر احمد: بنات النعش، ۲۹۷)

---

[1] اصل فعل کی استمراری صورت کے حالیہ اور فعل "ہونا" کے حال مطلق سے ایک صیغہ بنتا ہے جو حالت دکھانے والے فعلوں میں شامل ہوتا ہے۔ جیسے: کر رہا ہوتا ہے۔

یہ صیغہ عام طور پر تمیزی جملوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ کسی کام کے گزرنے کے وقت فاعل کا کیا حال ہوتا ہے، جیسے:

"کبھی شام کو جب ان کے فلیٹ میں دھما چوکڑی مچی ہوتی ہے تو وہ بالکنی میں آکر چپ چاپ کھڑی ہو جاتی ہے اور اپنی خالی خالی آنکھوں سے ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخی کے اس پار، دور کہیں خوابوں کے دیس میں، اپنی اس کنواری دنیا کو ڈھونڈ رہی ہوتی ہے جو لٹ گئی۔"
(عصمت چغتائی: معصومہ، ۱۹۶)

استمراری صورت

(کام کا جاری ہونا)

فطری قوانین کے مطابق ہمیشہ ہونے والے کام کے لیے، جیسے:
زمین آفتاب کے گرد چکر لگا رہی ہے۔

جس زمانے پر کام پھیلا ہوا ظاہر کیا جاتا ہے، بولنے کا وقت اس کا ایک حصہ بن جاتا ہے، حالانکہ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ کام کے جاری ہونے میں بولنے کا وقت بھی شامل ہو۔ جیسے:
دنیا کے تمام نوجوان لوگ امن کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔

کام بولنے کے وقت ہو رہا ہے۔ جیسے:
وہ پڑھ رہا ہے۔

حال کی ترقی پذیر صورت کے صیغے

اردو اور ہندی میں حال کی ترقی پذیر صورت کے دو صیغے ہیں:

۱۔ حال کی ترقی پذیر صورت

۔ حال کی ترقی پذیر استمراری صورت

ترقی پذیر صورت کے صیغوں کے ذریعے کام میں اضافہ ہوتے رہنا دکھایا جاتا ہے۔

صیغوں کی ساخت:

حال کی ترقی پذیر صورت کا صیغہ اصل فعل کے حالیہ ناتمام اور فعل "جانا" یا "آنا" یا "چلا جانا" یا "چلا آنا" کے حال مطلق سے مل کر بنتا ہے جیسے، کرتا جاتا (آتا) ہے۔ کرتا چلا جاتا (چلا آتا) ہے۔

حال کی ترقی پذیر استمراری صورت کا صیغہ، اصل فعل کے حالیہ ناتمام اور فعل "جانا" ("آنا") یا "چلا جانا" ("چلا آنا") کی حال کی استمراری صورت سے بنتا ہے۔

"آنا" اور "جانا" افعالِ امدادی میں فرق یہ ہے کہ "آنا" کام کو ہمیشہ فاعل کی طرف بڑھتے ہوئے دکھاتا ہے جبکہ "جانا" کبھی کبھی کام کو فاعل کی طرف سے دور ہوتے ہوئے پیش کرتا ہے۔ جیسے: بڑھتا آرہا ہے، قریب ہوتا آرہا ہے، دور ہوتا جارہا ہے۔

ویسے تو اس صورت میں "جانا" عام طور پر ایک ایسے غیر جانبدار فعل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جس سے صرف ہوتے ہوئے کام میں اضافہ دکھایا جاتا ہے۔

اس نقطۂ نظر سے یہی فرق "چلا جانا" اور "چلا آنا" میں ہے۔

مگر "چلا جانا" او "چلا آنا" اصل فعل کے حالیہ ناتمام کے ساتھ عام طور پر تب جوڑے جاتے ہیں جب کام میں ماضی کا زیادہ زمانہ شامل ہوتا ہے جیسے:

"..... لو۔ جو منہ میں آتا ہے بکتے چلتے جا رہے ہو.....۔"

(صالحہ عابد حسین: راہ عمل، ۳۷)

"دفعتہً خبر ملی کہ دشمنوں کی فوج قلعے کی طرف بڑھتی چلی آتی ہے"۔

(پریم چند: ستی، ۱۴۰)

حال کی ترقی پذیر صورت کے صیغے کے مندرجۂ ذیل استعمال ہیں۔

۱۔ اُس کام کو ظاہر کرنے کے لیے جس کا کینوس وسیع ہوتا ہے اور جس کے وقوع میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

کام میں ترقی پذیری ہونے کی وجہ سے بولتے وقت کام کا سلسلہ منقطع ہوتا تو نہیں معلوم ہوتا لیکن اس سلسلے میں وسعت کی وجہ سے خاص بولنے کے وقت پر خاص توجہ نہیں ہوتی۔ جیسے:

"ض ۔ بھلا آگے بھی کبھی سنتے تھے کہ چیچک کی بیماری میں سیکڑوں بچّے مرگئے جیسے اب مرتے جاتے ہیں کہ بچّوں کی لاشوں سے قبرستان آباد ہوگئے۔"

(سرشار: سیر کہسار، جلد دوم، ۱۴)

"..... میں جتنا ہی طرح دیتا ہوں اتنا ہی یہ سر چڑھتی جاتی ہے۔"

(پریم چند: گودان، ۱۷۸)

"ناخدا خوب سمجھتا تھا کہ حالت ہر گھڑی نازک ہوتی جاتی ہے۔"

(سرشار: فسانۂ آزاد، جلد دوم، ۵۵)

۲۔ ایسے کام کو ظاہر کرنے کے لیے جس میں معمول کا انداز پایا جاتا ہو، جیسے:

"..... مرغی جوں جوں موٹی ہوتی جاتی ہے، انڈا چھوڑتا دیتی ہے..."

(سرشار: کامنی، ۳۵۵)

"..... زمین کے آس پاس جو ہوا ہے وہ بہت وزنی ہے اور جس قدر اوپر چڑھتے جاؤ، ہلکی ہوتی جاتی ہے....."

(نذیر احمد: بنات النعش، ۱۱۸)

"اسی طرح تو یہ چھوٹے لوگ سر پر چڑھتے چلے جاتے ہیں۔"

(صالحہ عابد حسین: راہِ عمل، ۵۰)

۴۔ اس کام کے اظہار کے لیے بھی جو بولنے کے وقت اپنی ارتقائی صورت میں جاری ہو۔ لیکن ترقی پذیر استمراری صورت کے صیغے کی طرح (کرتا جا رہا ہے) اس کام کو ہوتے ہوئے دکھایا نہیں جاتا بلکہ اس کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔ حال کی ترقی پذیر صورت میں توجہ کا مرکز خود کام ہوتا ہے جبکہ حال کی ترقی پذیر استمراری صورت کے صیغے میں تسلسل زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ترقی پذیر صورت کے صیغے میں توجہ، ہوتے ہوئے کام کی طرف کم اور فاعل پر زیادہ ہوتی ہے۔ کام آہستہ نہیں بلکہ ذرا جلدی سے ہوتا ہوا محسوس کیا جاتا ہے۔ جیسے :

"گیتا پہنچی تو دیکھا کہ کلّو کھانا کھاتی جاتی ہے اور زور زور سے ہاتھ ہلا ہلا کر خالدہ کو سمجھا رہی ہے۔"

(صالحہ عابد حسین : راہِ عمل، ۱۴۰)

"ہاتھ میں ستاری چھوٹی سی ہے۔ اس کو چھیڑتی جاتی ہے اور گاتی جاتی ہے۔"
(سرشار : کامنی، ۵۴۱)

حال کی ترقی پذیر صورت
(کام کے وقوع میں اضافہ ہوتا رہتا ہے)

اُس کام کے اظہار کے لیے جو بولنے کے وقت میں جاری ہو، جیسے : شوہر کھانا کھا رہا ہے اور بیوی پنکھا چلاتی جاتی ہے۔

ان کاموں کو ظاہر کرنے کے لیے جن میں معمول کا انداز پایا جاتا ہے، جیسے : "...۔ پتھر کو اوپر پھینکو اور دیکھتی رہو تو ایسا معلوم ہوگا کہ

ان دنوں، آج کل ہونے والے کاموں کے اظہار کے لیے، جیسے : "شائستہ خیالات روز افزوں ترقی پاتے جاتے ہیں۔"
(سرشار : سیرِ کہسار، جلد دوم، ۱۶۶)

جوں جوں اوپر کو جاتا
ہے، اس کی چال سست
اور دھیمی ہوتی جاتی
ہے..... "
(نذیر احمد : نبات النعش،

(۱۱۲)

حال کی ترقی پذیر استمراری صورت کے استعمال

حال کی ترقی پذیر استمراری صورت اور حال کی استمراری صورت کا خاص فرق یہ ہے کہ حال کی ترقی پذیر استمراری صورت میں تسلسل کی زیادتی دکھانا مقصود ہوتا ہے۔ اس فرق کو نظر انداز کر دیا جائے تو پھر دونوں یکساں ہیں[۱]۔

حال کی ترقی پذیر استمراری صورت کے صیغے سے ذیل کی کیفیتیں ظاہر ہوسکتی ہیں :

۱۔ کام بولنے کے وقت ہو رہا ہے، جیسے :

"میں نے سوچا، کہانی سے ہٹ کر ہم شاعرانہ مبالغوں میں پھنستے جا رہے ہیں۔"

(عباس : دیا جلے ساری رات، ۳۵)

"مجھے غصہ آ رہا تھا کہ چاندنی رات بیکار ڈھلتی جا رہی ہے اور یہ لوگ محبت بھری باتیں کرنے کے بجائے آنے پیسوں کا حساب لگا رہے ہیں۔

عباس : کہتے ہیں جس کو عشق، ۱۶)

---

[۱] کیونکہ مسلمانوں کی حالت روز بروز ابتر ہو رہی ہے۔" (راشد الخیری : سمرنا کا چاند، ۵۸)

"کل رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے پاس چاندی کے روپیوں کا ڈھیر ہے، لاکھوں کروڑوں روپے، اور میں اُن کو سڑک پر برابر رکھتا چلا جا رہا ہوں۔"

(عباس : الف لیلہ ' ۱۱۸)

۲۔ کام آج کل ' ان دنوں ہو رہا ہے :

جس زمانے پر کام پھیلا ہوا ظاہر کیا جاتا ہے، اس میں بولنے کے وقت کا شامل ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ کام اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ سننے والے کی توجہ تسلسل کی طرف منعطف ہو جاتی ہے، کام کے وقت کی طوالت پہ زور دیا جاتا ہے' اس میں یہ احساس نہیں ہوتا کہ کام جلدی سے ہو رہا ہوتا ہے' جیسے :

" اور اس طرح دلوں میں کھوٹ پڑتا جا رہا ہے اور نہ جانے کب پھر خون خرابا شروع ہو جائے۔"

(عباس : بچوں کا خط مہاتما گاندھی کے نام ' ۷۰)

"حبیب میاں نے گیتا سے کہا : " ارے ہاں بیٹی میں تو بھول ہی گیا تھا۔ کتنا بھلکڑ ہوتا جا رہا ہوں ۔"

(صالحہ عابد حسین : راہِ عمل ' ۱۱)

" آپ کے دشمن گنتی میں بڑھتے جا رہے ہیں اور اب تو کھلے دھڑلے اونچی باتیں آپ کے خلاف کرتے ہیں۔"

(عباس : بچوں کا خط مہاتما گاندھی کے نام ' ۶۷)

مختصر الفاظ میں کہا جائے تو ہوتے ہوئے کام کی ترقی پذیری کے اظہار کے لیے آج کل کی اُردو اور ہندی میں دو صیغے ہیں : ترقی پذیر صورت اور ترقی پذیر استمراری صورت ۔ دونوں میں محض یہ فرق ہے کہ ترقی پذیر

صورت میں کام کی ارتقائی کیفیت پر زور دیا جاتا ہے اور ترقی پذیر استمراری صورت میں اس کی خاص ظاہری صورت کے ساتھ تسلسل بھی دکھایا جاتا ہے۔ گویا ترقی پذیر صورت صرف کام کو واقع ہوتے ہوئے دکھاتی ہے جبکہ ترقی پذیر استمراری صورت میں کام کا تسلسل بھی شامل ہوتا ہے۔

ترقی پذیر صورت کے ان دو صیغوں کے ساتھ ساتھ اسی معنی میں دو اور صیغے استعمال ہوتے ہیں۔ ان میں حالیہ ناتمام کی جگہ، حالیہ تمام کا استعمال ہوتا ہے۔

جن صیغوں میں فعل متعدی کا استعمال کیا گیا ہے، ان سے ترقی پذیری کے علاوہ، فاعل کا کام کرنے کے لیے ارادہ بھی ظاہر ہوتا ہے، جیسے :

"آپ نے تو خیر کئی نیک کام کیے ہیں اور بدستور کیے جا رہے ہیں۔"

(منٹو : اوپر، نیچے اور درمیان ، ۱۹۰)

"برسات کی چپچپی گرمی پڑ رہی ہے اور ہوا بند ہے کہ پتا تک نہیں ہلتا، میں باہر صحن میں کھڑی برابر پنکھا اپنے تئیں ہلائے جاتی ہوں اور ندیوں پسینا نکلا چلا آتا ہے۔"

(نذیر احمد : بنات النعش ، ۴۴)

جن صیغوں میں فعل لازم اور ناقص استعمال ہوتے ہیں، ان میں کام کے ارتقائی تسلسل کے احساس کے ساتھ ساتھ، غالب احساس یہ ہوتا ہے کہ فاعل کو کام کے ہو جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ فاعل کی یہ خواہش نہیں ہوتی کہ کام عمل میں آئے، جیسے :

"۔۔۔۔ مگر تم کو پروا نہیں اور آپے سے باہر ہوئے جاتے ہو۔"

(شرر : قیس ولبنیٰ ، ۶۵)

"..... اور اب نیند کے مارے میری آنکھیں بھی بند ہوئی جا رہی ہیں ......"
(عباس : الف لیلہ، ۱۴۰)

"میرے تو ہوش اُڑے جاتے ہیں۔"
(راشد الخیری : صبح زندگی، ۷۶)

"کہاروں نے پیسے مانگے، وہ لگیں خفا ہونے کہ کسی طرح بس ہی میں نہیں، جو ہے وہ اُترا چلا آ رہا ہے ......"
(راشد الخیری : صبح زندگی، ۶۶)

"کامنی : ہائے یہ کیا معلوم تھا کہ میری قسمت میں یہ بدا ہے، دل ڈوبا جاتا ہے۔"
(سرشار : کامنی، ۴۱۲)

حال کی وقفہ پذیر صورت

صیغے کی ساخت :

اصل فعل کے حالیہ تمام اور "کرنا" کے حال مطلق کے صیغے کو ملا کر حال کی وقفہ پذیر صورت بنائی جاتی ہے، جیسے : دیکھا کرتا ہے۔

حال کی وقفہ پذیر صورت کے استعمال :

۱۔ کام کا جاری رہنا مسلسل نہیں ہوتا بلکہ بیچ بیچ میں وقفہ آتا رہتا ہے، جیسے:

"خوف سے لیتے نہیں نام کہ سن لے نہ کوئی
چپکے چپکے تمھیں ہم یاد کیا کرتے ہیں"
(سرشار : کامنی، ۳۱۶)

"میں دو خاتونوں کو زبان کی تعلیم دینے جایا کرتی ہوں ......"
(پریم چند : سہاگ کا جنازہ، ۲۰۸)

"..... کاکا ! بہن ہم کو چڑھایا کرتی ہے ....."

(پریم چند : گودان ، ۲۵)

کام کی کثرت یا کمیت ظاہر کرنے کے لیے جملے میں "کبھی کبھی" "اکثر" "بار بار" "اکثر و بیشتر" جیسے الفاظ موجود ہوتے ہیں۔ جیسے :

"..... تو تو آئے دن فرمائش کیا کرتی ہے ....."

(مرزا رسوا : امراؤ جان ادا ، ۸۰)

"..... پہاڑ برابر پڑھا کرتے ہیں ......"

(سرشار : سیر کہسار ، جلد دوم ، ۷۰)

"مہراج - یہ شعر ہمارا داماد علیہ الرحمۃ اکثر پڑھا کرتا ہے۔"

(سرشار : سیر کہسار ، جلد دوم ، ۶۵)

"عصمت اور میں بعض اوقات عجیب عجیب باتیں سوچا کرتے ہیں۔"

(منٹو : عصمت چغتائی ، ۲۲)

۲- کام عام صداقت کے ساتھ کیا جاتا ہے ، اس بات کا واضح احساس ہوتا ہے کہ کام بہ کثرت ہونے کی وجہ سے معمول بن گیا ہے ، جیسے :

"..... دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے بالکل اسی طرح باتیں کر رہے تھے جیسے عاشق و معشوق کیا کرتے ہیں۔"

(پریم چند : ترسول ، ۹۴)

"..... یہ کنجوس ہے جیسے بوڑھی عورتیں ہوا کرتی ہیں ....."

(سرشار : فسانۂ آزاد ، جلد دوم ، ۴۰)

"..... اس سن میں سب کی نظر پڑتی ہے اور لڑکیاں اکثر بگڑ بھی جاتا کرتی ہیں۔"

(سرشار : فسانۂ آزاد ، جلد دوم ، ۵۰)

۳۔ بعض اوقات عمومیت کے ساتھ ہونے والے کام سے فاعل کی عادت ظاہر ہوتی ہے، جیسے :

"..... نہیں میں تو باہر ہوا میں بھی نہیں بیٹھتی، دالان کے اندر بیٹھا کرتی ہوں جہاں ہوا کا گزر نہیں۔"

(نذیر احمد : بنات النعش، ۴۶)

"میں نے استانی جی سے پوچھا کہ آپ اس قدر سویرے اُٹھ کر کیوں نہلا کرتی ہیں ......"

(نذیر احمد : بنات النعش، ۱۲۸)

"کیا ہر روز آپ پہر دن چڑھے اُٹھا کرتی ہیں۔"

(نذیر احمد : بنات النعش، ۵۴)

۴۔ بظاہر مسلسل کام کے لیے بھی وقفہ پذیر صورت کا استعمال ہو سکتا ہے۔

(الف) تسلسل کا احساس جملے میں استعمال شدہ لفظوں سے پیدا ہوتا ہے، وقفہ پذیر صورت کے استعمال سے اس تسلسل کا انقطاع ظاہر ہوتا ہے، جیسے :

"..... میری آنکھیں ہر گھڑی تمہیں ڈھونڈھا کرتی ہیں ....."

(شرر : قیس و لبنیٰ، ۶۳)

"رنبیر سنگھ رن کے میدان میں ہیں اور وہاں ہر دم و ہر لحظہ اپنی چاہتی بی بی کو دل سے یاد کیا کرتے ہیں۔"

(سرشار : کامنی، ۳۳۹)

اس قسم کے جملوں میں وقفہ پذیر صورت کے استعمال سے غالب احساس یہ ہوتا ہے کہ کام عام طور پر ہر وقت جاری نہیں رہتا ہے، جیسے :

"حسن آرا : لوگ تو بات بات میں واللہ باللہ کہا

کرتے ہیں۔" (نذیر احمد۔ بنات النعش، ۱۰۸)

جب اس موقع پر طویل صورت کا صیغہ استعمال ہوتا ہے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ کام کے بار بار دہرانے میں وقفہ اتنا کم ہوتا ہے کہ کام کو ہوتے ہوئے کسی بھی وقت دیکھا جا سکتا ہے، جیسے:

"....سلیا بہن نہ جانے کیوں ہر دم روتی رہتی ہے۔"

(پریم چند: گودان، ۵۶۵)

وقفہ پذیر صورت میں وقفہ زیادہ بڑا ہوتا ہے۔

(ب) اسی طرح جب وقفہ پذیر صورت کے ساتھ "ہر روز" جیسے لفظ استعمال ہوتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ کام سچ مچ روزانہ ہوتا ہے۔ وقفہ پذیر صورت کے استعمال سے کام کے کبھی کبھی نہ ہونے کا امکان باقی رہتا ہے، جیسے:

"ہمارے محلے میں ایک آیا رہتی ہے وہ ہر سال اپنے صاحب کے ہمراہ پہاڑ پر جایا کرتی ہے ....."

(سرشار: سیر کہسار، جلد اول، ۱۵)

"..... دونوں وقت مفت میں پچھے سات گھروں کا سودا لادیا کرتی ہوں ....."

(نذیر احمد: بنات النعش، ۹۴)

"ہر روز" جیسے لفظ ہونے پر بھی وقفہ پذیر صورت کے استعمال سے عمومیت کا احساس جملے میں باقی رہتا ہے۔

جب جملے میں "ہر روز" "ہر سال" وغیرہ لفظ فعل کی طویل صورت کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں تو یہ احساس کہ کام عمومیت کے ساتھ

جاری رہتا ہے، ختم ہوکر، کام کے جاری رہنے کا اظہار شدید ہو جاتا ہے، جیسے:

"..... تم ہر روز کل کل کرتے رہتے ہو"۔

(پریم چند: منتر، ۲۹)

"اس کی عجیب زندگی کا معما اب بھی بحث و نظر کا ایک دلچسپ موضوع ہے، ہر دوسرے تیسرے سال کوئی نہ کوئی نئی کتاب نکلتی رہتی ہے"۔

(ابوالکلام آزاد: غبارِ خاطر، ۲۰۹)

(ج) حال کی وقفہ پذیر صورت سے ظاہر کیا ہوا کام بعض خاص حالتوں کے تابع ہوتا ہے اور اسی حالت کے بار بار پیدا ہونے پر بار بار دہرایا جاتا ہے، اس صورت میں بھی کام کے بار بار دہرائے جانے کی وجہ سے عمومیت یا عادت کا اظہار ہوتا ہے، جیسے:

"..... وہ کہیں جاتا ہے تو میں راستہ دیکھا کرتی ہوں....."

(شرر: قیس و لبنیٰ، ۱۵۰)

"میں جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مجھے عصمت کے چہرے پر وہی مٹا ہوا حجاب نظر آیا جو عام گھریلو لڑکیوں کے چہرے پر ناگفتنی شے کا نام سن کر نمودار ہوا کرتا ہے"۔

(منٹو: عصمت چغتائی، ۱۲)

"..... میں نے تو اپنا یہی قاعدہ رکھا ہے کہ لکھنے پڑھنے سے جتنا وقت بچتا ہے اس میں کچھ نہ کچھ کام کیا کرتی ہوں...."

(نذیر احمد: بنات النعش، ۵۴)

"برسات میں جو ایک رنگین کمان آسمان میں نکلا کرتی ہے، اس کی

حقیقت بھی یہی ہے کہ ......"

(نذیر احمد : بنات النعش ، ۱۲۹)

" بھائی ۔ کیا کہوں کچھ ایسی عادت ہو گئی ہے جس دن پسینا نہیں ملتا ، تمام بدن دکھا کرتا ہے ......"

(نذیر احمد : بنات النعش ، ۴۵)

(د) کام ایک خاص عرصے میں محدود ہوتا ہے ، جملے میں " دن بھر " " رات بھر " وغیرہ لفظ موجود ہوتے ہیں۔ اس سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہاں وقفہ پذیر صورت کام کے وقفے کے ساتھ ہونے کو ظاہر نہیں کرتی بلکہ کام کا تسلسل دکھاتی ہے ، لیکن دراصل ایسا نہیں بلکہ ان لفظوں کا مفہوم صرف یہ ہوتا ہے کہ کام اکثر حصے میں ہوا ، یعنی " دن بھر " کا مطلب محض یہ ہوگا کہ دن کے اکثر حصے میں کام ہوتا ہے ، جیسے :

" .... اور میں تو حضور دن رات انھیں کی صورت دیکھا کرتی ہوں ..."

(سرشار : سیر کہسار ، جلد اول ، ۱۷)

" روز صبح سے شام تک حاضر رہا کرتا ہوں ...."

شرر : قیس و لبنیٰ ، ۱۰۵)

" ان لوگوں سے ہندوستان کو ترقی کی امید نہ رکھنی چاہیے جو دنیا کو ترک کر کے پہاڑوں کی کھوہ میں جا کے بیٹھے ہیں ، یا جو رام رام کی گولیاں دن دن بھر لکھا کرتے ہیں تاکہ مچھلیوں کو نفع پہنچے ۔"

(سرشار : سیر کہسار ، جلد دوم ، ۱۶۵)

" دن بھر غل مچایا کرتے ہیں ۔"

(سرشار : سیر کہسار ، جلد دوم ، ۱۸۰)

وقفے کی نوعیت کے معنی اس وقت زیادہ واضح ہوں گے جب کہ ہم اس صیغے کا، حال کی طویل صورت کے صیغے سے موازنہ کریں جو اسی مناسب حالت کے لیے استعمال ہو سکتا ہے، جیسے:

"۔۔۔۔ دن بھر تمھاری اماں کچو کے دیتی رہتی ہیں ۔۔۔۔"

(عباس: پھچی پھچی ۱)

وقفہ پذیر صورت کا صیغہ کام کے تسلسل کے ساتھ ہونے کو ظاہر نہیں کرتا جب کہ طویل صورت کا استعمال، کام کے جاری رہنے پر زور دیتا ہے[۱]

---

[۱] طویل اور وقفہ پذیر صورت کے معنی، طویل وقفہ پذیر صورت کے صیغے میں باہم مل جاتے ہیں، جیسے:

پڑھتا رہا کرتا ہے۔

مگر یہ صیغہ پیچیدہ ہونے کی وجہ سے بہت کم استعمال ہوتا ہے، مثلاً:

"بھائی ذرا جلدی جلدی اپنی کشل کشیم لکھتے رہا کرو۔"

(سدرشن: بلدان، ۹۷)

"شاید وہ چاہتا تھا کہ حاکاں کا علم ادھورا ہی رہے تاکہ وہ تعجب کے مارے طفلانہ اداؤں کے ساتھ اُس سے اِس قسم کے سوالات دریافت کرتی رہا کرے۔"

(بلونت سنگھ: ڈاکو، ۴۲)

اس صیغے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وقفے کے ساتھ ہونے والے کام میں ہر بار کچھ وقت لگ جاتا ہے۔

حال کی وقفہ پذیر صورت
(کام کا وقفے کے ساتھ ہونا)

۱

کام عمومیت کے ساتھ کیا جاتا ہے، جیسے:
وہ (اکثر، کبھی کبھی) آیا کرتا ہے۔

۲

کام عام صداقت کے ساتھ کیا جاتا ہے، جیسے:
دونوں اسی طرح باتیں کر رہے تھے جیسے عاشق و معشوق کیا کرتے ہیں۔

۳

عادت:
"نہاتے وقت تم بہت دور تیر جایا کرتے ہو۔"
(پریم چند: بیوہ، ۲۳)

۴

بہ ظاہر مسلسل کام کے لیے جیسے:
۱- میں ہر وقت تجھے یاد کیا کرتا ہوں۔
۲- وہ ہر روز آیا کرتا ہے۔
۳- لکھنے پڑھنے سے جتنا وقت بچتا ہے، اس میں کچھ نہ کچھ کام کیا کرتی ہوں۔

۵

کام ایک خاص عرصے میں محدود ہوتا ہے، جملے میں مناسب لفظ موجود ہوتے ہیں، جیسے:
رات بھر کروٹیں بدلا کرتا ہوں۔

حال کی طویل صورت کے صیغے

حال کی طویل صورت کے دو صیغے ہیں :

۱۔ حال کی طویل صورت ۔

۲۔ حال کی طویل استمراری صورت۔

طویل صورت کے صیغوں سے کام کا برابر جاری رہنا دکھایا جاتا ہے۔

حال کی طویل صورت کی ساخت :

یہ صیغہ اصل فعل کے حالیہ ناتمام اور فعل "رہنا" کے حال مطلق کا مرکب ہوتا ہے ۔ جیسے : کرتا رہتا ہے۔

استعمال :

۱ حال کی طویل صورت ، کام کا موجودہ زمانے میں برابر ہوتے رہنا دکھاتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کام کا تسلسل اس انداز سے جاری ہو کہ اس کو ایک اکائی کے طور پر پیش کیا جا سکے ، بلکہ اہمیت اس احساس کے شامل ہونے کی ہوتی ہے کہ فاعل اکثر و بیشتر اس کام میں مشغول رہتا ہے۔ اس صیغے سے فاعل کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ کام کو تقریباً ہر بار ، ہمیشہ یا برابر ہوتے ہوئے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ کام کے اس تسلسل میں بولنے کا وقت بھی شامل ہو ، جیسے :

"حضور صاحب لوگوں سے ملتے رہتے ہیں بھلا کسی سے دریافت تو فرمائیے کہ ....." (سرشار : سیر کہسار ، جلد اول ، ۱۲)

"....جب دیکھو روپیہ مانگتی رہتی ہے ......"

(عباس : کچی کچی ، ۸۵)

"بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ مناتی رہتی ہیں کہ میاں مر جائیں تو گلچھرے اڑائیں۔"

(سرشار : کامنی ۵۱۱)

روسی زبان میں جو مطلب "ہمیشہ" "برابر" "ہرمنٹ" جیسے لفظوں سے ظاہر کیا جاتا ہے، اردو اور ہندی میں وہ فعل کی طویل صورت سے ظاہر ہوتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جملے میں "ہر وقت" "ہمیشہ" "لگاتار" وغیرہ استعمال نہیں ہو سکتے۔ یا ان کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ ان لفظوں کے استعمال سے طویل صورت کی مذکورہ خصوصیت زیادہ واضح ہو جاتی ہے یعنی فعل کے ذریعے ظاہر کیے ہوئے کام کا سلسلہ جاری رہتا ہے، جیسے،

"..... سماج میں اس طرح کے مسئلے ہمیشہ اٹھتے رہتے ہیں....."

(پریم چند: گودان، ۲۷۰)

"..... سلیا بہن نہ جانے کیوں ہر دم روتی رہتی ہے۔"

(پریم چند : گودان، ۵۶۵)

"عصمت پر لکھنے کے دورے پڑتے ہیں۔ نہ لکھے تو مہینوں گزر جاتے ہیں پر جب دورے پڑے تو سیکڑوں صفحے اس کے قلم کے نیچے سے نکل جاتے ہیں۔ کھانے پینے، نہانے دھونے کا کوئی ہوش نہیں رہتا۔ بس ہر وقت چارپائی پر کہنیوں کے بل اوندھی لیٹی اپنے ٹیڑھے میڑھے اعراب اور املا سے بے نیاز خط میں کاغذوں پر اپنے خیالات منتقل کرتی رہتی ہے۔"

(منٹو : عصمت چغتائی، ۱۵)

۲۔ حال کی طویل صورت کے صیغے سے کام کا فطری قوانین کے طور پر لگاتار ہونا ظاہر کیا جاتا ہے۔ ایسے کام میں ہمیشگی پائی جاتی ہے، جیسے :

"کیوں اور کس کی کھوج میں جل بہتا رہتا ہے اور ایک کشن نہیں ٹھہرتا؟" (نہرو : ہندوستان کی تلاش ، ۴۹)

"کوئی جاتی ایسی نہیں جو بدلتی نہ رہتی ہو۔ برابر وہ اوروں میں گھلتی ملتی اور بدلتی رہتی ہے۔" (نہرو۔ ہندوستان کی تلاش ، ۱۵)

۳۔ جو کام کسی خاص عرصے میں محدود ہوتے ہیں، یا کسی خاص وقت تک پہنچ کر ختم ہوتے ہیں، ان کے اظہار کے لیے بھی حال کی طویل صورت کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ اس کی دو شکلیں ہو سکتی ہیں :۔

الف ۔ حال کی طویل صورت، وقفے یا معمول کے ساتھ ہونے والے اس کام کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے جس کے گزرنے میں ہر بار کچھ وقت لگ جاتا ہے اور جس کا سلسلہ ختم ہو کر تمام ہوتا ہے۔ کام کتنی دیر تک ہوتا ہے اس کے اظہار کے لیے جملے میں خاص الفاظ موجود ہو سکتے ہیں۔ توجہ کا مرکز (منقطع یا غیر منقطع) کام کا عرصہ ہوتا ہے[لہ]، جیسے :

"جب سے رما آگیا ہے، بڈھے کو انگریزی پڑھنے کا شوق ہوگیا ہے۔

لہ حال کی طویل صورت کے اس استعمال کے معنی میں، حال مطلق کا استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن صیغے کی اس تبدیلی سے اندرونی خصوصیت ضرور متاثر ہوگی اور وہ یہ کہ کہنے والے کی توجہ کا مرکز کام کا عرصہ نہیں رہے گا، جیسے :

.... دن اور رات کوشش کرتے ہیں کہ گھڑی دو گھڑی آرام سے سو رہیں . . .

(نذیر احمد : بنات النعش ، ۴۹)

"یہ ہاتھ" میں نے سوچا جو صبح سے شام تک مسالا پیستے ہیں، پانی بھرتے ہیں، پیاز کاٹتے ہیں، بستر بچھاتے ہیں، جوتے صاف کرتے ہیں، یہ بے کس غلام صبح سے شام تک جٹے ہی رہتے ہیں۔ ان کی بے گار کب ختم ہوگی۔ (عصمت چغتائی : چوتھی کا جوڑا ، ۹۶)

سبیرے ہی پڑا مٹرے کر بیٹھ جاتا ہے اور نو دس بجے تک اکثر پڑھتا رہتا ہے۔"

(پریم چند: غبن، ۱۵۷)

"..... لالٹین جلاتی ہے اور واپس جاکر رات بھر اپنے جھونپڑے کے سامنے بیٹھی کرشنا کا انتظار کرتی رہتی ہے۔"

(عباس: دیا جلے ساری رات، ۳۸)

"آپ دو دو گھنٹے باتیں کرتی رہتی ہیں تب سر درد نہیں ہوتا ...."

(سدرشن: گھور پاپ، ۴۲)

ب ۔ حال کی طویل صورت اس کام کا گزر رہا ہونا ظاہر کرتی ہے جو ایک خاص حالت کے تحت اس حالت کے وقت میں ہی ہوتا ہے۔ زور کام کے مسلسل جاری رہنے پر ہوتا ہے۔ جیسے:

"مجھ بڑھیا کو معاف کرنا، بیٹا، میری آنکھیں دکھتی ہیں تو پانی نکلتا ہی رہتا ہے۔"

(عباس: آسمانی تلوار، ۱۰۰)

"جاڑوں میں ان کو دمے کا دورا ہو جاتا ہے۔ بے چارے جاڑوں بھر ایلشن اور سناٹوجن اور نہ جانے کون سے رس کھاتے رہتے ہیں، پر یہ روگ گلا نہیں چھوڑتا۔"

(پریم چند: غبن، ۱۳۸)

"یہ اس بالک کا آنند نہ تھا جس نے ماتا سے پیسے مانگ کر مٹھائی لی ہو بلکہ اس بالک کا جس نے پیسے چرا کر لی ہو۔ اسے مٹھائیاں میٹھی تو لگتی ہیں پر دل کانپتا رہتا ہے کہ کہیں گھر چلنے پر مار نہ پڑنے لگے۔"

(پریم چند: غبن، ۸۰ ۵)

حال کی طویل صورت

(کام کا تسلسل کے ساتھ ہوتے رہنا)

- کام ایک خاص عرصے میں محدود ہو کر گزرتا ہے۔ توجہ کا مرکز (منقطع یا غیر منقطع) کام کا عرصہ ہوتا ہے، جیسے:
  (الف) میرا لڑکا تین تین گھنٹے پڑھتا رہتا ہے۔
  (ب) جب ہم کھیلتے ہیں تو وہ چپٹی چپٹی نظروں سے ہمارا کھیل دیکھتا رہتا ہے۔
- کام ہمیشگی کے ساتھ یا کام کا فطری قوانین کے طور پر لگاتار ہونا، مثلاً:
  جل بہتا رہتا ہے۔
- کام کا بظاہر لگاتار ہونا، جیسے:
  وہ (ہر وقت، برابر) ہنستا رہتا ہے۔

حال کی طویل استمراری صورت کا صیغہ

صیغے کی ساخت:

حال کی طویل استمراری صورت کا صیغہ بنانے کے لیے اصل فعل کے حالیہ ناتمام اور فعل "آنا" یا "چلا آنا" کی حال کی استمراری صورت کو ترکیب دیا جاتا ہے، جیسے: کرتا آرہا ہے یا

کرتا چلا آرہا ہے۔[۱]

یہ صیغہ ماضی اور حال دونوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے، یعنی اس سے کام کا ماضی میں بہت دیر تک ہوتے رہنا اور اس کا حال میں جاری رہنا' دونوں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس صیغے کے استعمال کے لیے بولنے کے وقت کا شامل ہونا ضروری نہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ جملے میں ہوتے ہوئے کام کے آغاز کا وقت دیا جائے' جیسے :

"۔۔۔۔ بنیے کا قرضہ الگ چکاؤ، جو بیسوں برس سے ادا ہوتا آرہا ہے مگر آج تک پورا سود بھی ادا نہیں ہو سکا ۔۔۔۔"

(صالحہ عابد حسین : راہِ عمل، ۵۱)

"۔۔۔۔ تب سے تقدیر سے لڑتا جھگڑتا چلا آرہا ہوں ۔۔۔۔"

(پریم چند : حسن و شباب، ۲۹)

"یہ کہہ کر، وہ حقّے کی نے لے کر مجھے مارنے ہی والا تھا کہ میں وہاں سے بھاگا اور اب تک بھاگتا ہی چلا آرہا ہوں ۔۔۔۔۔"

(عباس : کہتے ہیں جس کو عشق، ۴۸)

---

[۱] ان صیغوں میں کبھی کبھی "آنا" کے حال کی استمراری صورت کی جگہ "آنا" کا حال مطلق استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے :

"آغا۔ بس تو اب اس سے ظاہر ہے کہ لباس اور وضع میں تغیر و تبدل سلف سے ہوتا آتا ہے۔" (سرشار، سیر کہسار، جلد دوم، ۱۲۱)

"۔۔۔ چاہے میری جان جاتی رہے، مگر دل کو تو خوشی ہے کہ ایک نئی شے دیکھیں گے، پہاڑ پہاڑ برسوں سے سنتے آتے ہیں۔" (سرشار : سیر کہسار جلد دوم، ۳۲)

"شاید سب سے پہلے یہ سوال اماں حوّا نے بادا آدم سے کیا ہوگا۔ اور تب سے آج تک ان کی بیٹیاں بادا آدم کے سپوتوں سے یہی سوال پوچھتی چلی آ رہی ہیں"۔[۱]

(صالحہ عابد حسین، راہِ عمل، ۱۳۴)

مختصر نتائج

حال کے تمام صیغوں کے نحوی استعمالوں پر غور کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ ان سے ظاہر کیے ہوئے کام تین حصوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں:

۱۔ وہ کام جو بولنے کے وقت ہوتا ہے۔

۲۔ وہ کام جو معمول کے ساتھ ہوتا ہے۔

۳۔ وہ کام جو اِن دنوں، آج کل ہوتا ہے۔

پہلے گروپ کے صیغوں میں استمراری صورت کے تمام صیغے شامل ہوتے ہیں یعنی حال کی استمراری صورت، حال کی ترقی پذیر استمراری صورت، اور حال کی طویل استمراری صورت۔

---

[۱] جب جملے میں کام کا آغاز بتایا جاتا ہے تو اس صیغے کے معنی حال کی استمراری صورت سے ظاہر ہو سکتے ہیں، جیسے:

"... مرد لوھرم اور روحانیت اور رشیوں کا سہارا لے کر اس معیار پر پہنچنے کے لیے صدیوں سے زور لگا رہا ہے، مگر اب تک کامیاب نہیں ہو سکا۔۔"

(پریم چند: گودان، ۲۶۲)

"... یہ رواج شروع ہی سے چلا آ رہا ہے..." (پریم چند: گودان، ۴۰۵)

حال مطلق اور حال کی ترقی پذیر صورت کے صیغے بھی انھیں معنوں میں استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ ان دو صیغوں اور حال کی استمراری صورت کے صیغوں میں جو فرق ہے وہ کام کی اندرونی خصوصیت میں چھپا ہے۔ استمراری صورت کے صیغوں میں توجہ کا مرکز کام کا تسلسل ہوتا ہے۔

حال مطلق اور حال کی ترقی پذیر صورت کے صیغوں میں کسی اندرونی کیفیت کا اظہار کیے بغیر کام کا ہونا دکھایا جاتا ہے، توجہ خود فاعل پر منعطف ہوتی ہے۔

دوسرے گروپ کے صیغوں میں حال مطلق، حال کی استمراری، ترقی پذیر، وقفہ پذیر، طویل اور طویل وقفہ پذیر صورت کے صیغے شامل کیے جا سکتے ہیں۔ ان صیغوں میں حال کی استمراری صورت کے صیغے کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ ہمیشگی کے ساتھ ہونے والے کاموں کے لیے استعمال ہو کر، خاص بولنے کے وقت پر زور دیتا ہے۔

تیسرے گروپ کے صیغوں میں حال مطلق کا صیغہ، حال کی ترقی پذیر صورت کا صیغہ اور حال کی استمراری صورت کے تمام صیغے شامل ہوتے ہیں۔ کام اُس موجودہ زمانے پر پھیلا ہوا دکھایا جاتا ہے جو آج کل، ان دنوں تک محدود ہو۔ چونکہ ایسے کام کا تسلسل ظاہر کیا جاتا ہے اس لیے اس کا اظہار عام طور پر استمراری صورت کے صیغوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ ترقی پذیر صورت کا صیغہ بھی معنی کے لحاظ سے استمراری صورت کے صیغوں سے بالکل قریب ہے۔ ترقی پذیری کی وجہ سے اس میں بھی تسلسل کا کچھ احساس ہوتا ہے۔

دیوانِ شاکر ناجی

ڈاکٹر فضل الحق

عہد محمد شاہ کی معاشی بدحالی، سماجی پستی اور سیاسی ابتری سے تاریخ ادب کا ہر طالب علم واقف ہے لیکن اس پُر آشوب دور کے متعلق یہ بات بھی عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ "اس ہمہ گیر پستی" کے دور میں ریختہ گوئی کو بلندی حاصل ہوئی۔ ولی کا دیوان پہنچنے سے پہلے ان کی غزلوں کے رنگ و آہنگ سے دلی کے ریختہ گو شعرا متاثر ہو رہے تھے۔ ولی کے دیوان نے ریختہ گوئی کا چلن عام اور معیار بلند کیا۔ آبرو، ناجی، حاتم اور مضمون نے "ایہام گوئی" (طرز تازہ) کی ابتدا کی۔ حاتم دیوان زادہ میں لکھتے ہیں :

"از سنہ یکہزار و بست و ہشت تا یکہزار و شصت و ہشت کہ قریب چہل سال باشد نقد عمر دریں فن صرف نمودہ"[1]

مصحفی تذکرۂ ہندی میں حاتم کا بیان اس طرح نقل کرتے ہیں :

"روزے پیش نقیر نقل می کرد کہ در سنہ دوم فردوس آرام گاہ دیوان ولی در

---

[1] سرگزشت حاتم ص ۲۲ : محی الدین قادری زور

شاہجہاں آباد آمد و اشعارش بر زبان خورد و بزرگ جاری گشتہ یا دوسہ کس کہ مراد از ناجیؔ و مضمونؔ و آبروؔ باشد، بنائے شعر ہندی را با یہام گوئی نہادہ داد معنی یابی و تلاش مضمون تازہ می دادیم۔"[۱]

دونوں بیانات کو دیکھتے ہوئے پروفیسر مسعود حسن رضوی دیوانِ فائزؔ دہلوی کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ :

"حاتمؔ ۱۱۲۸ھ سے فارسی میں شاعری کر رہے مگر جب محمد شاہی عہد کے دوسرے سال یعنی ۱۱۳۲ھ میں ولیؔ کا دیوان دہلی آیا اور ان کا کلام ہر طبقے میں مقبول ہوا تو حاتمؔ نے ناجیؔ، مضمونؔ اور آبروؔ کے ساتھ اُردو میں شعر کہنا شروع کیا۔"[۲]

حاتمؔ اور مصحفیؔ کے بیان سے کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حاتمؔ نے ۲ سنہ جلوس محمد شاہی میں ولیؔ کا دیوان دیکھنے کے بعد اُردو میں شعر کہنا شروع کیا بلکہ مصحفیؔ کے بیان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ" بنائے شعر ہندی را با یہام گوئی نہادہ داد معنی یابی و تلاش مضمون تازہ می دادیم۔"

اس بیان سے ہمیں ایہام گوئی کی ابتدا کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔ دہلی میں اُردو شاعری کی ابتدا دیوانِ ولیؔ کی آمد سے پہلے نہ صرف شروع ہو چکی تھی بلکہ ۱۱۳۲ھ کے لگ بھگ ایک دوسرے کی اچھی غزلوں پر طبع آزمائی بھی کرنے لگے تھے۔ حاتمؔ نے ۱۱۳۰ھ میں مظہرؔ جانِ جاناں کی طرح "آشیاں اپنا" ۱۱۳۱ھ میں مضمونؔ کی طرح "آ کر کرے اجالا" اور ولیؔ کی زمین "تاباں ہے اس نگہ سے مرے

۱۔ تذکرۂ ہندی مصحفی ص ۸۰

۲۔ دیوان فائزؔ دہلوی ص ۸

ول میں نورآج " میں غزلیں کہیں جو" دیوان زادہ" کے نسخوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان غزلوں کی تاریخوں کو غلط ثابت کیے بغیر مسعود حسن رضوی صاحب کے بیان کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں تک دیوان فائز کی اولیت کا مسئلہ ہے اس کے متعلق ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں :

" حاتم ... نے ۱۱۳۰ھ سے ۱۱۴۲ھ تک ولی، مضمون، شاکر ناجی، آبرو اور مظہر کی طرحوں پر غزلیں کہی ہیں۔ ان میں فائز کی طرح پر کوئی غزل نہیں اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کم ازکم اس دور میں فائز کا اُردو کلام مقبول خاص عام نہیں ہوا گو ان کے فارسی کلام نے شیخ علی حزیں سے بھی خراج تحسین وصول کیا ہے۔ اس بحث سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ فائز کو پہلا صاحبِ دیوان قرار دینے کے لیے ہمارے پاس قطعی اور مستحکم دلائل موجود نہیں ہیں۔ فائز کے بعد اولیت کے اعزاز کا حق ناجی یا آبرو کو ملنا چاہیے۔ حاتم کا دیوان دستیاب نہیں ہوتا صرف نظرثانی کے بعد مرتب کیا ہوا " دیوان زادہ" ملتا ہے ... ایسی صورت میں آبرو کا دیوان یقیناً شمالی ہند میں اُردو کا پہلا مستند دیوان ہے جو اب تک دریافت کیا جاسکا ہے[۱]۔"

مکرمی ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے حاتم کے ساتھ محمد شاکر ناجی کا نام نہیں لیا حالانکہ حاتم، میر تقی میر اور مصحفی کے بیانات دیکھنے کے بعد شمالی ہندوستان کے "پہلے" صاحب دیوان شاعر کے متعلق جب بھی کوئی فیصلہ کیا جائے گا تو فائز، حاتم آبرو کے ساتھ شاکر ناجی کو شریک کرنا ہوگا۔ شاکر ناجی کی مقبولیت کا اندازہ "دیوان زادہ" کی غزلوں سے ہوسکتا ہے۔ ۱۱۳۰ھ سے ۱۱۳۷ھ تک حاتم نے مظہر جانجاناں

---

[۱] دیوان آبرو مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن ص ۲۵

کی تین طرحوں "آشیاں اپنا" "خدا کے ہاتھ" "کام آیا" ولی کی سات طرحوں "نور آج" "خیال ہوتا ہے" "یار جاتا ہے" "مجھکو یاد ہے" "دل آشنائی" "کام ہے" "خدا بس ہے" مضمون کی دو طرحوں "آکر کرے اجالا" "ہمزا نو میرا" یکرنگ کی ایک طرح اور شاکر ناجی کی تین طرحوں "ویران ہوگیا" "مقتول ہوگیا" "کام تو کہہ لا" پر غزلیں کہیں۔ اس دور کی غزلوں کی تاریخی ترتیب دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۱۳۰ھ سے ۱۱۳۷ھ تک حاتم نے ولی کے بعد سب سے زیادہ غزلیں شاکر ناجی کی طرحوں پر لکھیں۔

میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے حاتم کے ساتھ شاکر ناجی کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ ان کا دیوان بھی ابھی تک دستیاب نہیں ہوتا تھا۔ دیوان شاکر ناجی کے نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کو ڈاکٹر مسعود حسن رضوی صاحب اور قاضی عبدالودود صاحب دیکھ چکے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے شاکر ناجی کے دیوان کا مائیکروفلم منگوایا تھا مگر ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری سے ایک دوسرے شاعر "شاکر" کے دیوان کا مائیکروفلم آیا۔ غالباً اسی لیے "دہلی میں اُردو شاعری کا فکری اور تہذیبی پس منظر" کے صفحہ ۲۹۷ پر ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی فہرست کا حوالہ دیتے ہوئے فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں:

"شاکر ناجی کے نام سے جو کلیات کا نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ہے وہ دراصل ناجی کا نہیں ہے بلکہ پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب مطلع فرماتے ہیں کہ ناجی کا دیوان کلکتہ میں ان کی نظر سے گزرا ہے۔"[1]

رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں دیوان شاکر ناجی کا نسخہ موجود ہے۔ جس کو

---

[1] ڈاکٹر محمد حسن: "دہلی میں اُردو شاعری کا فکری اور تہذیبی پس منظر" ص ۲۹۷ فٹ نوٹ

محترمہ فاطمہ محمود صاحبہ مرتب کر رہی تھیں۔ محترمی قاضی عبدالودود صاحب نے یہ نسخہ انھیں کے پاس دیکھا۔ اس نسخے میں اشعار کی مجموعی تعداد تقریباً دو ہزار دو سو ہے۔ جس میں ۳۴۸ غزلیں، دو مخمس اور پچیس قطعات ہیں۔ قطعات میں دو تین رباعی کے ذیل میں آسکتے ہیں۔ ان کی بحریں بابا طاہر اور اقبال کی رباعیوں کی طرح ہیں۔

دیوانِ شاکر ناجی کا یہ نسخہ انتہائی غلط نویس کاتب کا لکھا ہوا ہے جس نے مصرعوں میں حروف و الفاظ کی کمی اور زیادتی پر کوئی دھیان نہیں دیا ہے۔ ممکن ہے کہ دیوان کے جس نسخے کو کاتب نے سامنے رکھا یہ تمام غلطیاں اسی نسخے میں موجود ہوں۔ اس کا پڑھنا بہت دقّت طلب ہے۔ مخطوطے میں ترقیمہ نہ ہونے کی وجہ سے زمانۂ کتابت کا اندازہ بھی نہیں ہو سکتا۔ پہلے صفحے پر ایشیاٹک سوسائٹی کی مہر لگی ہوئی ہے۔ ایک طرف "دیوانِ شاکر ناجی" بزبان ہندی لکھا ہوا ہے اور دوسری سمت "کتاب دیوانِ ناجی" کے بعد لکھی ہوئی عبارت پڑھی نہیں جاتی۔ آخر میں ۱۲۱۹ھ مرقوم ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً دیوان کا یہ نسخہ ۱۲۱۹ھ میں لکھا گیا۔ اسی صفحے پر تین مہریں ہیں جو نوٹوا سٹاٹ میں پڑھی نہیں جا سکتی ہیں۔

دیوان شاکر ناجی کا دوسرا نسخہ سنٹرل لائبریری پٹیالہ میں ہے۔ اس مخطوطے میں بھی ترقیمہ نہ ہونے کی وجہ سے تاریخ کتابت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ دیوان کی ابتدا میں اسٹیٹ لائبریری کپور تھلہ کی مہر ہے جس میں "شری اکال سہائے تھال بہادر سنگھ" لکھا ہوا ہے۔ دوسری بیضاوی مہر فخرالدین حسین خاں کی ہے۔ غالباً یہ نسخہ سب سے پہلے فخرالدین حسین خاں کے پاس رہا، اس کے بعد کپور تھلہ لائبریری پہنچا۔ دیوان ناجی کے آخری صفحے کے بعد مختلف شعرا کے اشعار درج ہیں، جو کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے بہت کم پڑھے جا سکتے ہیں۔ ایک پہیلی بھی درج ہے

دیوان میں تقریباً دو ہزار پانچ سو اشعار ہیں۔ ایشیاٹک سوسائٹی کے نسخے میں غزلوں اور قطعات کے علاوہ صرف دو مخمس ہیں۔ نسخۂ پٹیالہ میں غزلوں اور قطعات کے ساتھ سات قصیدے، سات مرثیے، ایک واسوخت[1]، چار مخمسات اور متفرق اشعار ہیں۔ اس نسخے کا کاتب نسبتاً کم غلط نویس ہے۔

ایشیاٹک سوسائٹی اور پٹیالہ کے نسخوں کی غزلوں میں فرق پایا جاتا ہے۔ غزلوں کا بڑا حصہ مشترک ہے۔ مخمسات میں صرف دو مخمس دونوں نسخوں میں پائے جاتے ہیں۔ قصائد مراثی، واسوخت اور متفرق اشعار صرف نسخۂ پٹیالہ میں ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ دونوں نسخے کلیات یا دیوان کے مختلف نسخوں سے نقل کیے گئے۔ دیوان کے اندرونی شواہد دیکھتے ہوئے کسی شبہہ کی گنجایش نہیں باقی رہتی۔ مثلاً تذکروں میں جتنے اشعار ناجی کے نقل کیے گئے ہیں تمام و کمال دونوں نسخوں میں پائے جاتے ہیں۔ غزلوں کے اشعار میں آبرو کا ذکر ملتا ہے، اور مشہور بین نواز نعمت خاں پر ایک مخمس، نواب عمدة الملک امیر خاں انجام اور نوازش علی کی شان میں قصائد ہیں چند مثالیں درج ذیل ہیں:

آبرو سیں سنا ہے ناجی نے   آ دنے کی خبر قیامت ہے

ناجی سخن ہے خوب تیرا گرچہ مثل شمع
لیکن زبان مزے کی لگی آبرو کے ہاتھ

ناجی کا دل لپیٹ لیا آبرو نے کھول   آیا جو صبح نیند سوں اٹھ رسمسا ہوا

ناجی اس مسی دیاں کی آبرو لکھتا ہے شرح
برستا ہے خون ناحق اس گھٹا کاری سیں آج

---

[1] ہیئت کے اعتبار سے ترکیب بند اور مضمون کے لحاظ سے واسوخت ہے۔

محمد شاہ نواب عمدۃ الملک اور نوازش علی خاں کے ساتھ آتش دوری کی دوسری جانی پہچانی تاریخی شخصیتوں کا حوالہ بھی ملتا ہے۔ نعمت خاں بین نواز، ساہوجی مرہٹہ سردار اور رمضانی امرد کا ذکر لطف سے خالی نہیں۔ ناجی کی ایک غزل کا مطلع ہے

تعلق سیں برہ میں سست ہو جس کا قدم پہلا
وطے کب کر سکے افلاک سرگرداں کا نو محلا

اس کے مقطع میں ناجی نے فخریہ کہا ہے

جسے دعویٰ ہو ہم سیں ہمسری کا شعر میں ناجی
اسے کہتا ہوں بارے اس طرح کی اک غزل کہہ لا

حاتم اور آبرو کو ناجی کا یہ اندازِ گفتگو پسند نہیں آیا۔ ان دونوں شاعروں نے اسی زمین میں غزل کہی۔ مقطع درج ذیل ہے۔

آبرو : جوابوں میں غزل کے آبرو کیوں کھل کر آتا ہے
توایک ادنیٰ توجہ بیچ کہہ لیتا ہے مست کہہ لا

حاتم : نہ تھا ناجی کو لازم طعن کرنا ہر سخن گو پر
جواب اس غزل کا حاتم نہیں کچھ کام تو کہہ لا

ناجی عام طور پر مقطع میں اپنی شاعرانہ خوبیوں پر فخر کرتے ہیں۔ کہیں اپنے ریختہ کو محکم اساس اور اپنی بات کو بانیٔ ایہام کہتے ہیں ؎

ریختہ ناجی کا ہے محکم اساس
بات میری بانیٔ ایہام ہے

یا

ناجی کے شعر سب ہیں توحید اور نصائح
شرکت نہیں ہے مجھ کو اوسان سے کسی کے

حاتم نے ایک دوسری غزل میں ناجی کے "فخریہ انداز" کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے ؎

سخن میں فخر اپنا بن کہے رہتا نہیں ناجی
اوسے سمجھائے حاتم کس طرح اشعار کہہ کہہ کر

نیز تقی میر نے تذکرہ نکات الشعرا میں ناجی کو ہزل گو لکھا ہے[1]۔ قائم مخزن نکات میں لکھتے ہیں کہ "مزاجش خیلے مائل بہ مزاح بود"[2]۔ اس بیان کی تصدیق ناجی کے اشعار سے ہوتی ہے۔

ناجی کی ظرافت اور بذلہ سنجی کا ذکر معاصر تذکرہ نگاروں اور شاعروں کے یہاں ملتا ہے۔ نواب عمدۃ الملک امیر خاں انجام کی بذلہ سنجی اور ظرافت کا ذکر بھی تذکروں اور تاریخوں میں ملتا ہے۔ ایک دن نواب برہان الملک سعادت خاں اور امیر خاں محمد شاہ کے حضور میں بیٹھے ہوئے تھے۔ برہان الملک نے امیر خاں انجام پر طنز کیا ؎

پسر نوح بابداں بنشست
خاندان نبوتش گم شد

امیر خاں نے شعر سنتے ہی جواب دیا ؎

سگ اصحاب کہف روزی چند
پی نیکاں گرفت مردم شد

ایک بار نواب امیر خاں انجام مرہٹوں سے ہزیمت اٹھا کر واپس آگئے تو نواب عمدۃ الملک امیر خاں نے فرمایا ؎

---

[1] نکات الشعرا ص ۲۳ [2] مخزن نکات ص ۱۹

نواب آئے ہمارے بھاگ آئے

نواب امیر خاں کی بذلہ سنجی، سخن پروری، بزم آرائی، اہلِ کمال کی دلجوئی اور سرپرستی کی شہادت تمام تاریخ نویسوں اور تذکرہ نگاروں نے دی ہے۔ حاتم اور ناجی اسی سرکار سے متعلق تھے۔ ان محفلوں میں شریک ہوتے رہے ہوں گے جہاں رقص و سرود سے فریفتگی، شعر و سخن سے وابستگی کے ساتھ جگت بازی اور بدیہہ گوئی کا رواج عام تھا۔

امیر خاں انجام کی سرکار کا سہارا نہ ہوتا تو شاید ناجی ایسے اشعار کبھی نہ کہتے

سہ مانگے ہے جو تو دل کی دکھنی بجا کے باجا
وہ دل کا چور لڑکا گویا ہے سا ہو راجا

تہیں غم بادشاہ ہند کوں سب ملک ڈوبے کا
مگر اک رہ گیا ہے خیال اوسے ٹھٹھے کے صوبے کا

موت کے نام سیں ڈرتا ہے امیروں کا جو دل
موت ہوتی ہے انھوں کے تئیں اول منزل

بڑے غافل ہیں صاحب نوبت اور سب ہند کے راجے
نکلتے نئیں علاقوں سیں مگر جب سر پہ آ باجے

ہے بجا ناجی جو ہوں عزلت نشیں ارکان ہند
دور اعدا کا تصرف متصل سب صرف خاص

بکاول کو کیا ہے منع اور مجھ کو دلاسا ہے
دوا کھاتے ہیں کھانا نئیں امیروں کا یہ خاصا ہے

ناجی صرف اپنے دور کے ایہام گو شعرا میں اولیت کا درجہ ہی نہیں رکھتے بلکہ اس دور کی سماجی خرابیوں اور شخصی کمزوریوں پر خوبصورت انداز سے طنز کرنے کا فن بھی جانتے ہیں۔ اس دور کے شعرا مثلاً آبرو، حاتم اور مضمون وغیرہ کا کلام اپنے عہد اور خود شاعر کی ذہنی اور جذباتی دنیا کی فتح و شکست، حسرت و آرزو اور ذوق و جستجو کا آئینہ ہے۔ اس دور کے ادبی سرمایے کی صرف تاریخی اور لسانی اہمیت ہی نہیں، ادبی اور سماجی حیثیت بھی ہے۔

ہمارے تذکرہ نگاروں اور ناقدوں نے ایہام کو ستم کہا ہے۔ میر تقی میر کے زمانے سے مولانا محمد حسین آزاد تک ہر شخص ایہام گوئی کی خامیاں بیان کر کے تنقید کا حق ادا کرتا رہا ہے۔ بہت کم ناقد ایسے ہیں جنھوں نے اس کی تاریخی اہمیت اور ایہام گو شعرا کی ادبی خدمت کے ساتھ انصاف کیا ہو۔ ڈاکٹر محمد حسن اپنی کتاب "دہلی میں اُردو شاعری کا فکری اور سماجی پس منظر" میں ایہام گو شعرا کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایہام گو شعرا کی خدمات نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ ایہام گوئی صرف طرزِ سخن نہیں تھا بلکہ اس نے الفاظ کے دروبست کا سلیقہ سکھایا، ان کی معنوی نزاکتوں کی طرف توجہ مبذول کرائی اور ان کے لطیف امتیازات کو برتنے کا ہنر سکھایا۔ ربطِ کلام، ترتیب الفاظ اور صنعت گری کے اسلوب قائم کیے[1]"

---

[1] دہلی میں اُردو شاعری کا فکری اور تہذیبی پس منظر۔ ص ۲۹۶

اس میں شک نہیں کہ "ایہام گوئی" صنعت گری اور آرائشگی کے لیے راہیں کھول دیتی ہے جس سے شاعری کی بے ساختگی اور جذبات نگاری مجروح ہوتی۔ ناجی بھی اس صنعت گری سے دامن نہ بچا سکے لیکن اس کے باوجود ان کے اشعار میں سادگی اور دلکشی کی جھلکیاں نظر آجاتی ہیں۔ ناجی نے اکثر مرکب الفاظ کو مفرد معنی میں استعمال کیا ہے۔ اس سے عمدگی کا ایک پہلو ضرور چمک اٹھتا ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں :

کیوں منڈاتا ہے زلف کو پیارے
دیکھ تجھ کو کہیں گے سب مورکھ

تو کیوں کھاتا نہیں ہے بیڑۂ پاں لے بتِ رنگیں
کہ ہرگز ڈر نہیں ہے عاشقاں کو جاں سپاری کا

ناجی بانیٔ ایہام گوئی تھے اسی لیے ان کے کلام میں آبرو اور حاتم وغیرہ سے زیادہ معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ معاشی حیثیت سے وہ اپنے معاصرین میں زیادہ پریشاں حال رہے۔ غالباً اسی لیے خواص کے ساتھ عوام کی محفلوں میں شریک رہے جس کا ثبوت ان کے کلام میں ملتا ہے۔ مثلاً

نہ پہنچے مجھ تلک ناصح پھسل جاوے مرے آگے
ہوا ہے گردِ غم اور اشک حسرت کا ایتا چہلا

اک بار جو بغل میں لوں اس سرو قد کتیں
بالا بتاوں خضر کی عمرِ ابد کتیں

جان یک دم نہ مجھ کنے ٹھہرا   اب تو سانسا پڑا ہے جینے کا

عوام سے اسی قربت کی بنا پر ان کے اشعار وردِ خاص و عام تھے۔
ہندی الفاظ اور ہند و تلمیحات اور اصطلاحات کا استعمال اس دور میں عام تھا کنہیا، کرشن، راون، جوگن، جوت، گیان، برہ، برکھا، بیورا، برن، بدھ، برہمن، سوہن، موہن، نین، اگن، رکت، مرم، چھب، کال، لٹکا، من ہرن، جگت، چندن، رین، من، چھل کا استعمال ابرو حاتم اور مضمون کے یہاں بھی عام ہے۔ مگر جدھر، سرس، بلہاری، کھٹو، بامہن، پوتھی، کنچنی، بوٹی، جنم پتری، ترنا، مٹھا، چھند، لپاٹی، لہری، کیسری، چھندی، سمرن، مکٹ، نچھن، جیبھ، ابرن، سوانگ اور مٹھا جیسے الفاظ دوسرے شعرا کے دواوین میں بہت کم نظر آتے ہیں۔ ناجی نے ہندی اصطلاحات اور الفاظ کو بڑے خوبصورت انداز سے پیش کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس دور کی عوامی زبان سے واقف ہی نہیں رمز شناس بھی تھے، یہ اسی وقت ممکن ہے جب شاعر اور عوام کی عام زندگی اور معاشی حیثیت میں کوئی فرق نہ ہو، کعبہ نینی، آہو نین، عارض تل، نرگس نین، حسنِ رہ گذری اور اس قسم کی ترکیبوں سے عام شاعرانہ چلن" یا" دستور زمانہ" کا پتہ چلتا ہے مگر کنیا نا، لپاٹی، کٹیلا، چھلا، پالا نباتا، درس رین، جگت کیسر جیسی ترکیبوں اور الفاظ سے ناجی کی سماجی حیثیت اور ذہنی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے، جو انھیں دوسرے شعرا سے ممتاز کرتا ہے۔ ان کے دیوان میں حاتم اور ابرو سے کئی گنا زیادہ ہندی الفاظ حسین اور دلکش انداز میں استعمال کیے گئے ہیں۔

ناجی کے عہد کی ادبی زبان پر ہندی کے علاوہ دکنی اور پنجابی دونوں زبانوں کے اثرات نظر آتے ہیں۔ مثلاً ڈ اور ڑ کے استعمال میں اور جمع

بنانے کے قاعدے یہ اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ خواہ جمع بنانے کا قاعدہ ہو یا "ڑ" کو "ڈ" سے بدلنے کا رواج، یہ مثالیں اول تو کم ہیں دوم ان کے اثرات براہ راست دہلوی شعرا پر کم ہوئے بلکہ "دکنی اُردو" کے سہارے ان کا اثر ہوا۔ جس طرح ناجی وغیرہ نے 'سے' کی جگہ سیں، سیتی، سوں 'اتنا' کے بجائے ایتا، 'کو' کے بجائے 'کوں'، اب تک کے بجائے ابلگ یا اب ملک، 'ہر دن' کی جگہ نس دن، جگہ کے لیے جاگہ، ادھر کی جگہ ایدھر، 'کو' کی جگہ پر 'کے تئیں' اپنایا۔ اسی طرح فعل سے اسم اور پنجابی جمع بنانے کا قاعدہ بھی اختیار کر لیا۔ جس کو اسی دور کے شعرا نے ترک کرنا شروع کر دیا تھا۔

حاتم نے اصلاح زبان کے سلسلے میں جو کوشش کی اور 'دیوان زادہ' کے دیباچے میں جو کچھ تحریر کیا ہے۔ آبرو اور ناجی کے کلام میں ان کی پابندی نظر نہیں آتی۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ حاتم کی اصلاحی تحریک معاصرین پر بہت کم اثر انداز ہوئی۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے شاگردوں اور نوجوانوں میں اس کا بہت زیادہ اثر ہوا۔ اور جس طرح ولی کی 'سحر کاری' سے بچنے کے لیے دہلی کے نوجوان شعرا حاتم، آبرو اور ناجی نے ایہام گوئی کو اپنایا۔ اسی طرح حاتم کے شاگردوں نے 'ایہام گو شعرا' کی مخالفت کی، ان کی خامیوں کے ساتھ خوبیوں کو بھی فراموش کر دیا گیا۔ اس سلسلے میں حاتم سے زیادہ میر تقی میر اور قائم نے کارنامہ انجام دیا۔ حالانکہ آبرو اور ناجی کے دیوان میں "ایہام گوئی" کے ساتھ کاروبار شوق کا بیان، داستان دل کی معصومانہ تشریح، وصل و اختلاط کی جھلکیاں، وفاؤں اور بیوفائیوں کا بیان، زمانے کی شکایت، دوستوں سے نوک جھونک، غرض کون سا ایسا موضوع ہے جسے ناجی اور آبرو نے

دلکش انداز میں بیان نہ کیا ہو۔ ان کی شاعری عظیم نہ سہی لیکن اس میں ایسی خوبیاں ضرور پائی جاتی ہیں جن کو سمجھے بغیر محمد شاہ اور ان کے عہد کی ادبی تاریخ ہی نامکمل نہیں رہے گی بلکہ ہم ان ادبی کارناموں کو بھی سمجھنے سے قاصر رہیں گے جن کو عظیم ادبی سرمایہ سمجھتے ہیں۔ ناجی کی چند غزلیں درج ذیل ہیں۔

نمکیں حسن دیکھ کر پی کا　　رنگ گل کا لگا مجھے پھیکا
کیونکہ مارا نگہ کا چنگا ہو　　زخم کاری لگا ہے برچھی کا
تو تو آیا ہو کر بسنتی پوش　　حال ٹک پوچھ اب مرے جی کا
ہنسنے سیں یہ چمک ہے دانتوں کی　　یا اوجالا شفق میں بجلی کا
تل سیاہی کا کیوں بنایا ہے　　دور کر رخ سیں نیل کا ٹیکا
تیرے میٹھے لباں کا سنکر وصف　　ہو گیا رنگ زرد مصری کا

سب مل اوس کو کہیں مبارکباد
نام پوچھا پیا نے ناجی کا

دہن جب لال ہو پانوں سیں پی کا　　خدا حافظ ہے تب غنچے کے جی کا
ترے رخسار کے پرتو سیں اے شوخ　　پری خانہ ہوا گھر آرسی کا
نہ ہمت ہار گلرو دے دے بوسا　　بڑا کہتے ہیں رتبا ہے سخی کا
برہ نے دل اوپر چھایا ہے بنگلا　　گھٹا میں شور سن تجھ بانسری کا

بلندی سن کے ناجی ریختے کی
ہوا ہے پست شہرا فارسی کا

دل اپنے قبضے کر ابرو کے گوشہ گیروں کا　　وہاں مت لے صنم زلف کے اسیروں کا
تیری نگاہ کی کثرت سیں اے کماں ابرو　　ہمن کے سینے میں تودا ہوا ہے تیروں کا
سفید تیغ سجے ہے تجھے اے سیمیں تن　　خیال دل میں نہ رکھ تو زری کے چیروں کا
سوائے گنجفے نہیں انکو تک دریں کی بوجھ　　عجب تماشا ہے اس دور کے امیروں کا
بھاوے ہے دل عاشق کوں تجھ دریں کی قدر　　کہ جوہری سیں چھپا کب ہے بھاو ہیروں کا
ہوا ہے نعمت کونین سیں غنی ناجی
جو صدق دل سیتی خادم ہوا فقیروں کا

جو کوئی ہو مبتلا اوس گلبدن کا　　تماشا اوس کو ہے دوزخ چمن کا
صباحت دیکھ اوس کے رخ کی تڑکا　　سحر کے وقت سینا نسترن کا
غزالے دیکھ اوسے گئے چوکڑی سی بھول　　جو کوئی وحشی ہوا اوس من ہرن کا
لیا ہے زلف کے پیچوں میں ہل مل　　بھواں تیری نے شیوا بانکپن کا
قدح خواری نظر میں اوس کی ہے عیب　　جو ہے مدہوش اوس نرگس نین کا
جو عاشق پاکبازے ہووتے ہیں　　نہ میلا رنگ ہوا اون کے کفن کا
صفت خورشید رو کی سن کے ناجی
فلک ہے مشتری میرے سخن کا

روٹھا ہے اب وہ یار جو ہم سیں جدا نہ تھا
یوں بے وفا ہوا کہ گویا آشنا نہ تھا
تب جور عشق کب یہ بلا کی نظر میں تھی
جب تک پری رخاں کا یہ دل آشنا نہ تھا

یوں لعل لب کوں بند کیا مجھ طرف سیتیں
گویا تو ہم سیں بولتا پیارے سدا نہ تھا
ناجی کا پاس چھوڑ کے اے سنگدل صنم
کیا گئے تھے تم سمجھ کے ہمارا خدا نہ تھا

جمال دیکھ کے اوس آفتاب انور کا | گھٹا فلک کے اوپر حسن ہر ایک اختر کا
بغیر دام ہے ملنا محال خوباں سیں | برا سا پیچ ہے سیں براں کنے زر کا
مدام دل سیتی او سکے نہ چھوٹے مئے کا خیال | مزا پڑا ہو جسے تیرے لب کے ساغر کا
سیاہ مست اوٹھے گا و بزم محشر میں | جو کوئی شہید ہے تیری نگہ کے خنجر کا
لعیم ہے جو نہ دے گنج حسن کی و ذکات | سر او سکے خاک جو دل تنگ ہو تونگر کا

ہوا عرق سیں رخ اوسکا مرصع اے ناجی
رکھے ہے بسکہ ہر اک قطرہ حکم گوہر کا

صنم کی زلف میرے دل کوں دے ہے بل ہر شب
رہے ہے خوف سیں اس مار کے خلل ہر شب
جو کچھ کہ مہر سیں وعدا کیا تھا مہرو نے
جو ہو ہے شام بتاتا ہے مجھ کوں کل ہر شب
عجب اثر ہے نظر بیچ اوس پری رو کی
جھمک دکھا کے دے جاتا ہے مجھ کوں چھل ہر شب
سنے سیں تال پکھاوج کی اب صدا ناجی
خوشی ہو دل کا کھلے ہے میرے کنول ہر شب

کرے نثار تجھ انکھیاں پہ نقد جاں نرگس
کہ تیری چشم سیں ہم چشم ہو کہاں نرگس

گلابی دیکھ تیرے مونہہ اوپر انکھیاں کا خمار
بھرے ہے رنگ سیں اپنی کٹوریاں نرگس

ادٹھے ہے سبز عصا لے کے باغ میں از بس
نگہ تیری سیں ہے بیمار و ناتواں نرگس

نظر میں کر کے تجھ انکھیاں سیں ہر شہید کا خون
سدا نکالے ہے گلبانگ الاماں نرگس

بجا ہے دل کے گرانے پہ نئیں نظر ناجی
کہ کر رہی ہے چمن بیچ اب سماں نرگس

برباد کر کے اپنے تئیں ہر سحر نسیم
کرتی ہے باغ حسن میں اوسکے گزر نسیم

کرتی ہے جا کے دامن گل کوں عرق سیں تر
رخسار پر رکھے ہے جب اوسکے نظر نسیم

گستاخ ہو کے کس روش آتی ہر باغ میں
رکھتی نہیں ہے نزہت گل کی خبر نسیم

غافل کوں بادکش ہے ہنر ورد کئیں جرس
ہر صبح اس فریب کو کرتی ہے سر نسیم

یہ دور گذرا کبھی نہ دیکھی پیا کی انکھیاں خمار منیاں
کہتے تھے مردم شرابی ان کو نکل گئیں ایسی دے غلطیاں

سوائے گل کے وہ شوخ انکھیاں کسی طرف کو نہیں ہیں مائل
تو برگ نرگس اوپر بجا ہے لکھوں جو اپنے سجن کو بتیاں

م کی زلفاں کے ہجر میں اب گئے ہیں مجھ میں سیں خواب راحت
لگے ہے کانٹا نظر میں سونا کٹیں گی کیسے یہ کالی رتیاں

مع رو کے دو لب ہیں شیریں تو سبزہ خط بجا ہے اس پر
زمین پکڑی ہے طوطیوں نے سنی جو میٹھی پیا کی بتیاں

نیال کر کر ٹھہر رہا ہوں نظر جو آئے تیور ہیں بانکے
بناو بنتا نہیں ہے ناجی جو اس سجن کو لگاو چھتیاں

د کرم اے مہرباں پھر تم کہاں اور ہم کہاں
نئیں دیکھ سکتا آسماں پھر تم کہاں اور ہم کہاں

غ و بہار و جام مئے گلگوں قبائے فصلِ دئے
بوجھو غنیمت یہ سماں پھر تم کہاں اور ہم کہاں

ل ہے جبتک ہے یہ گل دو روز کا ہے شور و غل
سب ہوں گے اپنے آشیاں پھر تم کہاں اور ہم کہاں

ب کے تھکے ہیں ماہ رو مل جا گلے اے ماہ رو
اب صبح کی ہو ہے اذاں پھر تم کہاں اور ہم کہاں

ناجی کا دل یکرنگ ہے کیوں تمکوں اس سیں جنگ ہے
چھتیوں سیں لگ جاو میاں پھر تم کہاں اور ہم کہاں

بجن یہ باغ ہے ٹک لب کوں کھولو اگر ہم سیں نہیں پھولوں سیں بولو
لب میں زر کی مت جاو ہمیں چھوڑ مجھ انجھواں کے گہر انکھیاں سیں رولو
رہو تجھ حلقہ ابرو سیں باہر نگہ کے تیر سیں اس کو پرولو

مخالف جل گیا جب شوخ رد نے کہا بوسے کے مانگے روبرو لو
گئے سب دین و دل لے کر۔ ہا کیا
جو کچھ نا جی سکنے پایا اور ہو لو

فرمادے اگر کام سجن جلوہ گری کو
سب اوس کے پرستار کہیں ملکے پری کو
مرنے سیتی پیروں کے جوانوں کا نہیں داغ
گل کرتے ہیں آخر تو چراغ سحری کو
ترک سروسامان ہے آرایش باطن
ظاہر کی جلا عیب ہے دنیا کے بری کو
خورشید کو ایک زرہ نہ ہو تاب نظر کی
دکھلاوے اگر صبح و دستار زری کو

منہدی ہو جا لگا ہے دل اوس گلبدن کے ہاتھ
پہنچی ہے خوب طرح حنا کی سجن کے ہاتھ
کوچے میں اوس کے رام ہو آہو نین ہیں جمع
ڈوری ہے عاشقاں کی جو اوس من ہرن کے ہاتھ
سکتا نہیں ہے دیکھ دو یاروں کو ایک جاے
ہے وصل ماہ رو کا کمینے گگن کے ہاتھ
شیریں لباں کے وصف کو لکھنے سیں دمبدم
کیا نیشکر ہوا ہے قلم اب ہمن کے ہاتھ

ناجی نے زر بکھیر کے سودا کیا نہ کچھ
آخر لگا ہے جا کے اب اوس سیم تن کے ہاتھ

عبث کھویا تو اپنا سرو پہ بالاپن اے قمری
کبھی بوجھی نہ اوس سرکش نے تیری بیدن اے قمری
لگا کر سرو سیں دل ہم نے تو کچھ پھل نہیں پایا
تو اپنی کہہ کہ ناحق کیوں ہوئی ہے دشمن اے قمری
رہی تو باغ میں اور ہم کو پالا دے نکلوایا
بھلا محشر میں میرا دست تیرا دامن اے قمری
وہ سرو جامہ زیب آکر چمن میں پھل گیا تجھکوں
تبھی تو فاختائی ہے تیرا پیراہن اے قمری
بغل میں یوں پلا کر جام مئے اوس سرو دل جوکو
تو راضی ہو نہ ہو میرا تو ہے اب یوں من اے قمری
جو تو محرم نہیں تو سیکھ لے ناجی سیتی نالا
کہ ہے اس عشقبازی کا نپٹ مشکل فن اے قمری

پریشانی سیں غم کی کیا کہوں اس پہ کہ کیا گزری
کلی گلشن میں ہنسکر ہم سیں جو کہنا تھی کہہ گذری
تغافل باغباں کا نئیں فقط اور گل کی نیرنگی
بہار آنے تلک بلبل ہزار اوقات سہہ گذری

حیات جاوداں ہے ہند کے سبزوں کا نظارہ
جو عاشق نئیں تو عمر خضر میں پوچھا تبہ گذری

اگر ہم چشم دولت مند ہو چشم کرم مت رکھ
صدف پیاسی رہی ہر چند موتی پاس بہ گذری

اٹھتا نہیں میرا دل ماہ رو کوں جو کہیں دیکھے
خوش آوے کس طرح تا جی کوں ایسا حسن رہ گذری

محمد امان نثار

جناب مغیث الدین فریدی

محمد امان نثار کے اُردو دیوان کا ایک نسخہ مجھے ملا ہے، جو ناقص الاول بھی ہے اور ناقص الآخر بھی۔ یہ کرم خوردہ نسخہ ۹۲۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتابت صاف اور روشن ہے لیکن کاتب غلط نویس ہے مثلاً التفات کو (الطفات) فی الفور کو (فلفور) لکھتا ہے۔ اس کے اول و آخر سے کتنے صفحات غائب ہوئے ہیں، اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ پھر بھی ۳۹ رباعیاں اور ایک ہزار سے زیادہ غزلیں دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ گئی ہیں۔ کرم خوردہ اوراق کے بھی اکثر اشعار صاف پڑھے جا سکتے ہیں۔

محمد امان نثار، میر تقی میر کے ہم عصر اور شاہ حاتم کے شاگرد تھے۔ عمدۂ منتخبہ اور مجموعۂ نغز میں نثار کے جتنے اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے گئے ہیں، اُن کی مکمل غزلیں اس دیوان میں موجود ہیں۔

نثار کی غزلوں کی زبان پر شاہ حاتم کی اصلاحی تحریک کا اثر کافی نمایاں ہے۔ خیال کی نزاکت اور جذبے کی گرمی تو ان غزلوں میں نہیں ہے مگر زبان کی صفائی اور بندش کی چستی ضرور قابلِ داد ہے۔ مجموعۂ نغز اور آبِ حیات میں انھیں میر کا

حریف بنا کر پیش کیا گیا ہے مگر اس نسخے میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ملا جس میں تمیر پہ طنز کی گئی ہو یا میر کی برابری کا دعویٰ ہو۔ اجگر نامہ (اژدر نامہ) کے ضمن میں مجموعۂ نغز اور آبِ حیات میں جس فی البدیہہ غزل (قطعہ) کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس دیوان میں موجود ہے مگر اس کے مقطع کی وہ شکل نہیں ہے جو آبِ حیات میں دی گئی ہے۔

آبِ حیات میں مقطع اس طرح ہے:

حیدرِ کرار نے وہ زور بخشا ہے نثارؔ
ایک دم میں دو کردوں اژدر کے کلّے چیر کر

اس نسخے میں یہ مقطع یوں ہے:

حیدرِ کرار نے وہ زور بخشا ہے نثارؔ
ایک پل میں دو کردوں اجگر کے جبڑے چیر کے

اس طرح کا جزوی اختلاف تذکروں کے اشعار اور اس نسخے کے اشعار میں اور بھی ملتا ہے۔

شب کو وہ کوٹھوں ہی کوٹھوں گھر ہمارے آ رہا
غیر دروازے پہ بیٹھا راہ ہی تکتا رہا

(میر حسن)

غیر کا جاسوس بیٹھا راہ ہی تکتا رہا
شب کو وہ کوٹھوں ہی کوٹھوں گھر ہمارے آ رہا

(دیوانِ نثار)

شاہ حاتم سے انھیں بے حد عقیدت تھی اس کا اظہار جا بجا کیا گیا ہے۔

سایل سے نہ دل کے تو منہ پھیر نثار اپنا
شاگرد اگر سچ ہے تو حضرتِ حاتم کا

اس برابر کون سی دولت ہے دنیا میں نثار
حضرتِ حاتم کا یہ کہنا تجھے شاباش کا

استاد تھے جہاں میں سبھی لیکن اے نثار
جو کچھ نظر پڑا ہمیں حاتم نظر پڑا

دیا استاد حاتم سا نثار اللہ نے مجھ کو
کیا کرتا ہوں سجدے شکر کے درگاہِ عالی میں

میر کی زمینوں میں نثار نے اکثر غزلیں کہی ہیں۔ اسی بنا پر انھیں میر کا حریف سمجھا گیا ہے۔ مگر کوئی قافیہ ایسا نہیں ہے جسے نثار نے میر سے بہتر کہا ہو۔
اس دیوان میں دو ایسی غزلیں بھی ملتی ہیں جن کی زمینیں مصحفی کی بدولت مشہور ہوئیں۔ مصحفی کہتے ہیں:

پانی بھرے ہے یار وہاں قرمزی دوشالا
ننگی کی سج دکھا کر سقنی نے مار ڈالا

نثار کہتے ہیں۔

جھمکا رہا تھا گردوں خورشید کا پیالا
کھڑکا کے دو کٹورے سقنی نے مار ڈالا

مصحفی۔

پانی میں نگاریں کفِ پا اور بھی چمکا
بھیگے سے ترا رنگ حنا اور بھی چمکا

نثار۔

مے تو نے جو پی، رنگ ترا اور بھی چمکا
جیسے کہ نگیں ڈانک لگا اور بھی چمکا

اس دیوان کی مختلف ردیفوں سے چند غزلوں اور چند رباعیوں کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

انتخابِ غزلیات

ایسا ہے جامۂ تن غم سے حقیر میرا — ہنستا ہے آئینہ میں مجکو نظیر میرا
منکر جو ہووے تجھ سے منکر ہے وہ خدا کا — اے عشق تو ہے مرشد اور تو ہے پیر میرا
تیغِ نگہ ہے اوسکی سرگرم قتل جب سے — وردِ زباں رہے ہے جوشن کبیر میرا
کوچہ سے تیرے اوٹھنا ہوتا نہیں جو اپنا — ہے مُشت گل سے یاں کی شاید خمیر میرا
دل کی نہیں ہے مرضی کیا جاؤں اس گلی سے — دیتا نہیں ہے رخصت مجکو مشیر میرا
دیوانہ پن کی مجھ کو ہے سلطنت میسر — ہے بید چتر میرا صحرا سریر میرا
ہر دم سوال اوس سے بوسے کا کیا کروں میں — ایسا ہی دل نہیں ہے یارو فقیر میرا
کس رنگ کس روش سے آزاد میں کہاؤں — زلفِ سمنبراں کا دل ہے اسیر میرا
ملتا ہوں میں جبیں سے اس واسطے یہ مٹی — ہے خاکِ راہ اوس کی مشک و عبیر میرا

دل تک نثار اوس کے پہونچے ہے آہ کوئی
اب ضعف سے ویسے ہی گرتا ہے تیر میرا

یاں آکے جو کام کچھ نہ نکلا — دنیا کا قیام کچھ نہ نکلا
کی مشقِ نگیں میں سینہ کاوی — اس صفحہ پہ نام کچھ نہ نکلا
چلتے ہیں بتاں دلوں کو ٹھکرا — یارب یہ خرام کچھ نہ نکلا
انصاف کہیں نہیں جہاں میں — فریاد سے کام کچھ نہ نکلا
آگے تری مست انکھڑیوں کے — میخانہ میں جام کچھ نہ نکلا

بُت بن گئے دیکھ کر بتاں کو — واللہ کلام کچھ نہ نکلا
جز خونِ جگر کے اور اپنی — قسمت میں طعام کچھ نہ نکلا
یعقوب سے پوچھ اے زلیخا — مت کہہ یہ غلام کچھ نہ نکلا
تڑپا نہ کرے نثار کیوں کر
تجھ تیغ سے کام کچھ نہ نکلا

جھمکا رہا تھا گردوں خورشید کا پیالا
کھڑکا کے دو کٹورے سقنی نے مار ڈالا
جب ڈول کھینچتی ہے وہ رشکِ ماہِ تاباں
اندھا کنواں بھی یار و ہو جائے ہے اوجالا
مہتاب کی بغل میں ابرِ سیہ ہے گویا
مشکیزے کو جو اوسنے کاندھے پہ دھر سنبھالا
جب وشکِ حور ایسی سقنی سبیل پر ہو
کیوں کر نہ ہو بہشتی پانی کا پینے والا
خورشید جیسے آدھا ڈوبا ہوا شفق میں
لُنگی نے اوس کمر کی یہ حسن اب نکالا
کھینچا نہیں کنوے سے یہ ڈول بھر کے اوس نے
کنعاں کے چاہ میں سے یوسف کو ہے نکالا
حوریں نثار پانی بھرتی ہیں اوس کے آگے
ہاں خضر کی قسم ہے سقنی ہے سب سے عالا[۱]

۱-۲ کذا

جوں برق مرے سر پہ تلوار تو مت چمکا
مرنے سے جو ڈرتا ہو اسے یار اوسے دھمکا
تو شوق سے مل ہم سے کہتے ہیں سو کہنے دے
مونہہ بند کرے کوئی کس طرح سے عالم کا
واں ناچ وہ دیکھے ہے ہنستا ہے رقیبوں سے
یاں اشک مسلسل کا رہتا ہے لگا جھمکا
سایل سے نہ دل کے تو مونہہ پھیر نثار اپنا
شاگرد اگر سچ ہے تو حضرت حاتم کا

آشنا ہوتا تو ہے وہ ہر کسی اوباش کا
کیا ارادا مجھ سے ہے یارب اوسے پرخاش کا
ایک دو کیا یوں ہزاروں حسرتیں ہیں دل کے بیچ
دانہ سے دانہ جدا جوں پوست میں خشخاش کا
لکھ چکا تصویر تیری دیکھتے ہی تجھ کو ہوش
رنگ عاشق کی طرح اوڑنے لگا نقاش کا
مجھ کو یہ حیرت ہوئی نکلا کہاں سے آفتاب
شب جو آیا بزم میں وہ جامہ پہنے تاش کا
وہ بت خورشید رو نکلا تو گھر میں چھپ گئے
ہم نے دیکھا شیخ جی میں وصف ہے خفاش کا
اشک کے دریا میں پھرتی ہے تلاطم سے بہی
کچھ ٹھکانا ہی نہیں لخت جگر کی لاش کا

اس برابر کون سی دولت ہی دنیا میں نثار
حضرتِ حاتم کا یہ کہنا تجھے شاباش کا

غیر کا جاسوس بیٹھا راہ ہی تکتا رہا
شب کو وہ کوٹھوں ہی کوٹھوں گھر ہمارے آ رہا
دل میں فرقت کا جو ڈر بیٹھا ہے سو جاتا نہیں
وصل کے دن بھی شبِ ہجراں کا اک دھڑکا رہا
ہو گئی عالم میں تیرے مجھ سے ملنے کی خبر
بے دھڑک مل اب تو رسوائی میں باقی کیا رہا
ہم سے لڑنے دو انھیں کوئی نہ بولو درمیاں
ایسے ایسے آگے جھگڑے ہو چکے ہیں بارہا
کیوں نہ پھوٹا جائے حیرت ہے نگہ کے تیر سے
آئینہ کس درجہ اوس کے روبرو ٹھہرا رہا
کیا ہی غصہ کر رہا تھا بزم میں ایک ایک پر
ہم بھی جب بگڑے ادھر سے سوچ کر دم کھا رہا
کون جانے ہے کسی کی بات کیا کہیے نثارؔ
آ کہیں عاشق نہ ہو کتنا تجھے سمجھا رہا

پچھتائے پھیڑا اوسکو دانتوں سے ہاتھ چابا
چھاتی پہ لات کھائی ٹک پانو کو جو دابا
گردش سے اوس نگہ کی ہے شور اور شرابا
زاہد کے سر سے پھوڑا مستوں نے جا قرابا

گر جوے شیر جاری پھر جوے خوں بہائی
تیشے سے کوہکن نے پیدا کیا دو آبا

ابرو پہ نوخطوں کے پرَ چیں جبیں نہیں ہے
پیشانی پر لکھا ہے محراب کے کتابا

آتش تو کیا ہے اس پر اک بوند ہے سمندر
چھاتی کا داغ ایسا جلتا ہوا ہے تابا

ہمخواب ہو کے میرے سینے پہ ہاتھ رکھ سو
یہ نرم و گرم و رنگیں ہے مخمل دو خوابا

مجھ سے تجھے ملادیں طاقت نہیں انھیں ہے
جو عرش کا ملادیں گے فرش سے قلابا

ان سنگدل بتوں سے ملتا ہوں ڈرتے ڈرتے
پتھر نہ مار بیٹھیں ہیں سخت بے محابا[1]

آ دیکھ جا مجھے تو میں دیکھ لوں تجھے ٹک
آنکھوں میں دم ہے اب تک آئے تو آشتاب آ

اے مغبچو یہ مت سا داڑھی میں شیخ جی کی
انگور کا ہے دانا از قسم ریش بابا

بلبل سحر ہوئی اب جا اوس کا منہ دھلا دے
گل کو بنا چلپچی غنچے کو آفتابا

تس پر بھی ایک عالم اس پہ نظر پڑے ہے
دلّی نثار دل کی ہرچند ہے خرابا

۱۔ نسخے میں مہابا لکھا ہے۔

مکھڑے پہ تیرے صبح وہ عالم نظر پڑا | ذرّے سے آفتاب بھی واں کم نظر پڑا
رخسار پر عرق کی نہیں بوند یار کے | عارض پہ گل کے قطرۂ شبنم نظر پڑا
بالوں کی اوس کے مجھ سے نہ پوچھو ملائمی | ہر تارِ زلف جیسے کہ ریشم نظر پڑا
یکہ صف مژہ کے مقابل ہوا ہے دل | دیکھا تو اپنے کام میں رستم نظر پڑا
تجھ بن مجھے تو آتشِ گل نے جلا دیا | گلشن ترے بغیر جہنم نظر پڑا
زلفوں کو خط کے آنے سے کیا پیچ و تاب تھا | ہر ایک تار رات کو برہم نظر پڑا
شاید کہ شادی مرگ ہوا تجھ کو دیکھ دل | دیکھا جو پاس جا کے تو بے دم نظر پڑا
چاکِ جگر کو جس سے ہو عاشق کے التیام | جرّاح پاس وہ نہیں مرہم نظر پڑا
بغچہ[1] ہے کائنات کا اوسکی بغل میں دل | پتلا عجب طرح کا یہ آدم نظر پڑا

استاد تھے جہاں میں سبھی لیکن اے نثار
جو کچھ نظر پڑا مجھے حاتم نظر پڑا

کیا جانئے پھلکاری اس گل کی پھبن کا تھا
جو تختۂ دامن تھا تختہ وہ چمن کا تھا
نخوت سے نہ کچھ کہنا اُس غنچہ دہن کا تھا
تنگی کے سبب سے یہ رنگ اوس کے دہن کا تھا
ہم آگے ہی سمجھتے تھے تم گھر کو سدھارو گے
جوں صبح گجر باجا ماتھا وہیں ٹھنکا تھا
نرگس کو کیا ایسا بیمار اون آنکھوں نے
ڈھلکا ہی نظر آیا گردن کا جو منکا تھا

---

[1] کذا

مینا میں نہ ہو جلوہ وہ بادۂ گلگوں کا
جامہ میں جو کچھ یارو رنگ اوس کے بدن کا تھا

ہر ایک نگہ اوس کی تھی ہول سپٹے کی سی
محبوب جو اپنا تھا رادت وہ دکھن کا تھا

باتوں میں پرچتا تھا دل اوسّے دو چند اپنا
لکنت جو زبان کو تھی کیا لطف سخن کا تھا

جی سیب پہ دیتا تھا دیکھے تھا جہاں یارو
اس دل کو غضب سودا اوس سیب ذقن کا تھا

سچ کہیو نثار اب تو آنکھوں میں جو شب کاٹی
کچھ عہد مگر تجھ سے اوس عہد شکن کا تھا

گھر جو اوس شوخ ستمگر کے گئے رات کے وقت
ناز کیا ہی کئے ہم سے اشارات کے وقت

اوس کے مکھڑے کو یونہی دیکھ کے رہ جاتے ہیں
بات آتی ہی نہیں یاد ہمیں بات کے وقت

خواب میں حور و پری نے بھی نہ دیکھے ہوں گے
تجھ سے ہوتے ہیں کرشمے جو اشارات کے وقت

اس قدر تنگ دلی غنچہ دہاں خوب نہیں
ایک بوسے سے چھپا مونہہ نہ عنایات کے وقت

بخش دو خونِ دل اپنے کو شہیدانِ وفا
تاکہ شرمندہ نہ قاتل ہو مکافات کے وقت

دیکھ کر اوس کو ہوئے ہم سے جدا ہوش وحواس
دوست اپنا نہ رہا ایک بھی آفات کے وقت

ہم لیے یار کو آغوش میں بیٹھے تھے نثار
کیا خلل آکے کیا غیر نے کل رات کے وقت

آتا ہے مجھے درد محبت میں خدا یاد
اس درد کی عیسیٰ کو بھی ہوگی نہ دوا یاد

شکوا ہے مجھے یاد کسی کا نہ گلا یاد
کچھ یاد نہیں مجھ کو تری یاد سوا یاد

قربان ہوں اس یاد کے اس بھول کے صدقے
ہے جور وجفا یاد نہیں مہر ووفا یاد

نالاں نہیں میں خط کے نہ لکھنے سے تمہارے
آتا ہے مجھے اپنے نصیبوں کا لکھا یاد

دن وصل کے رہتا ہے شب ہجر کا دھڑکا
عالم میں بقا کے مجھے آتی ہے فنا یاد

قطرا بھی مرے نام گرایا نہ زمیں پر
میخواری میں تو نے بھی کسی دن نہ کیا یاد

زلفیں ہی بناتے اوسے گذرے ہے شب و روز
ہم بخت سیاہوں کو کرے اوسکی بلا یاد

تحریر کیا نامہ سوا ایسا نہ پڑھا جائے
یک پرچۂ کاغذ سے ہمیں خوب کیا یاد

واں یاد فراموش وہ کھیلے ہے بتاں میں
یاں آٹھ پہر ہم اوسے کرتے ہیں سدا یاد

دل خوں ہو ٹپکنے جو لگا چشم سے ہر دم
آئے ہے مگر یار کے ہاتھوں کی حنا یاد

یاں تک میں اوسے دیکھ کے رستے میں ہوا محو
گھر اس نے بنایا نہ رہا مجھ کو پتا یاد

بیٹھا ہوں پریشاں میں نثار اس لیے ہر دم
دل یاد جدا آوے ہے دلخواہ جدا یاد

اے محتسب نظر کی تو نے اگر سبو پر
سنتا ہے مر مٹیں گے ہم اپنی آبرو پر

غافل نہ رہیو ظالم اس آہِ آتشیں سے
یہ آگ وہ نہیں ہے جاوے جو اوپر اوپر
اے گل فروش تیری دوکاں پہ آ جھکی ہے
کیا پھول سنگی[1] ہے بلبل دوڑی ہے گل کے اوپر
میں صاف ہی کہوں ہوں رکھتا نہیں لگی کچھ
عیب و ہنر کہے ہے آئینہ جیسے رو پر
بے دست و پا ہے تس پر جاتا کہاں کہاں ہر
اے دل غضب ہی کرتا رکھتا جو تو کبھو پر
بے مہر تجھ سے رکھئے کیا مہر کی توقع
دیکھا نہ مہر کرتے ہم نے تجھے کسو پر
کن سنگ دل بتوں سے ہے مہر کی تمنّا
پڑیو نثار پتھر اس دل کی آرزو پر

کبھو اوس کے نہ گذرا یہ مزاج لاابالی میں
کہ بیٹھوں اپنے عاشق کی بھی میں آغوشِ خالی میں
لبِ میگوں پہ سبزہ ہو گیا ساقی غضب آیا
ملایا زہر کن[2] نے اس شرابِ پرتگالی میں
گلِ لالہ کی کلیاں رشک سے کھلتی نہیں ہرگز
نظر کرتی تھیں جب پیارے تری فندق کی لالی میں

---

[1] کذا	[2] کذا

پلک سے مور کی لے کر قلم لکھتا جو ہے مانی
لگا ہے اوس کمر کی آج کیا نازک خیالی میں
تپ غم سے رہے دل کس طرح عاشق کے پہلو میں
نہیں سیماب رہتا آگ پر ہرگز کٹھالی میں
گُتھے لختِ جگر آہوں میں اے گل رو نظر کرنا
گویا سو سو لگے ہوں پھول اس ایک ایک ڈالی میں
پھڑکنا مچھلیوں کا دام میں بھولا مجھے ظالم
تری آنکھوں کو لڑتے دیکھ کر برقع کی جالی میں
دیا استاد حاتم سا نثار اللہ نے مجھ کو
کیا کرتا ہوں سجدے شکر کے درگاہِ عالی میں

یاں تو جلدی ہے جی سے جانے کی
دیر ہے بس تمھارے آنے کی
خبر اوس گل کی ہے جو آنے کی
کیا ہوا کچھ پھری زمانے کی
گل نے بلبل کو کیا سند[۱] ور دیا
نہیں آتی صدا ترانے کی
میرے مرنے کی سن کے وہ بولا
اوس کو کثرت ہر دم جیرانے کی
جوں گھر کیوں نہ ہوں جگر سوراخ
فکر ہے جن کو آب و دانے کی
گدگدی کی جو میں تو ہنس کے کہا
باتیں مت کر تو مار کھانے کی
تشنگی کی مری کرو تدبیر
آب شمشیر سے بجھانے کی
چلو کو ٹھے پہ سب کو غوطہ بتا
کیا ہوا ہے پتنگ اڑانے کی

---

۱ کذا

دخترِ رز سے ہم کریں توبہ یہ زٹل ہے بھنگیڑ خانے کی
صورتِ نقشِ پا نشانہ اُسے
آرزو ہے مرے مٹانے کی

جو مجھ سے پوچھو تو کہنے کو ہاں سلونو ہے
وہ سانولا ملے جس روز یہاں سلونو ہے
چھڑی کھڑی ہے ہجوم بتاں ہے سب کچھ ہے
نہیں وہ کانِ ملاحت کہاں سلونو ہے
نہ سہنویوں پہ یہ جی لوٹ ہے نہ شکر بھر
تم ایک بوسہ ہمیں دو بتاں سلونو ہے
چلو بتاں سے کریں راہ برہمن بن کر
بندھاؤ آج انھیں راکھیاں سلونو ہے
چلو نہ آج نمکسار کا مزا لوٹیں
بتانِ ہند کے گھر عاشقاں سلونو ہے
نہیں پہاڑ پہ یہ لال پگڑیوں والے
یہ لالہ زار ہے یارو کہاں سلونو ہے
ترے چھڑے کے نشاں سے بدن پہ ظاہر ہے
یہ چھیڑ ہم سے جو ہے آج ہاں سلونو ہے
بتاں بجاتے ہیں جو بیں برہمنوں کے حضور
چلو نہ سیر کریں دوستاں سلونو ہے

ہر ایک چھڑی ہے کھڑی جیسے آہ عاشق کی
زمیں سے شور ہے تا آسماں سلونو ہے
نثار دیکھئے چل ہند کے ملیچوں کو
نظارہ کیجئے آج ایجواں سلونو ہے

جاکے اوس کوچے میں ہم گھر نہیں آنے والے
ہم ز خود رفتہ ہیں واں جان سے جانے والے
دو کو آپس میں لڑانے کو یہ ایک آفت ہیں
یار اپنے ہیں جو یہ اب کے زمانے والے
ہاتھ آتا ہے وہ کب ساتھ لگے پھرنے سے
سخت کج فہم ہیں یہ پانوں تھکانے والے
سوزِ دل یار سے دس بیس میں کہتے ہیں کوئی
راگ بے وقت نہیں گاتے ہیں گانے والے
گو کہ دزدیدہ لڑیں یار کی آنکھیں ہم سے
لیکن اس بات کو یاں پا گئے پانے والے
برہمن بن کے تو بیٹھا ہے عبث گنگا پر
یہ ترے گھاٹ نہیں آ کے نہانے والے
نزع میں دیکھ کے بیمارِ محبت کو نثار
پڑھتے ہیں سورۂ یاسین سرہانے والے
جی میں آتا ہے غزل در غزل اب اس کو کہوں
قافئے ہیں بہت اس بحر میں آنے والے

ٹک ادھر بھی نظر اے آنکھ لڑانے والے
ٹک تبسم تو کر اے ہنس کے رُلانے والے
گاہ بے گاہ ادھر بھی تو کبھو آیا کر
او میاں رات کو اغیار کے جانے والے
مر گئے ہم پہ کبھی یوں بھی نہ پوچھا تونے
کیا ہوئے اب وہ مرا ناز اُوٹھانے والے
شورِ خلخال سے بس مت کرو محشر برپا
او میاں فتنۂ خوابیدہ جگانے والے
اے نثار ایک غزل اور بھی ہم کہتے ہیں
فکر سے اب تو نہیں ہاتھ اوٹھانے والے

دیدہ و دل ہیں یہ دونو جو ستانے والے
کہیں مرتے نہیں یہ اوس سے بھڑانے والے
ایک بوسہ تو عنایت ہو ہمیں بھی گا ہے
او بہارِ گلِ رخسار لٹانے والے
تجھ سے کچھ بس نہیں چلتا ہے کسی کا ظالم
دیدہ و دل بھی ہیں میرے ہی ستانے والے
ناصحو میں تو یونہی جی سے خفا بیٹھا تھا
اور تم آئے مری جان کو کھانے والے
چٹکیوں میں وہ اوڑاتے ہیں تجھے اے زاہد
دخترِ رز کے جو ہیں مست اڑانے والے
مجھ سے اوس شوخ کو ہر روز بھڑاتے ہیں نثار
آہ تھکتے نہیں آپس میں لڑانے والے

وہ شوخ نمو داروں میں راوت دکنی ہے
دنبالۂ چشم اوسکا پیٹے کی سی انی ہے

آج اُس قدِ رعنا کی ادھر آمدنی ہے
اے سروِ قیامت ترے سر آن بنی ہے

اختر نہیں سوراخ ہیں غربال کی مانند
افلاک کی چھاتی مری آہوں سے چھنی ہے

سودا میں تری زلفِ سیہ فام کے میرا
جو اشک ہے سو دانۂ مُشکِ ختنی ہے

شبنم نہیں یہ کس کی اجل آئی ہے بلبل
ہر گُل جو لئے ہاتھ میں ہیرے کی کنی ہے

قابل ہے ترے نام کے میرا دلِ پُرخوں
یاقوت سے بہتر یہ عقیقِ یمنی ہے

کب تک رہِ نظّارہ سے محروم رہیں ہم
اے مہ درِ غرفہ بھی کبھو واشُدنی ہے

ایک اوس سے نثّار آنکھ لڑا کر ہوئے رسوا
اور دوسرے ناصح کی ہمیں طعنہ زنی ہے

اور ہی کچھ ڈھنگ ہیں اب اُس بُتِ بے پیر کے
اے تصدق جایئے اس آہِ بے تاثیر کے

کیوں پھرا جاتا ہے یاں تک آکے اے ابرو کماں
وہ ہمارا گھر ہے اب پرتاب پر اک تیر کے

عشق میں اپنے اثر ہو تو وہ گھر بیٹھے ملے
کارگر ہوتے ہیں کوئی یوں عمل تسخیر کے
بن گئے ہیں صورتِ دیوار تجھ کو دیکھ کر
محو ہیں ہم تجھ سراپا ناز کی تصویر کے
چاہنے والوں کو اپنے یار دُکھ دیتا ہے کیوں
وہ تو بے تقصیر ہیں قابل نہیں تعزیر کے
اور کی سنتا نہیں اپنی کہے جاتا ہے تو
ہم تو دیوانے ہیں تیری حجت و تقریر کے
تیغ بھی روتی ہے قاتل کی ہماری نعش پر
اشک ہیں سرتا بپا جوہر نہیں شمشیر کے
دل نہیں ہے معتقد اس جبہ و دستار کا
دام میں آتے ہیں ہم اے شیخ کب تزویر کے
حیدرِ کرار نے وہ زور بخشا ہے نثار
ایک پل میں دو کروں اجگر کے جبڑے چیر کے

گردش کا اوس نگاہ کی اب طور اور ہے
اے ساکنانِ میکدہ یہ دور اور ہے
انداز تیرے جور میں ہے کس کے جور کا
جورِ فلک ہے اور، تمہارا جور اور ہے
اک پل میں التفات ہے اک پل میں ناخوشی
ایک آن میں کچھ اور ہے فلفور اور ہے

جرّاح کو نہ سونپ مرا زخم آپ دیکھ
بے رحم یہ نہیں ہے مری غور اور ہے

خوباں میں ہے جو تخت ہزارے کا تاجور
کیا جانے کوئی وہ بتِ لاہور اور ہے

بندہ ہوں جاں نثار ہوں میں اوس کا اے نثار
آخر جو میں ہوں اور نہیں اور اور ہے

اپنی جگہ خدا جو تجھے اب خدا کرے — کافر تو سچ بتا کہ مرے حق میں کیا کرے
سیکھی ہے کس سے تو نے بتا برق کی سی خو — آپ ہی تو جلوہ گر ہو اور آپ ہی چھپا کرے
یہ فیض ہے نسیمِ تبسم کا تیری یار — کیا دخل ورنہ غنچہ صبا سے کھلا کرے
رہنے دے زلفِ یار میں دل کو بھنسا ہوا — شانے کی منت ایسے کی خاطر بلا کرے
برقع اوٹھے جو روے کتابی سے دیر میں — واللہ برہمن ترا کلمہ پڑھا کرے
ابرو سے اوسکے دل یہ چھڑایا نہ جائیگا — ناخن سے کوئی گوشت کو کیونکر جدا کرے
دریاے معرفت میں ملے عینِ ذات ہو — مثلِ حباب اپنی جو ہستی فنا کرے

نا آشنا کیا ہے مجھے جن نے خلق سے
اس کو خدا نثار ترا آشنا کرے

رباعی

مانندِ حباب سر اُبھر کر نہ اوٹھا — چاہے جو بنوں بحر تو ہستی کو مٹا
دریا میں تو قطرہ بن کے دریا غافل — قطرہ نہ رہے گا پھر ہے دریا دریا

دستار کہاں کی اور کیسی یہ قبا — آزاد بنے تو اس تکلف میں نہ آ
ہوشیار رہ اپنے دم قدم سے ہر دم — جوں شیخ تو آپ کو لباسی نہ بنا

آنکھوں پہ نگاہ کی تو ساحر دیکھا — زلفوں پہ نظر جو کی تو کافر دیکھا
آغاز میں خط کے حسن اوسکا ہم نے — دو چار ہی دن کا بس مسافر دیکھا

دوں تجکو کہاں تلک میں لالا کاغذ — کرتا ہے نثار تو تو کالا کاغذ
احوال سیہ بختی کا لکھ لکھ ہر شب — لے تو نے تو سب چتھاڑ ڈالا کاغذ

آنکھیں نہ لڑا خراب ہوگا ناحق — جی کو نہ لگا خراب ہوگا ناحق
کافر نہ ہو ان بتوں کے پیچھے اے دل — باز آ، باز آ خراب ہوگا ناحق

اے ماہ یہ شغلِ آفتابی کب تک — یہ جام کا دور اور گلابی کب تک
جوں دُرد نہ تہ نشیں ہو اتنا اس میں — ہوشیار ہو بس سنبھل خرابی کب تک

سوزِ دل اپنے کا پُرزا پر پروانہ پہ لکھ — لا نشار اس کو روانہ کریں اب ڈاک میں ہم

مے تو نے جو پی رنگ ترا اور بھی چمکا — جیسے کہ نگیں ڈانک لگا اور بھی چمکا
تھا ایک تو وہ شوخ یونہی شعلۂ آتش — زربفت کی پہنی جو قبا اور بھی چمکا

حصّۂ دوم : انتخابات

فقہِ ہندی

تقدمِ زمانی اور لسانی نقطۂ نظر سے یہ نہایت اہم منظوم رسالہ، فقہ کے عام مسائل پر مشتمل ہے۔ آخر میں مصنف نے اپنا نام عبدی لکھا ہے۔ شیرانی صاحب کا خیال ہے کہ مصنف کا نام شیخ عبداللہ انصاری اور تخلص عبدی ہے۔ مصنف کی صراحت کے مطابق اس کا سالِ تصنیف ۱۰۴۰ھ ہے، اور یہ اورنگ زیب کے عہد میں لکھا گیا ہے۔ اس لحاظ سے اُردو کی قدیم ترین تصنیفات میں اس کا شمار ہونا چاہیے۔ اس کی زبان پر پنجابی کا اثر غالب ہے، لیکن کھڑی بولی کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ رسالہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہ کئی بار چھپ چکا ہے، غالباً آخری بار ۱۳۱۲ھ میں چھپا تھا۔ (فہرست مخطوطات انجمن ترقی اُردو۔ پاکستان) لیکن مطبوعہ نسخے اب بہت کم ملتے ہیں۔ اس کے متعدد مخطوطے مختلف کتاب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ضرورت ہے کہ لسانی نقطۂ نظر سے، مختلف خطی نسخوں کی مدد سے اس کا ایک اچھا تنقیدی اڈیشن تیار کیا جائے۔

یہ اقتباس جس مخطوطے سے نقل کیا گیا ہے، وہ اکبر شاہ ثانی کے عہد کا مکتوبہ ہے۔

حمد ثنا سب رب کوں خالق کل جہان　　لائق حمد ثنا سے کے اور نہ کوئی جان
علم شریعت ساتھ کر بھیجا پاک رسول　　جو کچھ بھیجا رب نے سب ہم کیا قبول
یارب اپنے کرم سوں بھیج بے حد درود　　نبی محمد مصطفٰے تسوں ہوں خوشنود
بھیجو ان کی آل پر اور اصحاب تمام　　تس بھیجو سب دوست پر بہت درود سلام
کیتے مسائل دین کے عبدو کہے امین　　فقہ ہندی زباں پر بوجھو کرو یقین
مطلب مسلہ پوچھنا جو کچھ ہوے زبان　　عربی ترکی فارسی ہندی یا افغان
علم شریعت پوچھنا فرض عین کر جان　　بالغ عورت مرد پر جو ہوئے مسلمان
چار علم سب فرض ہیں، پوچھو رکھو پاس　　علم توحید نماز ہے، روزہ، حیض، نفاس

سر نیکی ایمان ہے اصل عبادت سوے　　نماز روزہ زکوٰۃ حج بن ایماں روانہ ہوئے
ایماں لا دلیل سوں جو توں اہل ایمان　　جو تحقیق نہ پائے تو تقلید غنیمت جان
رکن شرط ایمان کی بوجھے سو مومن جان　　اقرار زبان، تصدیق دل، دو ہیں رکن ایمان

سات شرط ایمان کی غیب پر لا ایمان　　علم غیب اللہ کا خاصا کر کے جان
مومن ہو اختیار سوں جان حلال حرام　　رحمت پر امید کر، غضب سے خوف تمام

ساتھ حکم ایمان کے جب کافر لائے ایمان　　جیو، مال، فرزند اُس آنویں بیچ امان
ناحق رنج، گمان بد اُس کے حق نہ آن　　دوزخی وہ چھوٹ کے، جنت پاوے مکان

ایمان سبھی دو بھانت ہیں، مجمل مفصل جان
کلمہ طیب صدق دل پڑھ، مجمل پہچان
مفصل صفت ایمان ہے، تس کی سات اقسام
ایماں، خدا، فرشتگاں، کتب، رسل تمام
پہلے بری تقدیر کو خالق سے تو جان
جلاوے پیچھو موت کے مانے، سو اہل ایمان

مانو، اللہ ایک ہے اور نہ دوجا کوسے
مددگار وزیر سوں بے پروا ہے دوسے
نا کچھ کھاوے نا پیوے، نا سووے دن رات
نا روئے وہ، نا ہنسے نا بیٹھے نا چلے سات
نا بانویں، نا داہنے، نا تل اوپر جان
نا پیچھو نا بیچ ماں، نا آگو سے مان
نا تھوڑا نا بہت ہے، نا اس نقص زوال
نا جوہر، نا جسم ہے، ذات صفات کمال
نا عاجز کچھ کام پر، نا کچھ صورت جان
سب عیوب شبیہہ سوں ذات پاک سبحان
جوں اس ذات قدیم ہے، یونہیں صفات قدیم
نا ابتدا نا انتہا، اُس خالق رب کریم
جیوتا ہے بن جیو سوں، سنتا ہے بن کان
دیکھتا ہے بن آنکھ سوں، قادر بن تن جان

مانو سبھی ملایکاں، سبھی مطیع فرمان
اپنے اپنے کام پر حاضر رہیں جان
حامل وحی جبریل ہے، منہ پر میکائیل
موت پر عزرائیل ہے، صور پر اسرافیل
اپنے اپنے کام پر بھولیں نہیں زنہار
نا کچھ کھاویں، نا پیویں، نا ان عدد شمار
نا عورت نا مرد ہیں، نا شہوت کے نال
ذکر پاک تسبیح سوں خالی نا رکھیں حال
بڑائی آدمی خاص کی سبھی ملک پر جان
بڑائی آدمی عام کی عام ملک پر مان
بڑائی ملایک خاص کی عام بشر پر ہوئے
جو دشمن ہے ملک کا، کافر مطلق ہوئے

مانو سبھی کتابہا نازل کی رحمان
توریت، انجیل، زبور ہے صحیفہ بھی قران
عمل ان قران پر اور سب منسوخ جان
کلام خدا فانی نا ہو بھی مخلوق نہ مان

ں، تیرے کرمِ عمیم سے میں بھی امیدوار ہوں کہ یہ بضاعتِ مزجات تشریفِ
سنِ قبول سے مشرف ہو اور یہ دعاگو تیرے وظیفۂ انعام و افضال سے
وظف، واسطے بقائے زندگانی و ملکِ بادشاہِ دیں پرور دنیا پرور دعا اور اثر
اثر۔ اور مسمّیٰ ہوا یہ رسالہ بہ انشائے اردو۔ اور منقسم ہوا اوپر ایک مقدمے
در دو باب کے، اور اللہ ہادی ہے طرف صواب کے۔"

مصطلحاتِ ٹھگی

ذخیرۂ انڈیا آفس کا یہ مخطوطہ ۱۸۳۶ء کی تصنیف ہے۔ مصنّف نے اپنا نام "اکبر الہ آبادی" لکھا ہے۔ مخطوطے کے ترقیمے میں صراحت کی گئی ہے کہ "یہ کتاب واسطے گزارنے خدمت میں پاٹرسن امیمت صاحب کے لیے لکھی گئی۔" اس میں ٹھگی کی اصطلاحیں درج ہیں ۔۔ اس موضوع پر اُردو میں بہت کم مواد ملتا ہے، اس لحاظ سے یہ نہایت قابلِ قدر تصنیف ہے۔

فرقۂ ٹھگوں کا کہ اس مملکت میں چاروں طرف ہر دیار و جوار میں مخفی و منتشر تھا، کوئی آدمی ان کے نام کے سوا، ان کے حال سے آشنا نہ تھا ... کثرت اس قوم مردم آزار کی حشرات الارض سے زیادہ تھی ... دلّی اور ریواڑی میں بلوچی ٹھگ تھے ... ان گم راہوں کو خواہ ہندو ہوویں یا مسلمان، اعتقاد دیبی کا اور بھروسا اس کے حفظ و حمایت کا اپنے حال پر بدرجۂ اتم تھا۔

آلا : ٹھگ کو کہتے ہیں۔ جب اثنائے راہ میں کسی کو دیکھ کر شبہہ کرتے ہیں کہ یہ ٹھگ ہے یا غیر ٹھگ، تو اس سے کہتے ہیں: آلا بھائی

سلام۔ اگر وہ ٹھگ ہوتا ہے تو اماسی یعنی مصطلحہ زبان میں جواب اور بات چیت کرتا ہے۔

آنسو نوڑ : بن موسم کا مینہ۔ گھر سے نکلتے وقت اگر مینہ برسنے لگے تو اپنے گھر کو لوٹ آویں۔ بدشگونی۔

آنئے ہو تو گُہری چلو : اشارہ مسافر کے قتل کا۔

اگرتیہ : اُن ٹھگوں کو کہتے ہیں جن کے باپ دادا اگلے زمانے میں دلّی سے نکالے جاکر آگرے میں رہنے لگے اور چند مدّت کے بعد جا بہ جا پھیل گئے ... بیان کرتے ہیں کہ اگلے زمانے میں دلّی کے کسی بادشاہ کا چیلا ٹھگوں کے ہاتھ سے مارا گیا تھا۔ بادشاہ موصوف نے خفا ہوکر، دلّی کے گرد دنواح کے سب ٹھگوں کو گرفتار کرواکے پیسے کا داغ چوتڑوں پر دلواکے ضلع سے خارج کروا دیا تھا۔

آگاسی : پگڑی کو کہتے ہیں۔ اگر گھر سے نکلتے وقت یا منزل سے کوچ کرتے وقت کسی ٹھگ کی پگڑی گر پڑے تو نہایت بد جانتے اور حتی المقدور اس دن سفر نہ کریں، بلکہ ایک دو دن کی راہ سے بھی گھر کو پھر آویں اور سات دن تک سفر نہ کریں۔ اور اگر گھر سے بہت دور ہو ویں تو اس پگڑی کے وزن بھر گڑ منگا کر آپس میں بانٹیں اور اس پگڑی کو خیرات کریں۔

اگاسی، چیل کی آواز کے شگون کو بھی کہتے ہیں۔ اگر آدھی رات سے صبح تک میں کوئی چیل بولے، تو اس شگون کو بہت بد جانتے ہیں ... پس اگر سفر میں کہیں مقام کیے ہوویں تو بھاگیں۔ مسافر کے قتل سے دست بردار ہو ویں۔

اگاسی بڑاڑ : بادل گرجنے کی آواز۔ شگونِ بد۔

ٹھگوں کی جگہیں : اطراف نربدا، ساگر، بندیل کھنڈ، گوالیار، مالوہ، ملک اودھ، راجپوتانہ، ارکاٹ، تلنگانہ، کرناٹک، برار، خاندیس، بہار، بنگالہ، مظفرپور، پورنیا، ترہت، دلّی، ریواڑی۔

قلندر یا ملتانی ٹھگ : مسلمان۔

بنجارے، سوسیا ٹھگ : ہندو۔

اندرمن : عورت یعنی رنڈی۔

ابارنا : پھانسی سے مار ڈالنا۔

ایٹب : دکنی اور بڑاڑی ٹھگوں کی زبان میں ایام مفصلۂ ذیل یعنی بارہ دن، جب کسی ٹھگ کے لڑکا ہووے، یا کسی ٹھگ کی جورو، بیٹی پہلی دفعہ کپڑوں سے ہووے۔ یا کسی ٹھگ کی بیٹی بیاہی جاوے یا کسی ٹھگ کی لڑکی مسلمان ہوجاوے۔ اور دس دن، جب کسی ٹھگ کے یہاں غمی ہوجاوے۔ اور سات دن، جب کسی ٹھگ کی گائے بھینس بچہ دیوے۔ اور تین دن، جب ٹھگوں کی عورت بہ طورِ معمول کے حایض ہو۔ پس دکھنی یا بڑاڑی ٹھگ ان دنوں میں گھر سے سفر کو نہ نکلیں۔ جس ٹھگ کے یہاں ایسا ہووے، اسے ایٹب لگے۔ اس جماعت کے تمام ٹھگوں کو اس سے پرہیز کرنا لازم ہے کہ ہم گیدی ہیں۔

ایندہ : عورت، رنڈی، ٹھگوں کے اعتقاد میں عورت کو مارنا نہایت نحس ہے۔

باجید خاں : یہ نام ایک اشارہ ہے قتل کا۔ اگر کوئی آتا ہو تو شیخ جی، شاہ محمد،

پھمن، گنگارام پکاریں کہ کوئی آرہا ہے۔ موقع مارنے کا نہ ہو تو کہتے ہیں کہ مسافر باجید خاں یا دیو سنگھ پیچھے آتے ہیں۔ ان کو جلد ہمارے پاس بھیج دینا۔ پیچھے والے یہ اشارہ سن کر قتل کر دیتے ہیں۔

بلیا : مدفن، جہاں لاش گاڑیں۔

بھارا : تلنگانی ٹھگ لاش کو کہتے ہیں۔

دو گیدڑ، راہ کاٹ جاویں تو بہت نامبارک۔

ٹھگوں کا اعتقاد یہ ہے کہ جو کوئی مہلوک کی جایداد میں سے کچھ چیز چرا کر لیوے اور ٹھگوں سے ظاہر نہ کرے، تو اس چور کو شیر لے جاوے یا اسی سال مر جاوے۔

اشارہ قتل کا : آئے ہو تو کھری پیلو، یا حقہ پی لو، تنبا کو کھالو۔ رومال کی رسی بنا کر پھانسی دیتے تھے۔ اعتقاد تھا کہ ٹھگوں کا مارا بھوت پلید نہیں ہوتا کہ وہ دیبی کے ایما پر مارتے تھے۔

بھڑاکی : بندوق۔

چیل اڑتے میں بیٹ کرے اور نظر پڑے تو مبارک کہ روپیہ ملے گا۔

پان دو : اشارۂ قتل۔

پتیار : کویلیہ ٹھگوں کی زبان میں تیتر کی بولی کے شگون کو کہتے ہیں۔ رات میں اس کی آواز کا آنا نہایت برا۔ اسی طرح دن میں گیدڑ کا بولنا بد جانتے ہیں۔ یہ مثل مشہور ہے ان کے یہاں!

راتیں بولیں تیترا، دن کو بولے سیار

پکا کر دینا : لاش کو خوب مضبوط گاڑنا۔

پلو دینا : اس رومال دینے کو کہتے ہیں کہ گرو ٹھگ اپنے چیلے کو دے۔

پنچایتی کوت : دیبی کی پوجا سب ٹھگ متفق ہوکر کریں، جس میں ضرورت ہے
دس بارہ روپے کے بکرے، دس بارہ روپے کے چاول، اور دو
چار روپے کا گھی اور دو تین روپے کا گرم مصالح، پندرہ بیس روپے
کی تاڑی ..... دو بکرے جیسے شیخ سدو کو چڑھتے ہیں، لے کر،
نہلا دھلاکر، اسی طرح گیلا رو بہ مغرب کھڑا کریں جس سے وہ
بال جھڑجھڑا دیں تو جانیں کہ دیبی نے نذر قبول کی۔ جھٹ پٹ
رو بہ مغرب مسلمانوں کی طرح نیت ذبح کی پڑھ کے ذبح کریں
اور اگر ہندو ہوں تو جھٹکا کریں اور تلیہ پکا دیں۔ یہ پوجا صرف
دکنی و تلنگانی ٹھگ کرتے ہیں۔

پتونی : دیبی کی پوجا سب ٹھگ کرتے ہیں۔ خواہ ہندو خواہ مسلمان۔

ناکی : چھینک، شگون بد۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ، اکثر ناقلین معتبرین سے دریافت ہوا کہ پارسائے
مذکور نے چند مدت ٹھگی میں بھی بسر کی تھی۔ آخر کار کسی کامل کی نصیحت سے
اس امر ناصواب سے باز آیا، اور باقی عمر پارسائی و عبادتِ الٰہی میں
گزاری۔ ٹھگ بھی اس بزرگ کو اپنے پیشواؤں میں جانتے ہیں۔ اور
بالمیکہ ... شمار کرتے ہیں ..... اور اس کی قبر کی زیارت کو سعادتِ دارین
سمجھتے ہیں۔

نعمت : مسافر جو پھنس گیا ہو۔

مصطلحات ٹھگی، از اکبر الہ آبادی

خاتمہ : تمت بالخیر، پانزدہم مارچ ۱۸۳۶ء مقام جبلپور (یہ کتاب
واسطے گزراننے خدمت میں پاٹرسن اسمت صاحب کے لیے لکھی گئی)

اُردو کا قدیم لغت

MAURE - FRENCH

اس لغت کا نام LEXICON LINGUAE INDOSTANICAE بھی ہے اور یہ دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ اس کا ذکر ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے رسالہ اُردو بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۲۴ء اور جنوری سنہ ۱۹۳۱ء میں کیا ہے۔ سر جارج گریرسن نے بھی اپنے سروے کی جلد ۹ صفحہ ۶ پر اس کا حوالہ دیا ہے۔ اس کا ذکر BELIGATTIS کے دیباچے میں بھی موجود ہے۔ ALPHABETUM BRAMMHANICUM نیز داستان تاریخ اُردو ص ۱۷۱۔ اس لغت کا مولف FRANCISWS M. TURONESIS ہے۔ اور یہ سورت کے مقام پر سنہ ۱۷۰۴ء میں مکمل ہوا۔ اس میں پانسو کے قریب صفحات ہیں، جن کو دو کالموں میں لکھا ہے۔ اس کا نسخہ فرانس کے قومی کتب خانے میں موجود ہے۔ اسی کتب خانے میں اُردو کا ایک دوسرا قدیم لغت ہے جس کا نمبر (INDIEN 39) اور جس کا نام THESAURUS LINGUAE INDIANAE ہے۔ اس میں اُردو، فرنچ، انگریزی، ناگری (ہندی) اور لاطینی کے مترادف الفاظ دیے ہیں مثلاً اختیار — ECTIAR، بمعنی ELECTION، CHOIX، ELECTIS آدھی کار۔

ہٹلر کا اُردو لغت

فوجی اصطلاحات کا یہ اُردو لغت آزاد ہند کی لیجن کے حکم سے ۱۹۴۳ء میں سرکاری چھاپے خانے میں شائع ہوا۔ یہ ۲۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ چند ابواب یہ ہیں:

(۱) جرمن حکم ہندوستانی میں
(۲) دستوں کے نام
(۳) فوجی رہ نمائی
(۴) میدانی علم
(۵) ہتھیاروں کا فن
(۶) پل پار کرنے کے طریقے
(۷) فوجی سامان
(۸) فوجی سامان کی مرمت
(۹) پانی کا پہنچاو
(۱۰) ہوائی بیڑا
(۱۱) سکھلائی

عنوان اُردو کے علاوہ جرمن میں بھی درج ہے:

MILITÄR WÖRTERBUCH

FÜR DEN

FUHRER UND UNTER FUHRER

DEUTSCH - HINDUSTANI

1943.

اُردو کا قدیم ترین ڈراما

یہ مخطوطہ عزیز دوست مسٹر سائمن ڈگبی کی ملکیت ہے اور مجھے لندن میں اُن کی عنایت سے اِس کے پڑھنے اور اس کے کچھ حصّے نقل کرنے کا موقع ملا۔ میں اُن کی اس نوازش کا تہِ دل سے ممنون ہوں۔ اس ڈرامے میں تیس ورق ہیں۔ سائز بڑا ہے اور خوش خط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخطوطہ رچرڈ اسٹریچی RICHARD STRACHEY کی ملکیت رہ چکا ہے جو ۱۸۱۶ء سے ۱۸۱۸ء تک دربارِ لکھنؤ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا رزیڈنٹ تھا۔ جہاں تک میرا علم ہے، اُردو کا کوئی ڈراما ان تاریخوں سے پہلے کا نہیں ملتا۔ اگر یہ اوّلین ڈراما نہیں، تو اُردو کے قدیم ترین ڈراموں میں ضرور شامل ہے۔ اس مخطوطے پر نہ سنِ کتابت درج ہے نہ سنِ تصنیف۔ لیکن اس بنا پر کہ یہ مخطوطہ رچرڈ اسٹریچی کی ملکیت رہ چکا ہے اور اس کی عبارت موجود ہے اور وہ ۱۸۱۶ء سے ۱۸۱۸ء لکھنؤ میں رزیڈنٹ رہا تھا، اس لیے یہ ان سنین سے قبل کی تصنیف ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ لکھنؤ میں ڈرامے کی جو ترقی ہوئی، اُس میں یورپی اثرات بھی شامل تھے۔ یہ ڈراما قدیم اُردو نثر کا دلچسپ نمونہ ہے اور اس میں ڈرامے کے ابتدائی اصول بھی کم و بیش ملحوظ رکھے گئے ہیں۔ ڈرامے کے شروع میں قصّے کا خلاصہ بھی دیا ہے جو بلفظہٖ درج ہے۔

خواجہ احمد فاروقی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"مجمل اس سانگ کے قصّے کا"

"نوروز بیگ جو پہلے رسالے دار تھا، نواب نجف خاں کے لشکر میں، بعد سن خدمت کے، نواب موصوف کی عنایت سے فیض آباد میں جاگیر اور منصب پاکر، وہاں ہی وطن اختیار کیا۔ اس کے ایک لڑکی تھی جس کی نسبت محمد مولا ن یو دھری نامی باقر گنج کے رہنے والے کے ساتھ ٹھہرائی۔ جب برات کے آنے کا دن پہنچا، اسی روز اتفاقاً میرزا محمد علی، نجف خاں کے ایک امیر کا بیٹا، جس نے اسطے جہاں دیدگی کے سیر ممالک کا اختیار کیا تھا، اسی شہر میں وارد ہوا۔ سواری کا تجمل باہر چھوڑ کر، بہ سرِیدہ ایک ہم عمر غلام کے ساتھ شہر کی ایک سرا میں داخل ہوتے ہی ایکا ایکی کسی محل کی کھڑکی سے جو سرا کے مقابل تھی، ایک معشوقہ کو دیکھ کر عاشق زار ہوگیا۔ یہ معشوقہ نوروز بیگ کی بیٹی تھی۔"

اس لڑکی معشوقہ کا بیاہ ایک بنگالی سے ہورہا تھا میرزا نے کسو ڈھب سے نوروز بیگ کی بیٹی کو گھر سے نکال کے شادی کی۔ نوروز بیگ نے شفقتِ پدری سے اس بات کو معاف کر کے، میرزا کے ساتھ بیاہ دیا۔

ذیل میں پہلے ایکٹ کا پہلا سین مکمل طور پر نقل کیا جاتا ہے۔ ڈراما نگار نے ایکٹ کے لیے داستان، سین کے لیے مکالے، اور ڈرامے کے لیے سانگ (سوانگ) کے الفاظ استعمال کیے ہیں:

جگہ وقوع اس معاملے کی شہر فیض آباد ہے

فہرست اشخاص کی

نوروز بیگ	بوڑھا جاگیردار، ساکن فیض آباد شہر کا
میرزا محمد علی	امیرزادہ، اتفاقاً شہر میں وارد ہوا
اسلام قلی	خدمت گار خاص، میرزا کا ہم عمر اور ہم جولی
غلام علی	چوب دار، نوروز بیگ کا وفادار لیکن بہرا
فیضو خان ساماں	نوروز بیگ کا بہت وفادار اور ذی شعور
حفیظ اللہ	توشکچی، نمک حلال لیکن سادہ لوح
جانی بیگم	نوروز بیگ کی لڑکی، معشوقہ میرزا محمد کی
بچھو	اناجانی بیگم کی، لڑکپن سے نوروز بیگ کی خدمت میں رہی۔
مشکبو	لونڈی جانی بیگم کی، معشوقہ اسلام قلی کی

داستان اول ۔ مکالمہ اول ۔ واقع شہر کے چوک میں

میرزا محمد علی داخل ہوتے ہیں ادھر ادھر ٹہلتے پھرتے گھبراہٹ سے۔

بعد اس کے اسلام قلی آن پہنچا۔

اسلام قلی : آپ کا یہ کیا حال ہے، کیوں چہرہ اداس نظر آتا ہے۔ غلام ابھی آپ کو خوش و خرم چنگا بھلا چھوڑ گیا تھا، اتنی دیر میں کیا ہو گیا کہ ایسی صورت بن گئی۔

میرزا محمد علی : ٹھنڈی سانس لے کر، کیا کہوں، میں عاشق ہوا ہوں۔

اسلام قلی : اگر ایسا ہوا تو ہم کو بھی مصیبتیں اٹھانی اور آہیں بھرنی ہوں گی۔ ہم خوب جانتے ہیں آپ کا عشق جیسا ہے۔ تھوڑے دنوں کے بعد سوا ہماری چھاتی نیلی ہونے کے کچھ اس کا اثر نہ رہے گا۔ گستاخی معاف، غلام

التماس کرتا ہے کہ آپ نے کتنے معشوقوں سے عشق بازی کی ہے۔ آپ تو باڑی کے بھنورا ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ پانسو سے کم نہ ہوں گی۔

میرزا: (جھنجلا کے) تھوڑ تیری اس سمجھ پر اور لعنت تیری بوجھ پر۔ چپ رہ مردود۔ اور میرے کام پر دل سوزی سے مستعد ہو۔ میں سواری باہر اس شہر کے چھوڑ کر، جس منزل میں آن اُترا ہوں، اس کے آمنے سامنے ایک کھڑکی کی اوجھل سے ایک آفتِ روزگار کو دیکھا ہے اور اس کا تیرِ نگاہ میرے جگر کے وار پار ہوا۔ جب تک اس سے نہ ملوں گا، چین نہ لوں گا۔

اسلام قلی: معلوم ہوا غلام بھی کسی طرح چین نہ پا دے گا، لیکن اس کا کچھ اچنبھا نہیں۔ ایسا ہی کچھ اور شہروں میں جہاں آپ وارد ہوئے اتفاق پڑا ہے۔ لکھنؤ میں بھی آپ لیلیٰ وشوں کو دیکھ کر مجنوں بن گئے۔ یہاں تک کہ لوگوں نے سمجھا آپ یہیں کے ہو رہے، بعد اس کے پھر فرخ آباد میں بھی ویسا ہی کچھ اتفاق ہوا۔ اور ابھی فیض آباد میں اُترتے ہوئے دو گھڑیاں نہیں گزریاں کہ آپ کو اگلی دیوانگیاں بھول گئیں پھر دوسرا سودا ہوا۔

میرزا: (سانس لے کر) تجھے کیا خبر ہے، اور کہیں دل جو لگانا تھا، وہ محض ہوس تھی۔ ایسا نہ تھا۔ یہ عشقِ صادق اور محبتِ واثق ہے۔ سوا وصالِ معشوق کے اس کا علاج نہیں۔ یہی بہتر کہ اب تم جا کر اس کا جلد ٹھکانا لگاؤ اور اس کے گھر کا پتا اور سب احوال جزو کل کا جو کچھ ہو، ٹھیک ٹھاک دریافت کر کے آؤ۔

اسلام قلی : پہلے غلام کی ایک عرض ہے۔

میرزا : کہو، کہو، جلدی کہو۔

اسلام قلی : اگر آپ کا ایسا ہی عشق ہے تو اپنی سرکار میں معشوقوں کے پیام و سلام کے لیے اور ہی طرح کے نوکر تجویز کیجیے مثل بادِ صبا یا کبوتر وغیرہ کے، جن کے تن پیٹ نہ ہو اور بھوک پیاس نہ لگے، اس واسطے کہ ہم سفر دور سے تھکے ہوئے، منزل کے مارے یہاں آن پہنچے ہیں اور ابھی تک نہ کچھ کھایا ہے، نہ دم درست کیا اور پھر تردد و تلاش کا حکم ہوتا ہے۔

میرزا : (ناخوش ہوکر) کیا سارے دن کھایا ہی کرتے ہو۔ سوا شوخی اور تکرار کے کچھ بات نہیں آتی۔ بیل نہ کودا کودے گون، یہ تماشا دیکھے کون۔ جا جا، ابھی، جس طرح سے ہو تلاش کر، ان باتوں میں سوا سے مار کھانے کے کچھ نہ ملے گا۔

مکالمہ دوم

میرزا صاحب تنہا باخود یہ تکلم کرتے ادھر ادھر گھبراہٹ سے چلتے پھرتے :

اس زلف سے اس دل کے لگ جانے کو کیا کہیے
کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہیے

اتنے میں نوروز بیگ صاحب پھرتے پھرتے یہاں آ نکلے۔ اتفاقاً مرزا صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ دید وا دید ہوتے ہی آپس میں جھجک رہ گئے۔ ایک نے دوسرے کو پہچانا۔ بعد لحظے کے باہم ملے۔

نوروز بیگ : یہ نعمت غیر مترقبہ کہاں سے بوجھا چاہیے۔ مزاج مبارک تو خوش رہا۔

میرزا محمد علی : الحمدللہ، بہر حال جائے شکر ہے کہ آپ کا مزاج شریف تو خوش ہے۔

بیگ صاحب : دعا کرتا ہوں۔

میرزا صاحب : آپ کا تشریف لانا اس شہر میں کس تقریب سے ہوا۔ اور یہاں کب وارد ہیں۔

بیگ صاحب : جب سے نجف خاں بہادر کی رفاقت چھوڑی۔

اُردو کا نامِ مُور

انوارِ سہیلی : ۱۷۶۶ء سے قبل

انڈیا آفس لائبریری لندن میں ملا حسین ابن علی الواعظ الکاشفی کی انوارِ سہیلی کے اُردو ترجمے کا ایک خطی نسخہ ہے جو یقین ہے کہ سنہ ۱۷۶۶ء سے پہلے اُردو کے لباس میں جلوہ گر ہوا۔ اس کے سرورق پر مندرجۂ ذیل عبارت ہے :

"RANDOLPH MARRIOTT, 1766"

THE KULILAH DUMNA OR PILPAY'S FABLES IN THE MOORS LANGUAGE SPOKEN IN BENGAL BUT WROTE(?) IN THE PERSIAN CHARACTERS.

مترجم کا نام نامعلوم ہے۔ اور اس نے صرف پہلے چار ابواب کا ترجمہ کیا ہے۔ عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ مترجم دکن کا رہنے والا ہے یا اس کی زبان پر دکن کا اثر ہے۔ مخطوطے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کسرہ یائے مجہول کے لیے استعمال ہوا ہے مثلاً "نِ"۔ "نے" کے لیے یا "پڑنِ والِ" "پڑھنے والے" کے لیے۔ اسی طرح

"س" کے بجائے "ث" ، "ط" کے بجائے "ت" اور "سے" کے بجائے "ثِ" لکھا ہے۔

عبارت کا نمونہ یہ ہے:

"شروع کرتا ہوں میں اِث کتاب کو خدا ای کہ نام پر کیسا خدا کہ جہانتک موجودات آسمان و زمین کہ درمیان ہیں، رات و دن اس کی سفت کہتے ہیں اور اٹھارہ ہزار عالم اسکی مہربانی و بخشش ستی جیوتے ہیں۔ اور وہ خدا بزرگ ایک ہے۔ کیسا بزرگ کہ آدمیوں کہ بدن بیچ بیٹھا کر زبان پر گویائی بخشتا ہے اور بندِ سب کہ دل کو روشن کر کہ حکمت کا جواہر دیا ہی اور وہ خدا صاحب ایک ہی کیسا صاحب کہ اپنی محبت کہ واستے ایک نیک بندِ کو پیدا کر کہ تمام خلق اللہ کا سردار کیا ہی اور اُت بند کہ شان موں فرمایا ہی کہ ای محمد جو تجھکو نہیں پیدا کیا ہوتا میں تو پیدا نہیں کیا ہوتا آسمان و زمین کو آری محمد وہ شخص ہی کہ پیدائش کہ روز ستی قیامت کہ دن تک جو کچھکہ دونون جہان کہ درمیان ہی اسکہ نام کہ سبب زینت پایا ہی خدا کا سلام اُث محمد کہ اوپر اور ان کہ اولادوں کہ اوپر دیاروں کہ اوپر ہوجیو۔ اللہ تعالی نِ قران کے بیچ فرمایا ہی ای محمد مر بندہ سبھون کو گناہ کہ جنگل ثِ وگمراہی کہ میدان ستی ثواب و نیکی کہ راہ موں راہنمائی کرکسو امت کہ بدن کہ سرکش کھوڈِ کو حکمت کا چابک بن مار سیدھا نہیں ہوتا ہی اور خود پسندے کا آدمی نصیحت کہ بغیر سنِ اپنا بدخوئی کو نہیں چھوڑتا ہی اور جیسا کہ نوسکھہ کھودِ پر بغیر نرمی اسوار ہونان اور اسکو ایکبارگی راہ پر لآدنان مشکل ھی اسیوجہ جو لوک کہ خدا کہ حکم اور منع سون غافل ہوکر چارپایہ جانوروں کہ وجہ کھانِ و پیونِ موں مشغول ھیں ان سبھونکو بھی بدون نصیحت و حکمت نیکی و ثواب کہ راہ پر لآدناں مشکل ھی اری حکمت ستی سخت کام آسان ہوتا ہی اور نصیحت ثِ گمراہ آدمی عقل

پاد تا ہی جو شخص کہ حکمت جانتا ہوگا و نصیحت کی باتکو شوق کہ کان مون سنتا
ہوگا وہ شخص بہت بہتر و عقلمند ہوتا ہوگا ایک بزرگ نِ فرمایا ہی کہ نصیحت کا
کرناں جاہل آدمی کِہ حال پر نہایت مہربانی ھی اما کرنِ والِ کو لازم ہی کہ
اس وجہ نصیحت کی باتیں کہِ کہ ہر یک شخص اپنی عقل کِہ مافق اُٹ نصیحت کہ
سنِ سی فایدہ ایک پاوِ جیسا کہ قرآن کی نصیحت کہ اُسکِہ کہنِ و سنِ سُون کہن والِ
و سنِ والِ دونوں شخص کُو دین دین و دنیا کا فایدہ حاسل ہوتا ہی مُصنّف نِ
قرآن کی تعریف ایک بیت کہ درمیان اسیوجہ کہا ہی قرآن ایک باغ کِہ مانند
و ہر یک لفظ اسکا مثال ایک پہول کِہ ھی کیسا پہول کِہ ظاہر بیں آدمیونکا دل اُسکِہ
رنگ سُون اور خبردار لوگونکا جیو اُسکہ معنی سنی خوشوقت ہوتا ہی

قانونُ النِّسا،

ذخیرۂ اشپرنگر جرمنی

یہ دو رسالوں کا مجموعہ ہے۔ پہلے رسالے میں اُن مسائل کو بیان کیا گیا ہے جن کو عورتوں کی شریعت میں واجب و فرض کا درجہ دیا گیا ہے۔ اُن کے مجتہدوں کے اقوال اور فتوے بھی درج کیے گئے ہیں اور تفصیل کے ساتھ اُن امور کو بیان کیا گیا ہے، جن کی پابندی کرنا اور جن پر اعتقاد رکھنا ہر "صحیح العقیدہ اور نیک بخت عورت" کے لیے لازم تھا۔

دوسرے حصے میں ٹونے ٹوٹکے، نذر نیاز اور منتوں مرادوں کا ذکر ہے اور تفصیل کے ساتھ اِن امور کو بیان کیا گیا ہے۔ مختلف قسم کی نیازوں اور چڑھاووں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اُن کی پابندی کی فضیلتیں بیان کی گئی ہیں۔

یہ رسالے، اُن توہمات کے آئینہ دار ہیں جو ایک زمانے میں عورتوں کے عقائد کا حصہ تھے، اور جن میں سے بعض آج بھی کسی نہ کسی صورت میں کارفرما نظر آتے ہیں اور اُس معاشرت کو ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں، جس میں اس طرح کی رسموں، عقیدوں اور وہموں کو نشو و نما پانے کا موقع ملتا تھا۔

ان رسالوں کے آخر میں کوئی ترقیمہ موجود نہیں، نہ ایسی اور کوئی صراحت ہے جس سے مصنف یا زمانۂ تصنیف کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم کی جا سکے۔ البتہ زبان اور اندازِ خط سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ انیسویں صدی کے اوائل کی تصنیف ہوں گے۔ ان مخطوطوں کے عکس ذخیرۂ اشپرنگر (جرمنی) سے حاصل کیے گئے ہیں۔

یہ دونوں رسالے تمام و کمال پیش کیے جاتے ہیں:

خ ا ف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ رسالہ ہے آداب اور اطوار کا کہ رنڈیوں کو اس پر اعتقادِ کُلّی ہے اور اِن کو واجبات سے جانتیاں ہیں، اور جس وقت ایک چیز اِن میں سے بھول جاویں، گویا ترکِ واجب کا کیا ہے۔ اور اِن کے پاس پانچ عالم ہیں، کہ اُن کو علماے خمسہ کہتیں ہیں: پہلا، کلثوم ننہ۔ دوسرا، شہر بانو ددا۔ تیسرا، ددا بزم آرا۔ چوتھا، باجی یاسمن۔ پانچواں، خالہ کلبری۔ اِن کے سوا، اُن کے نزدیک دو عالم اور ہیں، کہ خالہ جان آغا اور بی بی جان افروز اُن کا نام ہے۔ پندرھواں باب اِس کے، اور کچھ اخیر کو لکھ کے تمام کیا ہے اور اس کا نام قانون النّسا رکھا ہے۔

پہلے باب میں واجبِ مطلق اور واجبِ عینی اور واجبِ کفائی کا احوال ہے۔ دوسرے باب میں سُنّتِ موکّدہ کا حال لکھا ہے۔ تیسرے باب میں واجب اور سُنّت روزوں کا بیان کیا ہے۔ چوتھے باب میں شبِ زفاف اور خاوند جورو کی رسموں کا ذکر ہے۔ پانچویں باب میں مکر کا بیان ہے کہ بعضے وقت وہ کر بیٹھتی ہیں۔ چھٹے باب میں عورتوں کی جنتے وقت کی ریتیں ہیں۔ ساتویں باب میں نہانے کا اور حمام جانے کا اور جو چیزیں کہ حمام سے علاقہ رکھتی ہیں، اُن کا تذکرہ ہے۔ آٹھویں باب میں گانے بجانے کا اور جدا جدا نئے نئے سازوں کا ذکر کیا ہے۔ نویں باب میں پکوان اور پریوں کے دسترخوان کا، اور سمنو، اور ابو دردا، اور زرد چانولوں پر بیمار کے واسطے نیاز دلانے کا احوال ہے۔ دسویں باب میں خاوند

اور جورو کا، بہو اور ساس اور نند کا، اور سسرال کی طرف کے لوگوں کا سلوک خرچ کیا ہے۔ گیارھویں باب میں نظر گذر کے واسطے نئی نئی رسمیں نکالی ہیں۔ یعنی کچی کیوڑ، اور مہرہ کُسِ گربہ، اور نفس اُلاغ، اور شیر و گرگ کے ناخون، اور نیلے کپڑے کا بیان ہے۔ بارھویں باب میں محرم نامحرم کی حالتیں کھولی ہیں۔ تیرھویں باب میں دُعا مانگنے کے وقت بیان کیے ہیں کہ کون سے وقت دعا قبول ہوتی ہے۔ چودھویں باب میں مہمانوں کے آنے جانے کا ذکر کیا ہے۔ پندرھویں باب (میں) منہ بولے بہن اور بھائی کرنے کا تذکرہ ہے اور آخر میں اس کتاب میں کچھ کچھ اور لکھا ہے۔

پہلا باب، کہ عورتیں ناقص عقل جس کو واجبِ مطلق جان کر، اُس پر عمل کرتی ہیں:

چہار شنبے کے روز ایک گھڑا یا آبخورہ پانی سے بھر کر، جس وقت کہ آفتاب غروب ہونے لگے، اُس گھڑی کو کوٹھے پر چڑھ کر گلی کے بیچ میں اس طرح سے پھینکے کہ ٹوٹ جاوے؛ اُس گھر کے آدمیوں کو نوبت نہ آوے اور کسی بلا میں گرفتار نہ ہوویں۔ بلکہ دادا بزم آرا اُس کو واجب جانتی ہیں کہ پیشاب اُس باسن میں ہووے، باقی اور مجتہدوں کے نزدیک سُنّتِ موکّدہ ہے۔ لعنت ہے اُن کے اعتقاد پر۔

اور دادا شہر بانو نے کہا ہے کہ اُس کے پھینکتے وقت یہ نیت کرے کہ ”اس کوزے کو نیچے پھینکتی ہوں میں تو اس ہفتے تک قضا آئی ہوئی پھر جاوے“۔ اور باجی یاسمن نے پیشاب کے بدلے خوشبو جائز رکھی ہے۔ یہ بات خالی از قوت نہیں ہے۔

اور عید با شجاع کے روز دف بجانے کو، گانے کو، خوشی کرنے کو، ساتوں عالم واجبِ عینی جانتی ہیں۔ اور اس کتاب لکھنے والے کے نزدیک یہ بات نہایت خوب ہے، کہ شعبان (شیعیان ؟) امیر المؤمنین علی علیہ السّلام کو خوشی کرنا، جس طرح

سے ہو، واجب ہے۔

اور جس کے گھر میں کہ میت ہو جاوے، چار شنبے کو یا شنبے کو کوئی اُس کے پھول کرے؛ یقین ہے کہ اسی ہفتے میں کوئی اُس گھر کا جان سے جاوے۔ یہ بات واجبِ کفائی[1] ہے، باجی یاسمن اور شہر بانو دد ا نے مرغ کے انڈے تجویز کیے ہیں۔

اور سب عالموں کے نزدیک یہ بات بھی واجبِ کفائی ہے کہ رمضان کے آخری جمعے کو، جس میں الوداع پڑھی جاتی ہے، تمام عورتیں اچھے اچھے کپڑے پہن کے، عطر لگا کے، خضاب[2] اور وسمہ کر کے مسجدوں میں خصوصاً جامع مسجد میں جاویں؛ کس واسطے کہ اِن کے نزدیک ثواب اس کا سب سے زیادہ ہے، اور بڑی بات یہ ہے کہ وہاں جوان رعنا، گل عذار، لالہ رخسار اکثر جمع ہوتے ہیں، اُن سے مطلب دل حاصل ہوتے ہیں۔ اور وہ رنڈیاں وہاں گرد بیٹھ کے، ہر یک بارہ بارہ بتّیاں چراغ کے واسطے بٹتی ہیں۔ اور روشنی کے وقت لازم ہے کہ برقع مُنہ سے اُٹھاویں اور پانو کی اُنگلیوں کو دِکھاویں، تا لوگ اُس کی ادا پر فریفتہ ہوویں۔ اور جو کوئی ان بتّیوں کا بنانا بھول جاوے، تو پھر اُس کو قضا کی نیت سے بناوے۔ اور جو جان کر (نہ) بناوے تو کفّارہ اور قضا ادا کرے۔ بی بی جان افروز کے نزدیک فقط کفّارہ واجب ہے، اور باقی سب مجتہد دونوں کو واجب جانتی ہیں۔ لازم ہے کہ جس چراغ کو روشن کیجیے تو وہ جب تک آپ سے نہ بجھے، اُس کو نہ بجھایئے بلکہ اُسی روز دو رکعت نماز کی واجب ہے کہ ادا کیجیے کہ جلد اپنے مطلب کو پہنچیں۔

اور جس مسجد میں کہ دردمند زیادہ ہوتے ہیں، اِن کے نزدیک ثواب اُس کا

---

[1] بہ ظاہر یہ خیال ہوتا ہے کہ یہاں کچھ عبارت چھوٹ گئی ہے۔ [2] مخ: خطاب۔

بہت ہے، بلکہ فرصت پاکے نوجوانوں کے ساتھ مشغولِ بازی ہونا اور روزہ توڑنا، اُس روز کے روزہ رکھنے سے بہتر ہے۔ اور اگر کوئی نازنین اُن جوانوں کی صحبت میں پھنس کے، دیر کے بعد اپنے گھر میں جاوے تو اس کے خاوند کو لازم ہے کہ کچھ شکوہ زبان پر نہ لاوے اور اُسے منع نہ کرے۔ کس واسطے کہ اُس روزِ مبارک کے ثواب سے کہ جو اُس کی جورو نے کیے ہیں، وہ محروم رہے گا۔

باجی یاسمن اور دوا بزم آرا اور شہر بانو دوا کے نزدیک یوں ہے کہ اُس چراغ روشن کرنے کے وقت جو کھول کے اپنی رانیں دکھلاوے تو دوزخ کی آگ سے وہ بچی رہے گی۔ کلثوم ننہ کہ ان سب مجتہدوں میں بزرگ ہیں، وہ کہتی ہیں کہ جو چیزیں کہ ہم نے جائز رکھی ہیں اور واجب کی ہیں اور سُنّت کی ہیں، ان پر جو کوئی انکار کرے، وہ کبھی بخشا نہ جائے گا، اور وہ عورت کس امید پر گھر میں اپنے خاوند کے رہے گی اور دوا بزم آرا کا یہ قول ہے کہ میں نے اپنے ابلیس استاد سے دریافت کیا ہے: جو مرد اپنی عورت کو زیارت کرنے کے واسطے اور مسجد اور تکیوں میں اور اپنے مُنہ بولے بہن اور بھائیوں کے گھر جانے کے لیے، کہ ان میں بعض باتیں واجب ہیں اور بعضی سُنّت ہیں، منع کرے؛ وہ مردود ہوگا اور اُس عورت کے میکے والوں کو لازم ہے کہ اُس مرد کو قاضی کے گھر لے جاکے، اُس کو طلاق دلوا دیں، پھر وہ مختار ہے اپنی، جہاں چاہے وہاں جاوے اور شوہر اُس کا خرچ اور اصیل اس کو دیوے۔ اگر اتفاقاً وہ عورت غصّے سے مرجاوے تو اُس کے خاوند کی اور اس کے عزیزوں کی گردن پر خوں بہا اُس کا ہوگا۔

اور یہ بھی ان کے نزدیک واجبات سے ہے کہ جس بیمار کے دروازے پر سے کوئی مُردہ نکلے، تو اُس بیمار کے ہاتھ پانو کو اُس وقت مہندی لگاکے دھوئیں اور اُس کا پانی تابوت کے پیچھے پھینکیں اور خود وہ بیمار اُٹھ کے سات قدم اس جنازے

کے ساتھ چلے ؛ یقین ہے کہ اس کی بیماری جا (دے) ۔

اور خالہ جان آغا نے یوں کہا ہے کہ جو مرغ بے وقت اذان دے، اس کو مار ڈالیں۔ اور یہ بھی اُن کے نزدیک (کذا) چہل منبری کرنا واجبات سے ہے، بلکہ یہاں تک اُن کا عقیدہ ہے کہ اگر چہل منبری کرنے میں کوئی عورت جن پڑے تو اُس کی بڑی بزرگی ہے۔ اگر لڑکا ہو تو نام اُس کا عاشوری رکھیں گے کہ وہ بہشتی ہوگا اور لڑکی کو خانم جان آغا کہیں گے کہ وہ قیامت کو چالیس آدمیوں کی شفاعت کرے گی۔

جس جگہ پر کہ بہت سے جوان ہوویں، وہاں عورت خوب صورت کا جانا بڑا ثواب ہے۔ اس میں اگر کوئی اپنی عورت کو منع کرے تو یہ ساتوں عالم اُس کی دشمن ہوویں گی۔

اور فال گوش کا لینا بھی ان کے نزدیک مستحب ہے۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ شب چار شنبہ کو چوراہے میں جا کے بیٹھے، جو کوئی راہ رو کچھ بولے، اُس بولے سے اپنا نیک و بد پہچان لے۔ اور دوسری وضع یہ ہے کہ آرسی اور تھوڑی سی مٹھائی دامن میں رکھ کے قفل دے دیتی ہیں، جو اُدھر سے ہو کے نکلتا ہے، اُس سے کہتی ہیں کہ یہ کنجی لے اور قفل کھول دے۔ اگر وہ مرد خوب صورت ہو تو چاہیے کہ اُس عورت کی پیٹھ چومے، بلکہ بہ رغبت جو بوسہ لے گا تو اُسے یقین ہوگا کہ مطلب جلد بر آیا۔ اور اگر قفل کھولنے کے وقت اس عورت کے اندام نہانی پر دست چالاکی کرے گا تو کچھ اندیشہ نہیں ہے، وہ کچھ نہ بولے گی، مرد جو چاہے سو کرے۔ عورت کے بولنے میں یہ قباحت ہے کہ پھر اپنی مراد کو نہ پہنچے گی۔

اور یہ بھی اُن کے یہاں واجبات سے ہے کہ جس عورت کو رات کے وقت تپ آتی ہو، ایک اور آدمی شب کے وقت کوٹھے پر چڑھ کے پکار کے کہے کہ اے پہاڑ

کے اوپر والے لوگو اور اے پہاڑ کے نیچے رہنے والے لوگو! ایک مہمانِ عزیز آیا ہے، اُس کو کیا دیویں؟ اسی طرح تین دفعہ اس بات کو کہے۔ پہلی بات واجب، دوسری مستحب، تیسری سُنت ہے؛ اس میں جو کوئی کچھ مانگے، اُن کو وہی دے کہ شفا جلدی ہووے گی۔ اس بات میں کچھ چارہ نہیں کہ مجربات سے ہے۔

کلثوم ننہ کے نزدیک یوں ہے کہ جو ایک رات تپ کہنے میں تپ نہ جاوے تین راتیں اسی طرح سے کہے، اس کے برخلاف نہ ہو۔ چنانچہ یہ بات مشہور ہے کہ ایک خوب صورت عورت کو رات کے وقت تپ آتی تھی، اس کی ما اسی طرح شب کو کوٹھے پر چڑھ کے پکاری۔ ایک مردِ ظریف نے کہا کہ مردِ بیگانہ دے اس کو۔ اس کی ما بولی کہ مجھے اپنی لڑکی نہایت عزیز ہے، میں اُس کو اس فائدے سے محروم نہ رکھوں گی۔ خاوند نے اُس کے قبول نہ کیا۔ تب لاچار ہو کے اُس لڑکی کی ما نے اور اُس کی عزیزوں نے سب مل کے مشورت کی کہ اپنے مجتہدوں کے قول سے پھرنا، گنہ گار ہونا ہے؛ آخر کو اُس کے خاوند سے طلاق دلوا دی۔

اور یہ بھی واجبات سے ہے کہ جب آفتاب حمل میں آوے تو چاہیے کہ دسترخوان یا خوانچہ رکھیں، اور اگر رات کا وقت ہو تو چار شمعیں چاروں کونوں میں روشن کریں، اور چاہیے کہ اس دسترخوان پر سات طرح کے میوے ہوں اور سبزی اور کالا دانہ اور تل اور سپستان اور سب طرح کی ترکاری اور دہی کا پیالہ اور کچھ کھانا اور حلوا اور کلچہ اور مرغِ کشتہ اور انڈے مرغ کے رنگے اور سادے، یہ سب چیزیں ہوویں۔

اور کلثوم ننہ کے عقیدے میں ہے کہ عید کے دن دسترخوان پر ایک انار توڑ کے، بارہ بارہ دانے سب مل کے کھاویں؛ دوسرے برس تک کوئی گزندی بلکہ مچھر بھی اُن کو نہ کاٹے گا۔

اور وقت تحویلِ آفتاب کے سوئی تاگا لے کے لازم ہے کہ کچھ کپڑا سینے میں مشغول ہے اور اشرفی، روپیہ خواہ گیہوں، جو کچھ بہم پہنچے، اُس کو اس وقت ہاتھ میں رکھے ور ان میں سے جو ایک چیز بھی کم ہوگی، وہ سال اس پر بُرا گزرے گا۔

اور باجی یاسمن نے یوں کہا ہے کہ ماہِ مبارک رمضان کی روٹی نوروز کی رات و دسترخوان پر رکھنا واجب ہے، لیکن اور سب اس کو سُنّت جانتی ہیں۔ اور شہر بانو ددا لعنت کی ماری سے یوں روایت ہے کہ اس روٹی کو پانی میں رکھے اور بکری قربانی کر کے کھاوے، اُس سال بھر اُس کے گلے میں درد نہ ہوگا۔ یہ قول وت رکھتا ہے۔

اور کہا ہے کہ نئے سال کے روز کلیچہ اور تنکی گھر میں نہ پکاوے، کس واسطے کہ برکت اُس کے گھر سے جاتی رہے گی۔

اور جس وقت کوئی مر جاوے تو لازم ہے کہ اپنے گھر کے اور سب ہمسایوں کے باسن پانی کے تڑوا ڈالے۔ اگر اس میں سے کوئی پانی پیے گا تو اُس کے گلے میں درد مقرر رہے گا، یہ بات بہت استحکام رکھتی ہے۔

اور اُن کے سب مجتہدوں کا یہ قول ہے کہ پنجشنبے اور شنبے (کذا) کے روز روئی اور آبخورہ گھر میں نہ لاویں، اور بیمار کے دیکھنے کو نہ جاویں۔ چہارشنبے کے روز چرخہ نہ کاتیں۔ یکشنبے کی رات کو چراغ کی بتّی نہ بٹیں۔ جمعے کے روز روئی اور لکڑیاں گھر میں نہ لاویں، اور کپڑا نہ دھوویں۔ جو شخص شنبے کی رات کو کہیں رہے، وہ یکشنبے کی رات کو بھی وہیں رہے اسی طرح پنجشنبے کی رات جو شخص کہیں گزارے، وہ جمعے کی رات بھی وہیں گزارے۔ سہ شنبے کی رات جو کہیں کاٹے، وہ چہارشنبے کی رات بھی وہیں کاٹے۔

دوسرا باب ۔ اِس میں جو چیز کہ ساتوں عالموں کے نزدیک سُنّت موکّدہ ہے، اُس کا احوال ہے اور اُس کے مستحب ہونے کی تصریح کی ہے :

ان عورتوں کے نزدیک نذر و نیاز کا بڑا ثواب ہے۔ اُن میں کی ایک یہ ہے کہ اُس کا نام سمنو ہے۔ اُس کی ترکیب یوں بیان کرتی ہیں کہ گیہوں کُرسی پہ یا تختے پہ پھیلا کے اوپر اُس کے کپڑا اُڑھا دیں اور ہر روز ایک بار پانی دیویں تا وہ ہرے ہو جاویں۔ سب اپنی دوستوں کو اور عزیزوں بلوا دیں، اور بلوانے کے وقت ہرا پتّا اور الائچی کے دانے بھیجنے مستحب ہیں۔ اور جو عورتیں کہ وہاں آویں وہ ایک ایک قینچی ہاتھ میں لاویں اور رو بہ قبلہ بیٹھ کے اُس کو کاٹیں: اُس وقت جو مراد چاہیں سو مانگیں۔ غرض اُن گیہوؤں کو کاٹ کے اُس کے ریشے کو حمام دستے میں کوٹ کے، وہ سب شیرہ دیگ میں ڈال دیں اور اخروٹ اور بادام بھی ملا دیں، اگر گیہوں ایک من ہو تو چوتھائی آٹا اُس میں داخل کریں۔ اس سے کم ہوں تو اچھے نہیں (کذا)۔ اُس وقت آگ اُس دیگ کے نیچے جلا کے، راگ اور ناچ شروع کریں اور کھیلیں؛ لیکن دو عورتوں کا کھیلنا اچھا ہے۔ لازم ہے کہ رات بھر جاگتی رہیں۔ جو دعا اُس رات مانگیں گی، وہ ضرور جنابِ الٰہی میں قبول ہوگی۔ جس وقت آفتاب نمود ہونے لگے تو خوشبوئیاں ضرور ضرور روشن کریں، کس واسطے کہ اُس وقت حضرت بی بی تشریف لاتی ہیں اور اپنا ہاتھ اُس پر پھیرتی ہیں، چنانچہ اُن کی انگلیوں کا نشان ظاہر ہوتا ہے۔ دن کو اُس کا سرپوش کھولیں، درود بھیجتی جاویں، اور اگر لُبان روشن ہو تو اور بہتر ہے، اُس کو پیالوں میں کر کے گھر گھر تقسیم کریں۔ لیکن ددا بزم آرا کے نزدیک شخص بھی اُس سمنو پر پھر کا کنا ثواب عظیم ہے۔ لازم ہے کہ جس وقت وہ حصّے کا باسن خالی کریں، کچھ خوشبو اس میں ڈال دیویں کہ خالی بھیجنا اچھا نہیں۔

اور اس سمنو کا وجہ تسمیہ یہ ہے کہ بعضوں کے نزدیک اصل میں سمن نو تھا، استعمال کے باعث سے سمنو ٹھہرا۔ اور تمام عالم اس فن کی قائل ہیں کہ اوائل میں تیس من آٹا تھا اور ایک من گیہوں، اس لیے نام سمنو رکھا تھا۔ مگر ددا بزم آرا اور شہر بانو ددا اس بات پر ہیں کہ تیس من آٹا تھا اور تین من گیہوں، اس واسطے اسے سمنو کہتے ہیں۔ کلثوم ننہ کے نزدیک یوں ثابت ہے کہ یہ چیز تین چیزوں سے پکتی ہے، یعنی آٹا اور گیہوں اور پانی اس میں ملتا ہے، اس لیے اس کا یہ نام رکھا ہے۔ یہ قول البتہ صحیح ہے۔

جو عورت کہ سمنو پکا وے اور کبھی ناغہ نہ کرے، اگر خاوند اُس کا اُسے خرچ نہ دیوے تو اُسے لازم ہے کہ جو چیز گھر کی ہو، اُس کی بے اجازت لے لیوے اور اس نیاز میں اُٹھا وے، کچھ خدا کے نزدیک اس کا مواخذہ نہیں ہے، یہ نذر اور نیاز عقبیٰ میں اس کی مددگار ہوگی۔ اسی طرح ان سب کاموں کے واسطے یعنی اپنی منہ بولی بہنوں کی ضیافت کرے، یا زیارتوں میں خرچ کرے، یا حمام میں کھانے کھائے، یا تکیوں کی سیر کرے، جہاں سے جس طرح پاوے، لے لیوے، اُس کو حلال ہے۔

اور دسترخوان پریوں کا بھی مخصوص ہے اُس کے واسطے جس کے لڑکا نہ ہوتا ہو۔ اُسے لازم ہے کہ ایک اکیلے مکان میں جہاں کوئی پھٹکنے نہ پاوے، سات طرح کا کھانا ایک خوان میں یا دسترخوان میں، اور طرح طرح کے میوے کچھ حلوے کی قسم سے، کچھ کلیجے، کچھ دودھ کے پیالے بھرے ہوئے، قند کا شربت بید مشک اس میں پڑا ہوا ہو، وہ لا کے چن دے اور ایسی چار بڑی بڑی شمعیں شمع دانوں میں روشن کرے کہ صبح تک نہ بجھیں۔ صبح کو وہ مالک اُس دسترخوان کو جا کر دیکھے، جس چیز میں سے کہ پریوں نے کھایا ہو، اسے چاہیے کہ

ہر سال اُسی کو اُتنا ہی پکایا کرے اور اپنی منہ بولی بہنوں کو اور ہمسایوں کو کھلایا کرے، جلد اپنے مطلب کو پہنچے گی۔ لیکن یہ دستر خوان پنجشنبے کو ہوتا ہے۔

کلثوم ننہ نے بیان کیا ہے کہ جس کے لڑکا نہ ہوتا ہو، وہ چارشنبے کی رات کو کسی موئے کتے کے منہ میں موتے۔ اور شہر بانو دوا نے لکھا ہے کہ سُنار کے باسن میں یا حمام میں پیشاب کرے۔ اور دوا بہرام آرا اور باجی یاسمن کے نزدیک یوں ہے کہ جس جگہ پر حمام کا پانی بہتا ہو وہاں جاوے، ایک چلو بھر کے پیے، سات بار اپنے پانو کو دھووے اور اُلٹے پانو وہاں سے گھر کو پھرے، لیکن رستے میں اُدھر کو پھر کے نہ دیکھے۔ اور باقی مجتہد اس بات پر ہیں کہ حمام کے کوٹھے پر جا کے ایک پیالہ پانی کا پیے اور تھوڑی سی مٹھائی اُس کے خزانے میں گرادے؛ جو شادی کی آواز نکلے گی تو اس کے لڑکا ہوگا اور جو مختلف آوازیں آویں گی تو وہ نامحروم رہے گی۔ بی بی جان افروز نے یوں فتویٰ دیا ہے کہ جو حمام میں حمامی بوڑھا ہو، اُس کو تھوڑی سی مٹھائی دے اور کسی سے کلام نہ کرے، وہ اگر چھل بڑی کا پانی اس پر گراوے گا (کذا) تو یقین ہے کہ مطلب اُس کا بر آوے گا، مگر کسی سے ہم کلام نہ ہو۔

اور ایک آش ابودردا ہے کہ اُس نیاز کو چارشنبے کے روز صفر کے مہینے میں کرتی ہیں، خصوصاً آخری چارشنبہ، اس کا بڑا ثواب ہے۔ اور دوسرے زرد چانول ہیں کہ ان لعینوں کی بدعت ہے۔ کلثوم ننہ کہتی ہیں کہ محرم کے مہینے میں ہووے تو بہتر ہے۔ شہر بانو دوا نے چہلم تک تجویز کیا ہے۔

اور ایک نیاز آش کیا؟ ہے کہ وہ بیماری کے واسطے ایجاد کی ہے، اور دوسری حلوا نہیں (کذا) کہ ممنو کے آٹے سے پکایا جاتا ہے۔ اور ایک آش بہلول ہے، اس قدر وہ مشہور ہوئی ہے کہ اُس کا احوال بیان کرنا ضرور نہیں ہے۔

اور ایک یہ بھی اِن کے نزدیک گناہ ہے کہ چار شنبے کے روز عورتیں نئی چادر نہ اوڑھیں (؟) اور دیگ سمنو کی اور آش ابو درداکی اور زرد چانوں کی اور آش بہلول کی اور آش (؟) کی ننگے پانو خدمت کرنا مستحب ہے۔

اور شہر بانو دوا نے تجویز کیا ہے کہ جمعے کی رات کو کپڑے کا بخیہ نہ کھولے۔ اور اگر تحویل دن کو ہو خواہ رات کو، شمع کا جلانا سنّت ہے۔

تیسرا باب، اِس میں لڑکیوں کے بخت کھلنے کا احوال ہے:

دو روٹیاں تنور سے نکالیں کہ جو مل گئی ہوں اور لڑکی کے سر پر ماریں، اگر وہ جدا ہو جائیں تو اُس کے نصیب جلد کھلیں گے۔ اور جس لڑکی کی شادی ہو تو وہ تھوڑی چینی ہاتھ میں لے کے خاوند کے گھر داخل ہو، دولھا کے گھر اُترنے کے ساتھ ہی وہ چینی پیچھے پھینکتی جاوے اور یہ کہتی جاوے نام بہ نام کہ فلانی لڑکی کے نصیب کھلیں۔

اور بن بیاہی لڑکی کو لازم ہے کہ جب نیا چاند نظر پڑے تو وہ کوّے کو دیکھے تا اُس کے بخت جلد کھلیں۔ اور یہ بھی مجربات سے ہے کہ جس کی ہتھیلی کھجلاوے وہ اُس لڑکی کا سر سہلاوے کہ جس کے ما اور باپ دونوں جیتے ہوں، مقرر اُس روز اُس کے ہاتھ کچھ روپے آ دیں گے۔ اور اگر کتّا کسی ٹکلی کو پکڑے تو اُسے چھین کے رومال کے کونے میں باندھ رکھے، ضرور اُسی روز روپے ملیں گے۔ اور اسی طرح اگر دامن اُس کا ہوا سے اُڑے تو لازم ہے کہ اُس کو چوم لے، مقرر اُس دن روپے پاوے گا۔

اور جس کسی کا کچھ کپڑا پھٹ جاوے اور وہ بدن اپنے میں پہنے ہوئے سلوانے کا قصد کرے، تو کوئی چیز منہ میں اُس وقت رکھ لے۔ اور جس وقت کہیں آگ لگے تو لازم ہے کہ تین مرتبہ تخ تخ کہے، شعلوں کا نکلنا موقوف اُس میں

سے ہو جاوے گا۔ اور جس وقت موذّن سے اذان سنے تو ان کے نزدیک سنّتِ موکّدہ ہے کہ انگشتِ شہادت کو چوم کے دو مرتبہ دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لیں۔ اِن ساتوں عالموں کا قول ہے کہ جو ہمارے کہنے کو ترک کرے گا، وہ دنیا اور عقبیٰ میں گنہ گار رہے گا۔

اور چاہئے کہ جو عورت پہلے روز شوہر کے گھر جاوے تو اُسے لازم ہے کہ اُسی روز اپنا سب بندوبست کر لے۔ اور اونٹ کا پالان شوہر کی پیٹھ پر رکھے، پھر وہ جو کام کرے گی، خاوند اُس کا اس سے کچھ نہ پوچھے گا۔

اور کلثوم ننہ کہتی ہیں کہ میں سخت حیران ہوں اُن عورتوں کو دیکھ کر جو تمام عمر ایک خاوند کے گھر میں رہتی ہیں، وہ کیا فائدہ اور کیا حظ دنیا میں رہ کے اُٹھاتی ہیں لازم ہے عورت کو کہ ہر سال نیا شوہر کرے اور نیا دانہ اور نیا پانی پیے۔

فصل، اِس میں بیان نماز و روزے اور وضو اور غسل اور تیمم کا، کہ جو انھوں نے ایجاد کیا ہے:

جس وقت کہ عورت حظاظ (؟) اور زرک زدہ اور مہندی لگائی ہوئی ہووے، وضو اور غسل اور طہارت اُسے نہیں چاہیے۔ اور اگر بہت خواہش نماز کی رکھتی ہو تو تیمم کر لے۔ بعضی کہتی ہیں کہ اُس حال میں نماز کا نہ پڑھنا خوب ہے بلکہ شہر بانو ددا اور خالہ جان آغا کے نزدیک سات دن تک نماز اُس کو لازم نہیں ہے۔ کلثوم ننہ نے دس روز تک تجویز کیا ہے، زیادہ اس سے جائز نہیں رکھا۔ یا جس وقت کہ اپنی منہ بولی بہنوں سے باتیں کرتی ہو یا نقارچی یا قوال گاتے ہوں تو اُس وقت بھی کچھ نماز کا پڑھنا درست نہیں۔

کلثوم ننہ کہتی ہیں کہ جب سیر سے فراغت پاوے اور نماز کو نہ پڑھے تو احتیاطاً کچھ بھی بد نہیں۔ ایک اُس کی مقلّد نے شہر بانو ددا سے پوچھا کہ کلثوم ننہ

بڑی مجتہد ہیں، وہ راگ سننے کے وقت نماز کو قضا کرنا بہتر جانتی ہیں، یہ مسئلہ کیونکر ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ جس چیز کی قضا درست ہے، اگر اُس کو ترک کرے تو اچھا ہے۔ یعنی اگر نماز وقت پر نہ پڑھے تو پھر اُس کو قضا کرکے پڑھ سکتی ہیں اور گانا سننے کے واسطے قضا نہیں ہے، اِس واسطے اِس کو اُس سے افضل جاننا چاہیے۔

اور جس عورت کے گھر میں ایک لونڈی ہووے اور وہ حمام جانے لگے تو اپنی ماں کو یا کسی اور کو اُس کی نگہبانی کے واسطے وہاں چھوڑ جاوے تا شوہر اُس کا اُس سے مقاربت نہ کرنے پائے۔ اور اگر اُس کے محرموں سے کوئی نہ ہووے، اُسے یقین واثق ہو کہ خاوند میرا اس کو نہ چھوڑے گا، تو اس پر واجب ہے کہ حمام جانا موقوف کرے۔ یا جس کے پاس لنگی اور کپڑے پُرانے ہیں تو اُس کو بھی حمام جانا درست نہیں ہے، کس واسطے کہ خدا پر اُس کا حال روشن ہے۔ جب تک یہ چیزیں نئی نہ ہوویں تو عورت کو حمام کرنا حرام ہے۔

اور بہت بیٹھنا حمام میں کلثوم ننہ کے نزدیک منع ہے کہ بدبو آنے لگتی ہے۔ اور جس کا خاوند جورو کو روپے حمام کے خرچ کے لیے نہ دیوے، تو اُس کو روزہ و نماز بھی نہیں واجب ہے، اگرچہ وہ مدت تک جنبی رہے (کذا)۔ لازم ہے اُسے کہ جو چیز گھر میں پاوے، بے اجازت اُس کی لے لیوے اور اِس خرچ میں لاوے۔ اور ہر روز ایک دفعہ اپنے خاوند سے لڑے، جب تک کہ وہ اُس کو خرچ نہ دیوے۔

اور تمام عورتوں کو واجب ہے کہ ذخیرہ اپنے پاس جمع کریں، کس لیے کہ شوہر اُن کے بے وفا ہوتے ہیں اور جلد طلاق دے دیتے ہیں۔ اتنی پونجی اپنے پاس رکھنی ضرور ہے کہ بعد طلاق کے چندے اپنے گھر میں بیٹھ کے کھاوے،

جب تک کسی اور شوہر فرماں بردار کے گھر میں جاوے۔

اور حالتِ شادی میں کہ جہاں راگ و رنگ ہوتا ہو، اُس جگہ جو عورتیں ہوں انھیں نماز پڑھنے کی کچھ احتیاج نہیں۔ اور جس کسی کی جورو کہیں شادی میں جاوے تو اس کے مرد پر واجب ہے کہ جس چیز کا مقدور ہو، اُس کے پیچھے بھیجے، کہ اس کو اصطلاح میں بیس یا کہتے ہیں۔

اور یہ واجب (ہے) کہ جس وقت رنڈی حمام میں جاوے اور اپنی منہ بولی بہنوں سے باتیں کرنے میں مشغول ہووے، تو نماز ساقط ہے، اور اگر نوجوانوں کے ساتھ ہم کلام ہوتی ہو اور نماز کا وقت قضا ہوتا ہو، تو اس کلام کو قطع نہ کرے، نماز اس روز نہ پڑھنے میں کچھ جاے خوف نہیں ہے۔

اور جو کوئی بڑھی رنڈی چار شنبے کی شب کو چرخہ کاتنے میں مصروف ہو اور تھوڑی روئی رہ گئی ہو، تو اس کو بھی نماز پڑھنا واجب نہیں۔ لازم ہے کہ اُس شب کا کاتنا اُسی شب کو تمام کرے۔ یا عورت اچھی پوشاک پہنے ہو اور رکوع و سجود میں اُس کے خراب ہونے کا اندیشہ رکھتی ہو، تو اُس کو بھی نماز پڑھنا ضرور نہیں ہے۔ یا کسی کے گھر کوئی مہمان گئی ہو، یا کسی جگہ کوئی مہمان آئی ہو تو اُس رات دن نماز کا ترک کرنا اچھا ہے۔ یا کسی دُلھن کے دیکھنے کو جو عورتیں جاویں یا کسی کا خاوند سفر سے آوے، تو اُس پر بھی نماز نہیں واجب ہے۔ یا کوئی عورت نماز پڑھتی ہو اور دیکھے کہ اُس کا خاوند کسی اور رنڈی سے باتیں کر رہا ہے، واجب ہے کہ نماز کو موقوف کرے اور اُس کی باتیں سننے پر طبیعت کو مصروف کرے۔

فصل، اس میں واجب اور سُنّت روزوں کا احوال ہے:

ان کے نزدیک بے نور اور بے حور کا روزہ واجب ہے، اُس کی ترکیب یہ ہے کہ روزہ رکھ کے، اچھی پوشاک پہن کے، اپنے تئیں آراستہ کر کے گھر سے

باہر نکلے اور خوب صورت جوانوں کی صحبت میں جا بیٹھے، بعد اس کے ایک لڑکے نابالغ کو اپنے پاس بٹھاوے اور دو رکعت نماز حاجت کی ادا کر کے بے نور اور بے حور کا قصہ اُس کے سامنے شروع کرے۔ وہ قصہ یہ ہے: یعنی ایک تھیں بے نور، اُن کے چہرے کا نور نورٌ علیٰ نور۔ اُن کے گھر کوئی نورِ نظر نہ تھا، اس واسطے اُن کی آنکھیں روتے روتے بے نور ہو گئی تھیں اور اس آتشِ غم سے سینہ اُن کا مثالِ تنور کے جلتا تھا۔ بے حور کہ اُن کی خالہ زاد بہن تھیں، باتیں اُن کی دریائے لطافت، زبان سے ان کے بحورِ خوبی جاری تھے، اپنی بہن کو اس حالت میں دیکھ کے کہنے لگیں کہ میں نے معلوم کیا یا خاوند تیرا ناکارہ ہے یا تو بانجھ ہے، بہنا! اس بات کا کچھ عیب نہیں ہے، اپنے تئیں امتحان کرنا ضرور ہے، اگر کسی جوان خوب صورت سے تو ملاقات کرے اور اُس کا مطلبِ دل بر لاوے، شاید خدا تیری بھی مراد حاصل کرے، اور یہ منت مان کہ جس روز میرے گھر میں جیتا جاگتا لڑکا ہووے تو میں ہر مہینے میں ایک روزہ رکھا کروں گی۔ بارے اُن کے کہنے سے اپنے خاوند کی بے اجازت عمل اس بات پر کر کے کہ کارِ خیر میں استخارے کی حاجت نہیں ہے، ایک جوانِ نازنیں سے جا کے ہم صحبت ہوئیں اور اُسی روزے کی برکت سے جھٹ پٹ اُن کا نخلِ مراد باردر ہوا، یعنی بعد نو مہینے کے ایک لڑکا پری زاد اُن کے گھر میں پیدا ہوا۔ عجب طرح کی خوشیِ تازہ اور مسرتِ بے اندازہ حاصل ہوئی، مگر اس روزے کو کبھی انھوں نے ناغہ نہ کیا۔ وہ لڑکا جب سُن چکے تو یہ کہے کہ خدا تیری مراد بر لاوے، اس وقت روزے کو افطار کرے۔ یہ عمل بہت مجرب ہے کہ اُس ہفتے میں یا اُس مہینے میں یا اُس برس میں ضرور ضرور وہ اپنے مطلب کو پہنچے۔ کلثوم ننہ نے کہا ہے کہ جو عورت اِس روزہ رکھنے میں شک رکھتی ہو، وہ ہم میں نہیں ہے۔

اور دوسرا روزہ یہ ہے کہ سترہویں رجب کو دوپہر تک رکھتی ہیں۔ اس میں یہ واجب ہے کہ خوب سا عطر لگا کے، بناؤ کر کے، برقع منہ سے اٹھا کے متبرک مکانوں میں جاوے، اور اپنی منہ بولی بہنوں میں بیٹھ کے اپنی ساری حقیقت اور اپنے خاوند کا احوال بیان کرے۔ پھر دوپہر کو تلوں سے افطار کرے۔

اور ایک روزہ اور ہے کہ حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام کا مشہور کیا ہے اُس میں یہ لازم ہے کہ سات گھروں سے بھیک مانگ لاوے اور اسی کا کھانا بے نمک پکا کے، دوغ اور خرمے سے اُس کا افطار کرے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ظہر تک جھاڑو نہ دیوے، روٹی نہ پکاوے کہ اُس پر گھر کا کام کرنا اُس روز حرام ہے۔ باجی یاسمن فرماتی ہیں کہ روزہ دوشنبے کے روز رکھنا بڑا ثواب ہے۔

اور ایک روزہ واجب ہے کہ وہ حضرت بی بی کا کہلاتا ہے، سات گھروں سے کچھ چیزیں لاوے اور سات کنوؤں کے پانی میں پکا کے ظہر کے وقت افطار کریں اور واجب ہے کہ آپ نیکوں میں اور درگاہوں میں جا کے، اپنے یاروں کے ساتھ کہ جن کو چاہتی ہوں اور اپنی منہ بولی بہنوں کے ہمراہ افطار کریں۔ شہر بانو دوا نے لکھا ہے کہ نئے پانی کے کوزے سے یہ روزہ افطار کریں، اور جب تک اُس میں پانی سرد رہے، کوئی اور پینے نہ پاوے۔ اور دو رکعت نماز حاجت کی بھی واجب ہے کہ جلد مراد اُن کی حاصل ہو۔ تمام مجتہد اس فن کی کہتی ہیں کہ جو لڑکی یا عورت اس روزے کو اعتقاد سے رکھے گی، وہ شتابی اپنے مطلب کو پہنچے گی۔ اور جس لڑکی کے نصیب نہ کھلتے ہوں وہ اس روزے کو رکھے، یا جس عورت کا شوہر نہ ہووے تو اُس کی اِس روزے کے رکھنے سے مراد بر آوے۔

لازم ہے کہ بن بیاہی لڑکی کو مینار پر لے جاویں، اول درجے میں ایک اخروٹ چھوڑیں اور دوسرے میں دوسرا، اِسی طرح اس کو اوپر تک پہنچاویں،

وہاں جا کے دو رکعت نماز حاجت کی ادا کریں اور وہاں سے اُتریں، اُترتے وقت اُن اخروٹوں کو چو تڑ سے توڑیں، لیکن اُس لڑکی کو چاہیے کہ چلتے وقت پھر اُدھر پھر کے نہ دیکھے۔ اور ددا بزم آرا اور بی جان افروز نے کہا ہے کہ ہم نے بارہا اس کا تجربہ کیا ہے، یعنی جس لڑکی نے اِس بات پر عمل کیا ہے، تو صبح ہی کو مشّاطہ اُس کی نسبت لائی ہے۔

اور جس لڑکی کا نکاح ہو تو اُسی وقت چاہیے کہ ایک قرآن رحل پر رکھ کے اُس کے منہ کے سامنے رکھ دیں اور شمع روشن کریں اور آئینہ رو بہ رو لا دیں اور ایک خوانچے میں طرح طرح کی چیزیں رکھیں، اس میں کچھ عنبر، کچھ عطر اور خشک تا کہ اس کو کیانی مراد کہتے ہیں (کذا) اور اسپند ضرور ہووے، اور ایک عورت اُس لڑکی کے سر کو پکڑ کے حضرت آدم کا خطبہ پڑھے اور ایک چادر سبز نا فرمانی اُس کو اُڑھا دیں اور تمام گرہیں جو اُس کی پوشاک میں ہوں یعنی ازار بند تک بھی کھول دیں، اور ایک طشت اوندھا کے، اُس میں چراغ گھی کا روشن کریں اور اگر میسر آوے تو اُس طشت میں ایک زین، اوپر اُس کے ایک تکیہ رکھ کے، دُلھن کو اُس پر سوار کریں، گویا خاوند کے زین باندھا ہے اور اُس عورت کو اُس پر سوار کیا ہے۔

اور جو چادر کہ نکاح کے وقت دولھا کے گھر سے آوے، وہی چادر دُلھن کو اُڑھائی جاوے۔ اور کلثوم ننہ اور بی بی جان آغا نے کہا ہے کہ دُلھن کو چاہیے کہ اپنے ازار بند میں مصری کی ڈلیاں باندھ کے جس وقت دولھا کے پاس جاوے، وہ اسے کھلاوے۔ اِس میں یہ فائدہ ہے کہ خاوند جورو میں ہمیشہ مٹھاس رہے۔ اور شہر بانو ددا کہتی ہیں کہ دانے الائچی کے داماد کو کھلاویں تو نہایت مجرب ہے۔

اور نکاح باندھنے کے وقت عورت کے منہدی نہ لگاویں۔ اور اُسے چاہیے کہ ہمیشہ آئینہ دیکھتی رہے۔ دد ابزم آرا کا قول ہے کہ دلھن اندھا (انڈا؟) ہاتھ میں رکھے، جس وقت اُٹھنے لگے، اس کو زور سے دیوار پہ مارے کہ ٹوٹ جاوے۔ لیکن کلثوم ننہ کہتی ہیں کہ یہ اسراف ہے۔

اور جو لڑکی کہ اُس کا بیاہ نہ ہوتا ہو تو اُسے چاہیے کہ سوئی میں ریشم دلھن کے سر پہ سے پرو کے، رومال میں باندھ کے باہر لاوے اور اپنے سر پہ مارے، جلد اس کے بخت کھلیں گے۔ اور بی بی شاہ زینب نقل کرتی ہیں کہ جو دلھن کے سر پہ نقل ہوں، اُن کو گھر میں بھیجنا سنتِ موکدہ ہے، اور دد ابزم آرا کے نزدیک واجب ہے، اس واسطے کہ جس گھر میں وہ نقل جاویں، وہاں بہت برکت ہوتی ہے۔ اور یہ بھی واجب ہے کہ جہاں وہ نقل جاویں، اُن کو چاہیے کہ جتنی نقل ہوں اتنی سوئیاں اور سنجاف دلھن کو بھیجیں۔ بعضی علما اس کو واجب جانتی ہیں بلکہ نہ کرنا اُن کے نزدیک حرام ہے۔ اور دد ابزم آرا کا قول یہ ہے کہ ان سوئیوں کے ساتھ تھوڑا ریشم سبز بھی ہو تاکہ ضرور اُس کے بخت سبز رہیں۔ یہ بات خالی از لطف نہیں، لیکن وہ ریشم سیاہ اور زرد اور کبود اور منقش نہ ہو، اگر سفید یا قرمز ہو تو مضایقہ نہیں ہے۔

اور جب تک بیاہ نہ ہوا ہو تو اُس کی ما کو چاہیے کہ بال اُس کے دور کرے، اور جس وقت کچھ عاقلہ ہووے، سب آداب اور رفتار حدیث شریف کے اس کو تعلیم کرے، خصوصاً ناز اور کرشمہ اور عشوہ اور عورتوں کا مکر اور واجب و سنت، یہ سب کچھ سکھا دے؛ کس واسطے کہ جب وہ بیاہی گئی تو اُسے ان باتوں کے سیکھنے کی فرصت کہاں رہی۔ سب مجتہدوں کے نزدیک (یہ) باتیں سیکھنا واجب ہیں، اس میں خلاف نہیں ہے۔

اور کلثوم ننہ کے نزدیک عورت کو واجب ہے کہ زفاف کے وقت رووے اور چلاوے، کہ اس کا بڑا ثواب ہے، تمام گناہ اس کے بخشے جائیں گے، اور اگر یہ بات نہ کرے گی تو گنہ گار ہوگی۔ ددا بزم آرا کہتی ہیں کہ عورت کا وقت زفاف کے دل جلتا ہے اور وہ روتی ہے، اس وقت جو دعا مانگے، سو جناب الٰہی میں قبول ہوگی اُس وقت سب دعاؤں سے یہ دعا بہتر ہے کہ مانگے یعنی "یا الٰہی! میرے خاوند کو اور اُس کے ماں باپ کو اور اُس کے سب عزیزوں کو مجھ پر مہربان کر کہ میں جو چاہوں سو کروں اور جہاں چاہوں وہاں جاؤں، کوئی مزاحمت نہ کرے۔" اور اسی طرح اپنی بہنوں کے واسطے دعا کرے، البتہ وہ قبول ہوگی۔

کلثوم ننہ فرماتی ہیں کہ واجب ہے عورت کو کہ قبل از بیاہ کے سب باتیں کہ جو اس کتاب شریف میں لکھی ہیں، وہ سیکھے۔

فصل، اس میں شب زفاف کے آداب اور جو باتیں اس سے تعلق رکھتی ہیں، وہ لکھی ہیں:

دولھا کو لازم ہے کہ جس وقت عورت کو بیاہ کے لاوے اور ساتھ سونے کے واسطے اکیلے مکان میں لے جاوے، اُس وقت جتنی عورتیں دلھن کے ہمراہ ہوں، اُن سب سے جو چاہے سو کرے، اس کا اندیشہ نہیں ہے، وہ اُس کی محرم ہیں۔ مگر کلثوم ننہ فرماتی ہیں کہ اگرچہ بات صحیح ہے لیکن دولھا کو لازم ہے کہ کسی سے شوخی و شرارت نہ کرے، کس واسطے کہ دلھن اُس کی ناخوش ہوگی، اگرچہ دولھا تین روز تک اُن تمام عورتوں کا محرم ہے۔ قول ان کا صحت رکھتا ہے۔

اور دلھن کی ماں کو شب زفاف میں بیٹی کے ساتھ جانا حرام ہے۔ اور جس وقت کہ اکیلے مکان میں دلھن کو دولھا کے پاس لے جاویں تو چاہیے کہ اُس کے

پہلو میں بٹھاویں اور دہنا پانو اُس کا، خاوند کے بائیں پانو پر رکھیں اور دہنا ہاتھ اُس کا خاوند کے ہاتھ پر رکھیں، تا ہمیشہ وہ شوہر پر بالا دست رہے۔ اور واجب ہے کہ شوہر اُس کا اُس وقت دو رکعت نماز اُس مکان میں پڑھے۔ اور جب تک دُلھن سب گھر کی کُنجیاں نہ لے لے، اُس مکان میں داخل نہ ہووے۔ اور جس وقت کہ دُلھن، دُولھا کے مکان میں جاوے تو اُس کو لازم ہے کہ تنہا گود میں اُٹھا کے وہاں بٹھا لے، اسی وقت تھوڑی سی نقل دُلھن کے سر پر گراوے۔ یہ سب باتیں واجبات سے ہیں۔

اور جس وقت کہ جورو، خاوند کے پہلو میں بیٹھے تو اُس دم آفتابہ اور لگن لا کے، دہنا ہاتھ اور پانو عورت کا اور بایاں مرد کا دُھلا دیں۔ اور دُلھن کو واجب ہے کہ مُنہ پر سے برقع نہ اُٹھاوے، جب تک خاوند سے کچھ سونے کی قسم سے، یا زیور سے انگوٹھی وغیرہ مُنہ کھلوائی نہ لے لیوے۔ اِسی طرح نہ کچھ کھاوے نہ کچھ بات کرے جب تک رنج دنداں شوہر سے نہ پاوے۔ کلثوم ننہ نے اس کا احوال بیان کیا ہے کہ اگر رنج دنداں نہ لے گی، تو اُس کے دانتوں میں درد ہوا کرے گا۔ یہ قول قوت رکھتا ہے۔

اور اگر میسر ہووے تو بھُنی مچھلی بیاہ کی شب دولھا دولھن کھاویں، یہ بہت نافع ہے، بلکہ اس کا بیشتر تجربہ کیا ہے کہ اور جو کوئی ان کا جھوٹھا کھاوے، اسی شب اُس کا بیاہ ہووے۔ یہ بات قریب مستحب کے ہے۔ اور جس کے بیاہ کی شب کو مینہ برسے، یقین ہے کہ دولھا دولھن نے ہانڈی چاٹی ہوگی اور باورچی خانے میں کھانا کھایا ہوگا۔ یہ مجربات سے ہے۔

اور اسی شب کو سنت ہے کہ دولھا اور دولھن مصری کی ڈلیاں باہم ایک کے ایک مُنہ میں رکھیں تا کہ میٹھے رہیں، یہ مسئلہ نیک زنوں نے تجربہ کیا ہے اور کہا

ہے کہ چاہیے اُسی رات کو دونو آئینے اور قرآن میں مُنہ دیکھیں، خصوصاً سورۂ یوسف کا دیکھنا سنّت ہے، اور بعضوں کے نزدیک واجب ہے۔ اور بی بی شاہ زینب واجب جانتی ہیں کہ جو نقل دولھا کے سر پر گراتے ہیں، وہ لڑکیوں کے نصیب کھلنے کے واسطے لے جاتے ہیں، اور جو کوئی دانہ اُس میں سے دُولھا کے کپڑے میں رہ جاوے، جو کوئی اُس کو کھاوے، اُس کی جلدی مراد بر آوے۔ اسی طرح سے دُولھن کے رومال میں جو دانہ بندھا ہو، وہ بھی یہی حکم رکھتا ہے۔

اور کلثوم ننہ نے جائز رکھا ہے کہ جب دولھن کو اکیلے مکان میں دولھا کے پاس بھیجیں، تو اُس وقت نقارہ اور نوبت بجادیں اور طرح طرح کے ساز بجاویں، اور بادا شادمبارک گادیں۔ اور جس گھر میں دائرہ حلقے دار نہ ہو تو اُس گھر میں نماز پڑھنا درست نہیں ہے۔ اور شہر بانو ددا کہتی ہیں کہ سیخ دار دائرہ خوب نہیں ہوتا ہے، اور واجب ہے کہ گاتے وقت یہ مبارک باد دیویں: شادمبارک بادا، ہمیشہ مبارک بادا۔ یہ بات شہر بانو ددا سے جاری ہوئی ہے۔ اور اگر دائرہ بے حلقہ اور سیخ دار بھی ہو تو اُس کے گھر سے کراہت دور کرتا ہے۔

اور جو عورت کہ دولھا دولھن کے واسطے فرش بچھاوے، اُسے لازم ہے کہ ایک تکیہ سرہانے رکھے اور خود نیک بخت ایسی ہووے کہ اُس کے خاوند نے کوئی دوسری جورو نہ کی ہو، نہیں تو کلثوم ننہ اس کو حرام جانتی ہیں۔ اور لوگوں نے تجویز کیا ہے کہ جو عورتیں دولھن کے ساتھ آویں، وہ رات کو کان لگا کے سنیں کہ آپس میں دولھا دولھن کے کیا باتیں ہوتی ہیں؛ وہ باتیں سُن کے، فجر کو اپنی دوستوں میں اور بہنوں میں بیان کریں، یہ واجب کفائی ہے۔ بلکہ جاگنا اُس رات کو مناسب ہے کہ شبِ قدر کے برابر جانتی ہیں۔ اگر اس میں نماز کی فرصت نہ ہو تو کچھ مضایقہ نہیں ہے۔

اور واجب ہے کہ بعد زفاف کے سب عورتیں دائرہ بجاویں اور ناچیں کلثوم ننہ کے نزدیک واجب ہے۔ اور عروس کا بھی ناچنا بعضوں کے نزدیک سنّت ہے اور بعضوں کے نزدیک واجب۔ اور اگر بیاہ کی پہلی شب کچھ دولھا سے امرِ دنیاوی نہ ہو سکے تو چراغ اور آئینہ اور چادر اور کفش دولھن کی اُس کے سامنے لا کے رکھیں اور اس سے کہیں: تو ان کو دیکھ، دولھن اب تیری اپنے باپ کے گھر جاتی ہے، معلوم ہوا کہ تو نامرد ہے، کس امید پر تیرے پاس رہے۔ الغرض اسی طرح اُسے بہت غیرتیں دلاویں کہ تا جلد تیہا آوے۔ اور یہ واجب ہے کہ جو مرد دن کو اسی دن یا شب کو اپنی جورو کو تصرف میں لاوے، تو وہ رومال لہو بھرا ہوا اُس کے ہمسایوں میں بھیجیں۔ اس بات کے واسطے بڑی تقید لکھی ہے، تمام مجتہد اس فن کی اس کو واجبِ مطلق جانتی ہیں، مگر دوا بزم ارا نے سنتِ موکدہ لکھا ہے اور کہا ہے کہ کھانا اُس شب دولھن کے گھر سے پک کے جاوے، اس کا ثوابِ عظیم ہے۔ اور لازم ہے کہ وہ کھانا پردے کے پیچھے بیچے۔ اور واجب ہے کہ اُسی روز تھوڑی سی الائچی اور گلاب اور مصری پیکے کئی پیالیاں بھر کے دولھن کو پلا دیں، جب وہ جنے تو اُس کے گھر بیٹا ہوگا، اور بہت مجرب ہے۔

اور یہ واجب ہے کہ جب دولھن دولھا کے گھر جاوے تو سب اُس کی قوم کی عورتیں اپنے اپنے گھر سے مٹھائی لے جاویں اور اگر اتفاقاً ایک شخص بھی لے جاوے تو سب کی گردن سے بوجھ اُتر جاوے، یہ واجبِ کفائی ہے۔ اور چالیس روز تک دولھن کو نماز درست نہیں ہے، بلکہ اگر رمضان بھی انھیں دنوں میں آجاوے تو کچھ روزے رکھنا ضرور نہیں۔

فصل ۔ اس میں عورتوں کے وضع حمل اور اُن کی ریتوں کا احوال ہے :

لازم ہے کہ جو عورت حاملہ ہووے، اس کی سسرال کے لوگ اسی طرح اس کی خاطر داری کریں کہ جس طرح سے وہ انکار نہ کرے، اور اگر انکار کرے گی تو جب اس کے لڑکا ہوگا تو اُس کے بدن میں رعشہ رہے گا۔ اور اُس کے خاوند کو چاہیے کہ جو چیز کھانے کو اُس کا جی چاہے، خواہ میوہ خواہ کھانا، وہ اس کے واسطے لے آیا کرے۔ کس واسطے کہ لڑکا شیر چشم ہوگا (کذا)، اور یہ بات تجربے میں پہنچی ہے۔

اور اگر عورت کو درد لگیں تو لازم ہے کہ جلد دائی کو بلا دیں، اور وہ آ کے اُس کے سر پہ کھڑی رہے اور تین تالیاں بجاوے اور اونچی جگہ اس کو بھا کے (بٹھا کے ؟) جناوے، اُسی طرف دھیان لگائے رہے اگرچہ لڑکا دیر میں پیدا ہو۔

کلثوم ننہ کہتی ہیں کہ سینہ بند جو واسطے لڑکے کے سیتے ہیں، وہ زردوں کے وقت اس عورت کے سر پہ ڈال دیں تا جلدی اُس کی مشکل آسان ہو۔ اور لازم ہے کہ اُس لڑکے سے جناتے وقت کہے کہ اے سعادت مند لڑکے! تو جلد باہر آ کہ تیرے واسطے سب جمع ہیں، اور تجھے قسم ہے خدا کی کہ نطفۂ پاک سے رحم پاک میں قرار لے اور جلدی پاکی کے ساتھ باہر آ، اور اندیشہ نہ کر تیرے کھلانے کے واسطے گڑ اور قند اور تل رکھیں ہیں، اور ماں کی چھاتیوں میں شیر حلال اُترا ہے تیرا منتظر، شتابی باہر نکل اور اپنی ماں کو رنج و تعب سے چھُڑا، تیرے واسطے جھولا نقاشی اور فرش درست کر رکھا ہے، اگر تو دیر لگا دے گا تو تیری ماں یہ چیزیں تجھے حلال نہ کرے گی۔

بی بی آغا جان کہتی ہیں کہ یہ بات بارہا تجربہ کی ہے۔

اور چاہیے کہ جس عورت کی نماز میں کچھ خلل ہو یا حائض ہو، وہ اُس وقت وہاں نہ آوے کہ حرام ہے۔ اور اس وقت لازم ہے کہ کوئی آدمی تلوار کھینچ کر اس کے پاس کھڑا رہے تا وہ نہ آجائے اور اس کا کلیجا نہ کھاوے یعنی (کذا)۔

اور جس چیز میں کہ آل کا رنگ بعینہٖ قرمزی ہووے، وہ جنی ہوئی عورت کے پاس نہ لاویں اور کالا رومال دونو طرف سر کے اُس کے گرہ دے کے رکھیں۔ اور تین روز تک عورت جنی ہوئی پانی نہ پینے پاوے، اگر مرجائے گی تو بہشت میں داخل ہوگی۔

اور جس وقت لڑکا ہوچکے تو دائی اُس کی ناف کو کاٹے اور کچھ اُس وقت دائی کو دیویں کہ ناف کٹائی کا حق بڑا ہوتا ہے۔ اور دائی کو لازم ہے کہ اُس وقت تلوار لے کے چاروں کونوں پہ گھر کے خط کھینچے اور کہتی جاوے کہ "خط کھینچتی ہوں میں، خط کھینچتی ہوں میں"، ایک اور عورت بول اُٹھے کہ "کیا خط ہے، کیا خط ہے"، اسی طرح چاروں دفعہ کہے۔ کلثوم ننہ کہتی ہیں کہ اگر اس خط کو نہ کھینچے گی تو آل آوے گی اور اُس کا کلیجا کھا جاوے گی، وہ جنی نہ رہے گی۔ جو کچھ ہم نے منع کیا ہے، اس سے لازم ہے کہ دور بھاگے، اور خط کھینچنے کا لفظ نہ کہیں بلکہ یوں کہیں تو اچھا ہے کہ "خش کھینچتی ہوں میں"۔ اب تک شیراز میں جتنی عورتیں ہیں وہ بھی کہتی ہیں۔ کلثوم ننہ کہتی ہیں کہ میں نے کئی مرتبہ آل کو دیکھا ہے، ایک لڑکی دبلی پتلی سی تھی، منہ اُس کا سرخ، اور بال مثال لالۂ احمر کے ہیں، اس واسطے اُس کو آل کہتے ہیں، مگر ناک مٹی کی ہے۔ کلثوم ننہ نے اُس کے حق میں کئی شعر کہے ہیں:

آل کا جاننا ہے اب مشکل — بال سرخ اور ناک اس کی گل
جو کوئی اُس کی ناک وہ دیکھے — اُس کا مطلب شتاب ہو حاصل

اور چاہیے کہ تین گٹھیاں پیاز کی زچہ کے سرہانے رکھ دیں تاکہ اُس کی بدبو سے آل نہ آوے۔ باجی یاسمن کہتی ہیں کہ زچہ کو اکیلا نہ چھوڑے جب تک وہ نہائی نہ ہو۔ اور اگر اتفاقاً کسی عورت پہ آل اثر کر بیٹھے تو چاہیے کہ اُسی وقت جو اُس کے

دامن میں بھر دیں اور گھوڑے کو بلوا کے کھلوا دیں اور اُس کا نام لے کے سات روز تک نہ پکاریں، نہیں تو اور ایذا دے گی۔ اور چھے روز تک لڑکا ماں کے پہلو سے جُدا نہ ہو، جھولے میں نہ جھولے، چھٹے روز جھولے میں لڑکے کو بٹھا دیں اور تھوڑی سی مٹھائی اور روٹی اور پنیر اور گیہوں بُھنے ہوئے اُس جھولے کے پاس رکھ دیں کہ اگر آل یا ام الصبیان آویں تو وہ اُس کے کھانے میں مشغول ہو جاویں، اس کو کچھ ایذا نہ پہنچا دیں۔ اور اگر جس وقت لڑکے کو جھولے میں ڈالنے لگیں تو تھوڑی سی مٹھائی اور روٹی رومال میں باندھ کے اُس کے پیٹ سے باندھ دیں، کہ اس کو توشہ کہتے ہیں۔

اور واجب ہے کہ سات عورتیں قطار باندھ کے بیٹھیں، ایک عورت لڑکے کو گود میں لے کے دوسری سے کہے کہ لے، وہ پوچھے، کیا چیز ہے۔ یہ کہے کہ بچہ۔ اسی طرح سے ساتوں عورتیں پوچھتی جاویں اور لیتی جاویں تا دائی کے پاس پہنچا دیں۔ مگر بی بی شاہ زینب کے نزدیک سنّتِ موکّدہ ہے۔ اور خالہ جان آغا کہتی ہیں کہ جب بچے کو جھولے میں ڈالیں تو اخروٹ گرد اُس کے توڑیں اور لڑکے سے کہیں کہ کتّے اور ریچھ کی آواز سے جب باپ تیرا تیری ماسے دعوا کرے تو ڈرنا (کذا)، اور کوّے اور بچھو کی اور مُرغ کی آواز سے ہیبت ناک نہ ہونا۔ اسی طرح اور جو چیزیں دل میں آویں سو اُس سے کہیں، تا وہ لڑکا دلیر ہوگا اور کسی بات سے نہ ڈرے گا۔

اور لازم ہے کہ جب جنی ہوئی عورت کو حمام میں لے جاویں تو پہلے دروازے پر کئی اخروٹ وہ کفش کی نعل سے توڑے، بعد اس کے ننگے پانو ہو کے اندر جاوے اور واجب ہے کہ جب حمام میں داخل ہو، پہلے ایک تشت لاویں کہ اس میں جو جو چیزیں ہم نے تجویز کی ہیں وہ پڑی ہوئی ہوں، اُس میں بیٹھیں۔ اور ددا بزم آرا

کہتی ہیں کہ جب عورت لڑکے کو دودھ پلاتی ہو تو اس حال میں کوئی اس سے کچھ دعوا نہ کرے کہ تا وہ غصہ ہو اور اسی غصے کا دودھ لڑکے کو پلاوے۔ یہ امران کے نزدیک واجب ہے۔

اور یہ بات مشہور ہے کہ وہ اخروٹ جو زچہ حمام میں اپنے پانو سے توڑے اس اخروٹ کے چھلکے کو، جس کسی کے دانتوں میں درد ہوتا ہو، جلاکے اس کا دھواں لے، اچھا ہو جائے گا۔ اور زچہ کو چاہیے کہ چانول اور چنے بھنے ہوئے اور تھوڑا زیرہ کھایا کرے کہ دودھ اس کا زیادہ ہو، اور اگر دارچینی بھی اس میں ملادے تو اور بہتر ہے۔ اور جب وہ عورت حمام سے باہر آوے تو کئی انڈوں میں مصری اور الائچی اور لونگ ملاکے کھاوے اور جو جو عورتیں اس کے ساتھ ہوں، اُن کو کھلاوے؛ کلثوم ننہ اس کو واجب جانتی ہیں اور باقی سب علما سنت کہتی ہیں۔

اور شہربانو ددا فرماتی ہیں کہ اس کے بیاہ کی رات کی جو شمع کچھ باقی رہ گئی ہو تو حمام میں لے جاکے جلادیں تا اس لڑکے کی عمر روشن رہے۔ اور چاہیے کہ دودھ دینے والی عورت کا جس چیز کو جی چاہے، وہ اُسی کو کھلاویں تا دودھ زیادہ ہو۔

فصل، اس میں بیان ہے عورتوں کے حمام جانے کا:

عورتوں کے تئیں کچھ اپنے پیچھے کا ستر چھپانا ضرور نہیں ہے، لازم ہے کہ لنگی کو پھینک کے حمام میں داخل ہو دیں، اور اگر پرانی لنگی ہو تو کچھ اس کا پھینکنا ضرور نہیں۔ اور صابن سے دھونا تین بار واجب جانتی ہیں۔ اور لڑکی کو نورہ کھینچنا حرام ہے جس وقت عورتیں چاہیں کہ حمام میں نہادیں، چاہیے اپنی منہ بولی بہنوں سے کہیں کہ ایک ایک کو ملے، والا اگر اپنے تئیں آپ ملیں گی تو فعلِ حرام

کریں گی۔ واجب ہے کہ سب عورتیں حلقہ باندھ کے بیٹھیں اور لنگیاں اُٹھاویں اور آپس میں خوش فعلیاں کریں۔ اور حقہ پینا بھی وہاں واجب لکھتی ہیں۔

اور جو عورت کہ حمام میں جانے لگے اُسے واجب ہے کہ اپنے آدمیوں سے تقید کرے تا جلدی نئے نئے کھانے اور طرح طرح کے میوے جو اُس فصل میں ہوتے ہوں، لے آویں۔ خصوصاً کاہو اور سرکہ، یہ لوگ اس کو واجب جانتی ہیں۔ سب بیٹھ کے باہم کھاویں اور ہنسی ٹھٹھا کرتی جاویں، ایک کے منہ میں ایک نوالہ دے اور خوش ہو ہو کے لقمے کھاوے۔ اور جس وقت حمام سے باہر نکلیں، اچھی اچھی پوشاکیں پہن کر، ہاتھ میں ہاتھ لیے، اختلاط کرتی ہوئی آویں اور اپنی اپنی دوستوں کے گھر میں جاویں۔ اور اگر راہ میں کوئی خوب صورت جوان ملے تو تھوڑے سے برقع کو سرکا کے چادر سر کی کھولیں اور یہ بہانہ کریں کہ مجھے پسینا چلا آتا ہے، میرا سویا جاتا ہے، ایسی ہی باتیں کریں اور وہاں ٹھہریں تا وہ جوان اُن کے کپڑوں میں سے عطر کی بو سونگھے اور اُن کی چتونیں مشاہدہ کرے اور درود بھیجے، اس کا ثواب اُن عورتوں کو پہنچے گا۔ اور مردوں کو حرام ہے کہ اگر عورتیں حمام سے آنے میں دیر لگاویں تو وہ اُن کو منع کریں اور کہیں کہ تم نے کیوں دیر لگائی۔

شہر بانو دوا کہتی ہیں کہ مرد تین قسم کے ہوتے ہیں: قسمِ اول، مرد مردانہ۔ قسمِ دوم، نیم مرد۔ قسمِ سیوم، ہیل ہیلو مرد۔ مردِ مردانہ وہ ہے کہ اپنی جورو کے واسطے سب چیزیں مہیا کرے تا کسی چیز کی اُس کو احتیاج نہ رہے، اس حال میں اگر وہ کچھ کام اُس کی بے اجازت کرے تو خاوند کو لازم ہے کہ اُسے مانع ہو اور تنبیہ پہنچاوے، کوئی اُس کا مزاحم نہ ہوگا۔ اور نیم مرد وہ ہے کہ کچھ کسب کر کے یا بھیک مانگ لا کے کھاوے اور کھلاوے مگر کپڑا (نہ) بنا سکے، جورو اُس کی جو کچھ محنت کرے اس میں پوشاک بناوے: واجب ہے کہ جو کچھ مرد اُسے کہے تو

وہ عورت کمال خفا ہو کے جواب دیوے اور لڑائی کرے اور جہاں تک دسترس ہووے، منہ اُس کا نوچ لے، مونچھیں کھسوٹ لے، دانتوں سے کاٹ کھاوے کپڑے نوچے، اس کا مضایقہ نہیں۔ اور اگر حد سے بڑھ جاوے تو قاضی کے گھر میں لے جا کے طلاق لیوے۔

اور ہیں ہیلو مرد وہ ہے کہ کوڑی نہ کماتا ہو، جورو سے کھانے اچھے اچھے مانگتا ہو، نفیس پوشاک طلب کرتا ہو؛ اگر عورت اُس کی دس دن یا دس راتوں کے بعد گھر میں آوے تو اُس مرد کو لازم ہے کہ کچھ احوال نہ پوچھے کہ تو کہاں تھی یا کہاں گئی تھی، بلکہ اگر کوئی غیر مرد کو اپنے گھر میں دیکھے تو ٹال جاوے، اگر گھر کا دروازہ بھی جو بند دیکھے تو اُلٹے پاؤں پھر جاوے، کسی کو خبر نہ کرے، جب تک وہ نہ کھلے آہٹ نہ سناوے۔ اور اگر معاذ اللہ، اس بات کو زبان پر لاوے تو اسی وقت اُس کی جورو اُس سے طلاق لیوے۔ کلثوم ننہ فرماتی ہیں کہ اگر ایسا مرد ایسی جورو پر کچھ غیظ اپنا جتاوے، تو اُس عورت کو اُس گھر میں رہنا حرام ہے۔

فصل، اِس میں سازوں کے سننے کا اور گانے بجانے کا ذکر ہے:

سب علماؤں کے نزدیک واجب ہے کہ حلقہ دار اور پیخ دار دائرے گھر میں رکھیں، کس واسطے کہ منہ بولی بہنیں یا دوست جو کہیں ملنے کو جاویں تو باہم صحبت داری کریں اور گانے بجانے میں مشغول ہو کے بہ خوبی اوقات گزاریں۔ اور عورتوں کو واجب ہے کہ اگر دائرہ نہ ہو تو خالی تشت ہی بجا کے مطلب اپنا نکالیں۔ اور یہ بھی واجب ہے کہ دائرہ بجانا سیکھیں اور اپنی لڑکیوں کو سکھاویں اگر عورتیں تعلیم کریں، بہتر ہے، لیکن افضل یہ ہے کہ قوالوں کو بلا کے ضیافت کریں اور لڑکیوں کو سکھلاویں کہ تا انھیں دائرہ بجانا بھی آوے اور عیش و عشرت میں اُن کی اوقات گزاریں۔ اور قوالوں کو اُجرت دینا بڑا ثواب ہے۔

اور واجب ہے کہ جھولی کھاتے وقت یعنی ادرک، کہ یہ نام زبان شیراز میں مشہور ہے، دائرہ بجاویں اور آدمی درمیان میں بیٹھیں، ایک کا پانو ایک کی کمر پر رکھا ہو، اور اگر لڑکی اور لڑکا دونو بیٹھیں تو اچھا ہے۔ کلثوم ننہ کہتی ہیں: جو کوئی ادرک میں بیٹھے گا، اُس کے گناہ دھوئے جاویں گے۔ اور باجی یاسمن کہتی ہیں کہ واجب ہے جس وقت ادرک کھانے کو بیٹھے یہ شعر پڑھے ؎

ادرک میں ہوں، مجکو اپنا دیدار جلدی سے دکھائیے آن کر یار

بلکہ تیرھویں تاریخ صفر کی، چار شنبے کے روز یہ عمل کرنا خوب ہے۔ اور اگر اُس وقت دائرہ نہ بجتا ہو تو وہ ادرک کھانا ایسا ہے جیسے بے وضو کوئی نماز پڑھے۔

اور سات جگہ واجب ہے کہ خوشی کریں اور دائرہ بجاویں: پہلے، بیاہ کے دن۔ دوسرے، ختنے کے دن۔ تیسرے، جب کوئی سفر سے آوے۔ چوتھے، اپنی بہنوں کی جب مہمانی کرے۔ پانچویں، جس وقت عورت لڑکا جنے۔ چھٹے، دولھا دولھن کے واسطے جب جوڑا قطع کرنے لگیں۔ ساتویں، جب ادرک کھانے کو بیٹھیں ـــــ اور کوئی ان میں سے ان باتوں کو نہ کرے، وہ شفاعت کی اُمید ان پانچوں عالموں سے نہ رکھے۔

اور قوالوں کی، نقارچیوں کی لازم ہے کہ ہمیشہ عزت کیجیے، کس واسطے کہ ان لوگوں سے خوشی حاصل ہوتی آئی ہے، ان کو بے عزت کرنا گناہِ عظیم ہے۔ باجی یاسمن کہتی ہیں کہ اگر کوئی سفر سے آوے یا کوئی عورت جنے، تو چاہیے کہ نقارچی دروازے پر آوے اور کئی دفعہ بجا کے چلا وے۔ اور یہ بھی انھیں کا قول ہے کہ جب بجانے والے دروازے پر آکے کچھ بجانے لگیں تو سب عورتوں کو چاہیے کہ وہاں جمع ہوویں اور سنیں، کس لیے کہ یہ امر سنت ہے، خصوصاً نوجوان عورتوں کو اور لڑکیوں کو واجب ہے۔ کلثوم ننہ اور شہر بانو ددا کہتی ہیں کہ اگر کوئی جوان عورت

نماز پڑھتی ہو اور گانے کی آواز اُس کے کان میں آوے، تو چاہیے کہ نماز کو توڑ کے جاوے اور اُسے سُنے، اِس میں اگر بعدِ فراغت وقت باقی رہے تو ادا کرے، نہیں قضا کر کے پڑھے، لیکن بوڑھی عورت اگر ہو تو اُس کو نماز چھوڑ کے جانا درست نہیں، مگر یہ لازم ہے کہ نماز تو پڑھتی جاوے اور دھیان گانے کی طرف لگاوے۔ اور نقارچی پر سلام واجب ہے، مگر بعضی سنّت جانتی ہیں۔

اور جو عورت کسی کام کو کہیں جاتی ہو اور آواز نقارچی کی یا گانے کی کسی گھر میں سُنے، تو اُسے چاہیے کہ پہلے اُس گھر میں جاوے اور سلام کر کے مبارک باد دے، بعد اس کے جس کام کو جاوے گی، وہ بہ خوبی ہو گا۔

فصل، اِس میں جورو سے جو خاوند سلوک کرے، یا خاوند جورو سے، اُس کا بیان ہے:

وہ مرد بڑے (بڑا؟) عقلمند ہے کہ جو سوا ایک جورو کے دوسری نہ کرے۔ اس میں یہ قباحت ہے کہ ایک تو فعل حرام، دوسرے زندگی حرام ہوتی ہے ؎

کہ جس شخص کے بخت ہوویں سیاہ　　اُسے چاہیے دو کرے اپنے بیاہ

اور نیک بخت مرد وہ ہے کہ اپنی عورت کا کہنا مانے اور اُس کو کسی طرح آزردہ نہ کرے، کہ اس کا دل نہایت نازک ہوتا ہے، رنگِ رو اس کا مثال کلی کے شگفتہ رہے، اگر غصّہ کھائے گی تو رنگ اُس کا مُرجھا جائے گا، اور اگر مر جائے گی تو اُس کا خون اُس کے شوہر کی گردن پر ہوگا، اور اُس کے وارثوں کو لازم ہے کہ خون کا دعویٰ کر کے خوں بہا لیویں، اور اگر مرد زور آور ہو اور انھیں نہ دے تو قیامت میں اُس کے خون کی پُرسش ہو گی۔

مرد کو واجب ہے کہ عورت کو ہر روز کچھ نقد دیا کرے جس میں وہ اپنی مُنہ بولی

بہنوں کی ضیافتیں کرے اور باغ کی سیر کو جاوے اور حمام میں چاشت کھائے، کسی طرح کی اذیت نہ پاوے۔ اور یہ بھی مرد کو چاہیے کہ جب بازار جاوے تو وہاں سے کچھ میوہ وغیرہ خرید کر کے اپنے رومال میں باندھ کے ہاتھ میں لے آوے۔ اور اگر اس کی جورو ایک مہینا بھر سیر میں یا اپنے کسی دوست کے گھر میں یا اپنی منہ بولی بہن کے پاس رہے تو منع نہ کرے اور جس وقت کہ کوئی اس کی جورو کی بہن اُس کے گھر میں آوے، مرد کو حرام ہے کہ گھر میں سووے، عورت اُس کی خدمت میں رہے، سب عالموں نے یہ واجب (ما) نا ہے۔ جس عورت کا ان خوبیوں کے ساتھ خاوند ہووے تو اُس کو سبز بخت اور نیک بخت کہتے ہیں، اور جو اس کے برعکس ہو، اس کو بدبخت اور سیاہ بخت مشہور کرتے ہیں۔

عورت کو لازم ہے کہ بُرے خاوند سے طلاق لیوے اور کوئی اچھا خاوند بہم پہنچاوے، اور اگر طلاق نہ لے سکے تو جن مکانوں میں، مقبروں میں دعا قبول ہوتی ہو وہاں جاکے ناک گھسنی کرے اور خاوند کے مرجانے کی دعا مانگے، یا چرخے کے پیچھے دعائیں مانگے کہ الٰہی! اس چرخے کی برکت سے مجکو رانڈ کر۔ اور چولھے کے پیچھے بھی التجا کرے، یا جس وقت روٹی پکاوے تو سر اپنا پتھر پہ مارے اور یہی دعا مانگے۔ یا جس گھڑی حمام سے نکلے اور سر پانی سے بھیگا ہو، اُس وقت اس بات کی جناب الٰہی میں رجوع کرے۔ یہ وقت وہ ہیں کہ ان میں ضرور دعا قبول ہوتی ہے۔ یا جب نقارے کی آواز سُنے یا جس وقت آفتاب ڈوبے یا جب حلیم اور دیگ سمنو اور آش ابودردا اور زرد چانول پکیں، وہ وقت بھی قبولیت کا ہے۔ یا جب کوئی دوست سفر سے آوے یا جب کسی کا نکاح پڑھا جاوے یا جس وقت لڑکا پیدا ہووے، اُس وقت بھی دُعا مقبولِ الٰہی ہوتی ہے۔ لازم ہے کہ یہاں تک بد دعائیں مانگنے سے ہاتھ نہ اُٹھاوے جب تک خاوند اُس کا

تابعدار نہ ہووے۔

اور ما مہرہ اور آہن ربا اور جو جالے کے جادو کرے تا مرد کو اپنے دام میں لاوے اور اچھا مرد وہ ہے کہ اپنی جورو کو کہیں جانے آنے سے منع نہ کرے نہیں تو وہ عورت اُس کے گھر میں نہ رہے گی اور ہمیشہ اُس کے مرنے کی دُعا مانگا کرے گی، خدا کے نزدیک اُس کی تقصیر ثابت ہو گی۔

اور سب علما اس بات کی قائل ہیں جو عورت ساس اور نند سے لڑائی کرے، مُکّے مارے، کاٹ کاٹ کھاوے، اور صبح کو اپنی ما بہنوں کو بلوا کے اور انھیں تنبیہ کروا وے کہ تا ردو دیویں اور کبھی اُس سے کچھ بات کرنے کی جرأت نہ رکھیں، وہ جو کچھ کرے وہ دم نہ ماریں، اور جب خاوند اُس کے گھر میں آوے تو اپنا گریبان پھاڑ کے اُس کے سامنے رووے اور کہے کہ تو روز مجھے دشمنوں میں چھوڑ جاتا ہے، میں نے تیرے ہاتھ اپنی جان نہیں بیچی ہے، یا مجھے طلاق دے یا تیرے ما باپ اگر مجھ سے بولیں تو اُن کی خشتک میں کتّا اور بلّی چھوڑوں گی۔ اگر خاوند اُس کا زبان درازی کو منع کرے تو وہ اس سے کہے کہ اگر بازار سے بکری خریدتے ہیں وہ بھی بالشت بھر کی زبان رکھتی ہے، میں تو آدمی ہو۔ غرض یہاں (تک) باتیں بناوے کہ سب کام اپنے خاوند سے مضبوط کرے اور اُس کے ما باپ کی طرف سے دل اُس کا پھیر دے، یا نہیں تو طلاق لیوے۔ اور اگر اُس کی ساس نند اُس کی طرف بیٹھ کریں تو لازم ہے کہ اُن کا گلا گھوٹے اور لڑے اور ایسا چلّائے کہ سب ہمسایے خبردار ہوویں اور اُن کا مُنہ نوچ نوچ لے، ایسا ضبط اُن پر بیٹھاوے کہ وہ کسی بات پر اُف نہ کریں۔ یہ سب باتیں واجب ہیں۔ اور اگر نہایت تنگ ہوں تو بد دعائیں مانگے، جس طرح کہ بیان اُن کا آگے کیا ہے، اور اُن کا مرنا خدا سے چاہے۔ اور جو جو باتیں دن کو ساس نندوں سے ہوویں،

اُن میں اور جھوٹ سچ ملا ملا کے رات کو خاوند سے کہا کرے۔

اور اگر چاہے کہ شوہر سے طلاق لیوے اور وہ راضی نہ ہووے، تو اس کی کئی ترکیبیں ہیں: ہر روز لڑائی اور جھگڑا کیا کرے، اور اگر روٹی سامنے آوے تو اُسے پھینک دے اور کہے کہ اس کو مردہ شو لے جاوے، اور درشتی اور وحشت اور زاری اور تری کیا کرے؛ غرض یہاں تک اُسے جان سے عاجز بنا دے کہ وہ لاچار ہو کے اُسے طلاق دیوے۔ اور دوسرے یہ کہ مُلا کے گھر جاوے، کچھ اُسے دیوے، کچھ اُس سے پڑھواوے کہ تا آپس میں تفرقہ ہو۔ یا جو چیز خاوند کی پاوے رفتہ رفتہ سب لے جاوے۔ اگر وہ پوچھے تو اُس سے لڑکے قاضی کے گھر جاوے اور فریاد کرے کہ یہ مجھے چوری لگاتا ہے، اِس بات پر قسمیں کھائے۔ یہاں تک دھندھلی کرے کہ اُس سے طلاق لے کے، ساس اور نندوں کے عذاب سے چھوٹے۔

فصل، اس میں تعویذوں کا ذکر ہے کہ جو جو نظرِ بد کے واسطے اُنھوں نے ایجاد کیے ہیں:

پہلے اُن میں سے کچی کپور، دوسرا ہرن کے سینگ اور شیر اور بھیڑی کے ناخن اور نفس الاغ اور چھپکلی، ان کو کپڑے میں سی کے لڑکے کے سر پہ باندھ دیتی ہیں۔ اور اگر کوئی لڑکا ڈرتا ہو یا اور اگر (کذا) کوئی لڑکی خواب میں ڈرتی ہووے تو اس کے پہچاننے کی یہ ترکیب ہے کہ ایک توا گلی میں رکھ دیں اور اُس کے نیچے آگ سلگا کے، ایک طرف ایک عورت باکرہ اور ایک طرف ایک اور عورت کھڑی ہو کے، اُس لڑکی کو وہ اُس کی گود میں دے اور وہ اُس کی گود میں دے، لیکن ہر دفعہ تھوڑا سا نون پانی میں گھول کے اُس توے پہ ڈالتی جائیں اور دیکھیں کہ کس جانور کی صورت اُس میں بنتی ہے کہ اُسے ڈرا (یا) کرتا ہے۔ اور ایک ترکیب یہ ہے کہ ایک کچی اینٹ پہ ذرا سا گھی ڈالتی جاویں، سب اُس

گھر کے رہنے والوں کا، بلکہ اس لڑکی کے ماباپ کا بھی نام لیتی جاویں اور چھری سے کھودتی جاویں، بعد اس کے تھوڑی سی روئی اور انڈا اور کوئی پیسا اُس پر رکھ کے، اُس روئی کو آگ لگادیں اور راہ میں پردہ کریں، لیکن چاہیے کہ پھرتے وقت اُس ٹونکے کا کرنے والا پھر اُدھر کو پھر کے نہ دیکھے۔ اور ایک وضع یہ ہے کہ جو کوئی اُس گھر میں رہتا ہو، اُس کا تھوڑا سا کپڑا پہننے کا اور اسپند اور نمک لے کے لڑکی کے پانو کے نیچے جلائے۔ کلثوم ننہ کہتی ہیں کہ میںنے بارہا اس کا تجربہ کیا ہے۔ اور شیر، بھیڑی کے ناخن، مہرہ مکس گربہ اور باباغونی۔ یہ بھی بہت مجرب ہے۔

اور نظر گزر کے واسطے شب چہار شنبہ اور شب جمعہ کو اسپند جلانا نہایت خوب ہے۔ اور لڑکے کا کُرتا اکتالیس ٹکڑوں کا ہو۔ اور ہر ٹکڑا ہر گھر سے مانگا آوے، لیکن احتیاط اس امر کی ضرور ہے کہ اُس عورت سے کپڑا مانگ کے لاوے کہ جس کا کوئی لڑکا کبھی نہ مرگیا ہو۔ اور اسپند کو سبز ریشم سے باندھ کے لڑکے کے سر پر لٹکانا یا دولھن کے جھلے میں لے جانا، یہ بھی مجرب ہے، مگر اس اسپند کی قیمت لازم ہے کہ قوال یا نقارچی سے مانگ لاویں۔ اور غروب آفتاب کے وقت بھی اس کا جلانا خوب ہے، اور اسے پیس کے لڑکے کی پیشانی پر ملنا بھی اچھا ہے، لیکن شہادت کی انگلی اس میں نہ چھو جائے کہ تاثیر جاتی رہے گی۔

اور اس کے خریدنے کا یہ نقشہ ہے کہ پنساری کی دکان پر جا کے پوچھے کہ یہاں اسپند ہے؟ اگر وہ کہے کہ ہے، تو دام اُس کے حوالے کر دے اور وہ لے لے۔ اسی طرح دوسری دکان پر جا کے وصول کرے، مگر جب تیسری دکان پر جاوے تو اُس کو مُنہ سے کچھ نہ کہے، فقط پیسے حوالے کر دے اور اشارے سے بتا کے اسپند مانگ لے، لیکن چہار شنبے کو یہ عمل کرے، اس کا اثر بہت ہے، اور اس کو ایک کُلھیا میں، کہ نوروز کے روز رنگی گئی ہو، اس میں رکھ کے آگ میں جلاوے

اور اُس کی خاک کو لڑکے کے دماغ میں اور تلووں میں ملے۔

فصل، اس میں محرم اور نامحرم کا بیان ہے:

سب عالم اس بات کی قائل ہیں کہ جس مرد کے سر پر مندیل ہو نامحرم ہے لیکن اگر خوبصورت اور ٹھٹھول اور خوش آواز ہو تو اس کے سامنے ہونے کا مضایقہ نہیں ہے اور یہودی سے اور سازندے سے اور مطرب سے اور حمامی سے اور نقارچی سے، یا کوئی محلے میں کچھ چیز بیچنے کو آوے اُس سے، یا بندر نچانے والے سے یا نٹ سے پردہ حجاب کرنا ضرور نہیں، کس لیے کہ یہ سب محرم ہیں۔

فصل، اس میں مہمانوں کے آنے کا یا آپ گھر سے باہر جانے کا احوال ہے:

لازم ہے کہ جہاں سہ شنبے کی رات کو رہے، وہیں چارشنبے کی بھی رات گزارے، چنانچہ اس کا احوال اوپر مفصل لکھا ہے۔ اگر کوئی مہمان جوان خوب صورت ہو تو اُس کو تین دن سے کم گھر میں اپنے رہنے نہ دے، آگے پھر اس کا اختیار ہے جتنا رہے، سب شرطِ مہمانی بجالاوے۔ اور عورت صاحب خانہ پر واجب ہے کہ دیوار کے پیچھے سے یا کسی روزن سے جھانکے اور مہمان کو اشارۂ چشم و ابرو سے بلا کے صحبت داری کرے، اور دن کو اپنی منہ بولی بہنوں سے اختلاط میں مصروف رہے۔

اور بدھ کی رات کو سرھا بدلنا (کذا) منع ہے۔ اور چاہیے کہ اُس شب کسی کے گھر میں نہ رہے اور دیر کر کے اپنے گھر میں آوے۔ اور جو عورت کسی کے گھر میں مہمان جاوے اور اسے وہیں رات ہووے، تو لازم ہے کہ رات بھر وہیں رہے۔ اور مہمان کے ساتھ سیب اور جوارشیں اور حلوے بھیجے۔

کلثوم ننہ کے نزدیک واجب ہے کہ جو عورت داماد کے ساتھ عروس کے

گھر جاوے تو بکری اور چانول اور مٹھائی اُس کے پیچھے بھیجیں، یا اگر اپنی منہ بولی بہنوں کے گھر جاوے تو ترکاری اور نارنج اُن کے ساتھ کر دیں۔ اور جو کسی مہمان کا کھانے سے پیٹ بھر چکا ہو تو صاحب خانہ کو لازم ہے کہ اپنے ہاتھ سے دو تین لقمے اُسے اور کھلاوے، اور اگر نہ کھائے جائیں تو ایک شب اور مہمان رکھے۔ اور جب اپنی منہ بولی بہنوں سے ملاقات کرے تو اپنے خاوند کا احوال سب مفصّل بیان کرے۔ اور اگر کوئی جوان نجیب تر اور شوخ طبع مہمان آوے تو دروازے کی اوٹ میں اُس کا ادائے شکر ادا کرے، اور اگر خلوت ہووے تو کچھ شوخی اور اختلاط بھی اُس سے کرے۔

فصل، اِس میں منہ بولے بھائیوں اور بہنوں کا ذکر ہے:

سب عالم اِس فن کی یہ بات کہتی ہیں کہ جس کی کوئی منہ بولی بہن نہ ہوگی اور وہ مر جائے گی تو حیران ہوں کہ کیونکر بہشت میں جائے گی۔ وہ عورت بڑی نیک بخت ہے کہ جو اپنی منہ بولی بہن کے ساتھ تمام عمر سیر باغ میں اور زیارتوں میں رہے، اسی طرح ان کے ہاتھ میں ہاتھ لے کے بہشت میں داخل ہوگی۔ کلثوم ننہ کہتی ہیں کہ جو صیغہ بہناپے کا پڑھاوے گی، یعنی کسی کو منہ بولی بہن کرے گی، اگرچہ گناہ اُس کے زمین اور آسمان کے برابر ہوں گے، وہ سب بخشے جائیں گے۔ اور خالہ جان آغا اور باجی یاسمن اور شہر بانو دوا اور بی بی جان افروز کے نزدیک یہ ہے کہ جس کسی کے منہ بولا بھائی اور بہن نہ ہوگی، تو وہ بعد مرنے کے یہودی اور نصارا کے مذہب میں اُٹھے گی۔ اور سب عالم اس بات کی قائل ہیں کہ بہناپے کا صیغہ عیدِ غدیر کو پڑھانا خوب ہے، تمام فرشتوں کی عبادت کے برابر ہے، اور بڑی فضیلت یہ ہے کہ اُس وقت اُس جگہ جوان پری بیگم بھی جمع ہوں۔ اگر اصفہان میں یہ امر کرے تو بقعۂ شاہ مبارک میں بڑا ثواب ہے،

کس واسطے کہ وہاں رستے کے آن میں (کذا) جوانِ خوش طبع، نازک اندام، شاہد باز بہت ملتے ہیں۔ اور اگر شیراز میں ہو تو میر احمد بن امام موسیٰ کاظم علیہ الصلواۃ والسلام کے آستانے میں کہ شاہ چراغ نام مشہور ہے اور شہر کے درمیان میں بنا ہے وہاں جاوے کہ راہ میں سرباز، رتمام جوانانِ لالہ رخسار سے ملاقات ہوتی ہے۔

لیکن لازم ہے کہ جب بہناپا کرنے لگے تو سب عورتوں کو جمع کر کے لے جاوے اور وہاں بیٹھ کے شادی کرے، مگر سب عورتیں اچھا اچھا لباس پہنے ہوں، عطر لگائے ہوں۔ اور اگر کسی کو بھائی بنائے تو اُس کو لازم ہے کہ اُس وقت مقطع بن کے بیٹھے کہ تا عورتیں اُسے بہ رغبت تمام بھائی بنائیں اور مٹھائی منگا کے پہلے سب عورتوں کو کھلاویں، بعد اس کے اُس عورت کو کہ جس کو اس فن کی گھاتیں سب یاد ہوں، اُسے داہنے ہاتھ بُلا کے بٹھائیں اور وہ اس طرح سے صیغہ پڑھے کہ: تم کو آپس میں بہنیں کیا میں نے، جب تک جیتی رہو، آپس میں وہ بات نہ کرنا کہ جس میں رنجش آوے، اور شرط کرو کہ جب باہم بہشت میں جاویں تو ایک دوسری لے جاوے (کذا)۔ جب یہ باتیں وہ قبول کریں تو دونوں میں جو بڑی ہو وہ ہاتھ اپنی ساقِ پا پر رکھ کے کہے کہ یہ کیا ہے؟ وہ چھوٹی بولے کہ یہ موٹا کپڑا ہے۔ اُس وقت یہ وہ کہے کہ میں تمھاری بہن ہوئی۔ وہ کہے: میں نے تم سے بہناپا کیا۔ جتنی اُس وقت عورتیں بیٹھی ہوں وہ سب مبارک باد دیویں۔ لازم ہے کہ تا دمِ زیست ایک سے ایک آزردہ نہ ہو، اور جو دونوں میں سے ایک مر جاوے تو وہ جب کہیں سیرِ باغ کو اُٹھے یا حمام کرے یا زیارت گاہ میں یا دیگ سمنو کی تیاری میں حاضر ہووے تو اُس کو یاد کرے اور اُس کی بخشش کے واسطے مقبول جگہ پر دعائیں مانگے۔

اور اگر کسی جوان سے برادری کا صیغہ پڑھے تو طریق اُس (کے) پڑھنے کا

دو ہی ہے، لیکن وہ شخص اُس کا محرم ہے، اگر ایک کپڑے میں دونوں سوویں تو مضایقہ نہیں رکھتا، بلکہ تمام اقربا دونوں کے آپس میں محرمیت رکھیں۔

فصل، اِس میں بعضے کپڑوں کا احوال مذکور ہے :

اوّل، دستمال ہے۔ چاہیئے کہ بڑی بہن، چھوٹی بہن کو دلبری اور عاشق کشی اور عشوہ گری اور کرشمہ و غمزہ سکھاوے۔ ایک اُن میں سے دستمال غمزہ بند ہے کہ اُس کو پیشانی پر اونچا باندھتی ہیں کہ تا پیشانی کھلی رہے اور اُس پر افشاں چھڑکتی ہیں۔ دوسرا دستمال عشوہ بند ہے، اس کو پہلے دستمال کے اوپر باندھتی ہیں، اور یہ عرض وطول میں اُس سے چھوٹا ہوتا ہے۔ تیسرا، دستمال ناز بند ہے، ہر رنگ کے پھندنے اُس میں بندھتے ہیں اور دستمال کے اوپر لگاتی ہیں۔ چوتھا دستمال آماج کن ہے، اس کو گردن میں باندھتی ہیں۔ پانچواں دستمال دو شاخ ہے، اس کو گلے میں باندھ کے، دونوں سرے مثال شاخ کے ٹیکتی ہیں۔ چھٹا دستمال دلربا کہ اس کو عرب کے معشوق پیشانی پر باندھتے ہیں اور دونوں سرے اُس کے پیچھے ڈال دیتے ہیں، یہ ترکیب خوب صورت ہے۔ ساتواں دستمال کلہ طور ہے کہ سفید کپڑے پر سیاہ و سفید رنگ لگا کر، بندش اُس کی اس طرح دیتی ہیں کہ سلما نمایاں ہو اور سونے کے حبابوں کی بھی جھمک ظاہر رہے۔ بی بی کلبری کے نزدیک اس کا بہت ثواب ہے۔ اور آٹھواں دستمال داغ بند ہے کہ کلابتون سے طرح طرح کے پھول کاڑھتی ہیں اور ہاتھ میں باندھ کے ہتھیلی پر گرہ دیتے ہیں۔ نواں دستمال ناز بند ہے کہ مہندی لگانے کے بعد انگوٹھے پر باندھ کے معشوق کے چھیڑنے کو دکھاتی ہیں اور یہ بہانہ کرتی ہیں کہ میری انگلی درد کرتی ہے۔ دسواں دستمال شفقہ بند ہے کہ زیر جامہ کے نیچے باندھتی ہیں۔ گیارھواں دستمال وہ ہے کہ

ہاتھ میں رکھتی ہیں، ریشم سے اور کندلے کے تاروں سے کچھ اس پر نقش و نگار بناتی ہیں۔

اور اخیر کو کچھ متفرق احوال ہے کہ اُن کا اختراع کیا ہوا ہے:

ان میں سے ایک چیز کا نام عروسک ہے، وہ کیا ہے کہ ایک لونڈی کو اچھے کپڑے پہنا کے، ایک خوانچے میں مٹھائی اور ترکاری رکھ کے، ایک دائی کو اس کے ساتھ کر کے اپنی منہ بولی بہنوں کے گھر بھیجتی ہیں اور وہ وہاں جا کے کہتی ہے کہ یہ لونڈی تمھارے واسطے پیش کش بھیجی ہے۔ اگر اُس کے تئیں بہنایا کرنے کی خواہش ہے تو اور اُس لونڈی کو اچھے کپڑے پہنا کے اور کچھ تحفے اُس کے ساتھ کر کے اور دائی کو بھی انعام دے کے روانہ کرے گی۔ اور اگر منظور نہیں ہے تو اُس کو کالے کپڑے پہنا کے رخصت دے گی۔ او سنتِ موکدہ ہے کہ جس وقت وہ عروسک گھر میں آوے تو سب اپنی منہ بولی بہنوں کو جمع کر کے ضیافت کرے اور ناچ گانا اُن کے روبرو کروائے۔

اور ہمیشہ اپنی منہ بولی بہنوں کے واسطے ترکاریاں اور میوے بھیجا کرے۔ اور اس عورت کو یہ لازم ہے کہ جو چیز اُس کی منہ بولی بہن کے گھر سے آوے، وہ اس کے معنی پہچان جاوے، یعنی اگر ساری الائچی بھیجے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ تیری دوستی میں حلم و طاقت بہت رکھتی ہوں۔ اور اگر الائچی کے دانے بھیجے تو اس سے یہ ظاہر ہو کہ میں تیرے واسطے ہلاک ہوں۔ اور ساری لونگ سے یہ ظاہر ہو کہ بدسلوکی نہ کر تو۔ اور ٹوٹی لونگ پھول دار سے کھلے کہ تیری اس آتشِ فراق سے دل میرا کباب ہے۔ اور دارچینی، یعنی تجھ بن پیچ و تاب کھاتی ہوں۔ اور کٹی ہوئی دارچینی سے، یعنی تیرے فراق میں بیمار رہوں اور کچھ بس نہیں رکھتی۔ سادی جوز سے، یعنی غم نہ کھا، تیری دوستی میں سر دینے تک موجود ہوں

اور گھسی ہوئی جوز سے دریافت ہو کہ ضعفِ بدن نہایت رکھتی ہوں۔ مصری سے معلوم ہو کہ ہمارے تمھارے مٹھاس رہے۔ صندل سے، یعنی تیری جستجو میں ہوں۔ شیشے سے، یعنی تو ایسی بے وفا ہے کہ تیرے ہاتھ سے دل میرا مانند شیشے کے شکستہ ہو رہا ہے۔ موتیوں سے ظاہر ہووے کہ میری صبر کی کشتی طوفان میں آئی۔ عنقریب ہے کہ ہلاک ہوں میں۔

اور ایک بات ان کے اعتقاد میں یہ ہے کہ جب کوئی سفر کو جانے لگے تو گلی تک آئینہ اور پانی کا جام اور کچھ سبزی لے کے آویں گی اور پیچھے اُس کے گرا دیں گی کہ تا جلدی سفر سے پھر آوے۔ اور چار شنبے کے روز جھاڑو دینا ان کے نزدیک اچھا نہیں ہے اور اُن کا یہ عقیدہ ہے کہ بادام اور فندق سمنو جس کے پاس ہوگا، اُسے بچھو نہ کاٹے گا۔ اور محرم کے دنوں میں خربوزے کے بیج دانتوں سے چھیلنا بڑا ثواب ہے، کس واسطے کہ وہ چھلکا اُس کا ہونٹھوں سے پھینکتی ہیں تو گویا جو کچھ کام کرنے لگتی ہیں (کذا) تو فال دیکھنے کے لیے کسی اور رنڈی کا پانو ہاتھ میں اُٹھا لیتی ہیں، اگر وہ پانو ہلکا معلوم ہوا تو جانا کہ یہ کام جلدی ہووے گا اور اگر بھاری دکھائی دیا تو اس کو بدشگون جان کے اُس کام کو نہیں کریں گی۔

کلثوم ننہ کے نزدیک واجب ہے کہ چاند رات کو کھانا پکا دیں۔ اور اگر کوئی خاوند اپنی جورو سے بدسلوکی کرے تو یقین ہے کہ کسی نے جادو کیا ہے، اس کو تین روز چار شنبے کو پانی سے نہلا دے کہ تا وہ سحر باطل ہو جاوے۔ اگر کسی کے ہاتھ پانو رہ گئے ہوں تو لڑکی کے پیشاب سے دھلا دیں کہ جلدی کھل جاویں۔

اگر کوئی عورت یا لڑکی قوس قزح کو دیکھے، اُسی وقت کہے کہ تیری

سرخی، ہمارے رنگِ رو کے واسطے ہے اور سبزی تیری، ہمارے بخت سبز ہونے کے لیے ہے اور تیرے قد کی بلندی، ہمارے گیسوؤں کے لیے ہے۔ اور جو اُس وقت حاضر ہوں وہ کہیں کہ کتّے کی آواز کو نور چاہیے، مجرب ہے۔ اور کلثوم ننہ کہتی ہیں کہ اگر کوئی سفر میں ہووے اور اُس کے کوٹھے پر کوّا آن کر آواز دے تو یقین ہے کہ راہ میں ہوگا اور جلدی آوے گا۔ اور کہیں چراغ جلتا ہو تو اُس چراغ سے دوسرا چراغ نہ جلاویں، اور اگر جلاویں تو پہلے چراغ کو بجھا دیں اور پھر اُس سے روشن کریں۔ اور اگر کسی مسافر کے مرنے کی جھوٹھ خبر اُڑی ہو اور وہ کئی ایک دنوں کے بعد اپنے گھر میں آوے تو لازم ہے کہ اُسے کوٹھے کے رستے سے لے آویں۔ اور جس وقت آفتاب غروب ہوتا ہو تو آگ اور پانی گھر سے باہر نہ لے جائیں۔ اور اگر کوئی دیگچہ یا توا رات کو گھر میں لاوے تو چاہیے کہ اُس میں پانی بھر کے کہے کہ حبشی غلام تمھارے واسطے لایا ہوں میں۔ لیکن پانی لانے میں بی بی کلبری کا اختراع ہے کہ تھوڑا سا ایک باسن میں لاوے اور پھر اُلٹ کر لے جاوے۔ اور یہ بات مشہور ہے کہ اگر رات کو چراغ سے پھول جھڑیں تو یقین ہے کہ کوئی مہمان اُس شب کو آوے گا۔ اور اگر مرغ انڈا دیوے تو یقین ہے کہ مسافر سفر سے جلد آوے۔

سب علما اس فن کی متفق ہیں کہ تمام یہ باتیں اس کتاب میں جو لکھیں ہیں، سب امتحان میں آئی ہوئی ہیں؛ اگر عورت یا مرد ان کا قائل نہ ہو تو وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ بہ قولِ سعدی علیہ الرحمہ: لقمان حکیم سے کسی نے پوچھا کہ حکمت تو نے سیکھی ہے (کذا)۔ اُس نے کہا کہ بے ادبوں سے۔ اسی طرح اس کا بھی حال ہے کہ مردوں کو ایسا شبہ پڑتا ہے کہ آیا جو باتیں

اس کتاب میں کلثوم ننہ نے لکھی ہیں، وہ ٹھیک ہیں یا نہیں۔ اور جس نے اس کتاب کو دیکھا ہے، ان کی بدعتوں کو دیکھ کے، ترک اختیار کیا ہے۔

تمام شد

کتاب قانون النساء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ رسالہ ہے کہ اس میں ہندوستان کی عورتوں کی نذر و نیاز کا احوال لکھا ہے۔
ان میں ایک خدائی رات ہے، کہ اُس کو رت جگا بھی کہتی ہیں۔
اس کی ترکیب یہ ہے کہ جب ان میں سے کسی کی کوئی مراد بر آتی ہے تو اُس کے گھر میں سب عورتیں جمع ہوتی ہیں، باہم بیٹھ کر خوشیاں کرتی ہیں، رات بھر جاگتی رہتی ہیں، گانا بجانا تمام شب رہا کرتا ہے، کڑھائی چڑھاتی ہیں، گلگلے پکتے ہیں اور رحم بناتی ہیں، کوری ٹھلیا میں پانی بھر کے، ایک بدھنی شربت کی بھری ہوئی اُس پر رکھ کے، ہار اور پھول اور سہرے اُن پر باندھ کے، کچھ صندل کے ٹیکے لگا کر، ایک صاف جگہ لیپ پوت کے، اُس پر اُس ٹھلیا کو رکھ کے، وہ گلگلے سب اس جگہ جمع کر کے، صبح کے وقت شمعیں روشن کرتی ہیں، اور اللہ میاں کی سلامتی پڑھاتی ہیں۔ جب وہ نیاز ہو چکتی ہے تو آپس میں ایک ایک کو مبارکباد ہی دیتی ہے اور وہ گلگلے جا بہ جا تقسیم کرتی ہیں، ان کے یہاں اس کی نہایت خوشی ہوتی ہے۔

اور ایک پیر دیدار کا کونڈا بھی (ہے)۔ اس کی یہ وضع ہے کہ جس کا کوئی عزیز سفر سے آوے تو اُسی وقت وہ لڈو منگوا کے، ایک کونڈے میں بھر کے، اللہ صاحب کی نیاز دلوا دے، پہلے وہ مسافر منہ میٹھا کرے، بعد اس کے سب عزیز اور اقربا اور آشنا اُس کے کھاویں، لیکن شرط یہ ہے کہ

وہ لڈّو اُس جگہ سے کہ جہاں نیاز دلائی گئی ہو کوئی لے کے باہر نہ جاوے، اُسی جگہ سب بیٹھ کے کھا دیں، اور اگر اتفاقاً کوئی ایسا عزیز کہ جس کی بڑی خاطر ہو، وہ بعد دیر کے جب کونڈا کھا چکی ہوں، آوے، تو اُس کے واسطے اور لڈّو منگوا کے اُسی کونڈے میں رکھ دیتی ہیں اور اسے وہیں بلا کے بیٹھا کے کھلواتی ہیں۔ اور بعضوں کے نزدیک یہ بات واجب ہے کہ وہ مسافر جب تک اُس نیاز کو نہ چکھ لے کسی اور چیز سے مُنہ جھوٹا نہ کرے، نہ کھانا کھائے نہ حقّہ پیے، اگرچہ کیسی ہی بھوک ہو، کس واسطے کہ ہمیشہ وہ سب سے میٹھا رہے۔ اور بعضوں نے یہ بھی درست رکھا ہے کہ وہ کونڈا اگر دہی خُشکے کا بھی ہو تو مضایقہ نہیں رکھتا۔ اور وجہ تسمیہ اس نام کا یہ ہے کہ خدا نے مسافر کا دیدار دکھایا ہے، اس لیے پیر دیدار اس کو کہتے ہیں، اور پیر دیدار ان کے یہاں خدا کا نام ہے۔

اور ایک بی بی کی صحنک ہے، بیشتر ان کا معمول یہ ہے کہ جب صحنک کرنے لگتی ہیں تو پہلے رات کو رتجگا کر کے، صبح کو سات نیک زنوں کو بلوا کے کھلواتی ہیں، بلکہ ایک روز آگے سے ایک ایک لونگ اُن ساتوں کے گھر بھیج دیتی ہیں، وہ نیوتا کہلاتا ہے، جب پہر دن چڑھے وہ سب نیک زن یعنی جن کا شوہر جیتا ہو، جمع ہو چکتی ہیں، تو سات طباق مٹی کے کورے دھلوا کے لیپی پوتی جگہ پر لا کے رکھتی ہیں، اُن میں خواہ دہی خُشکا، خواہ زردہ، جیسا کچھ مقدور ہو، وہ بھرتی ہیں اور سات طرح کی ترکاری جو اُس فصل میں پیدا ہوتی ہے، وہ لا کے اُن طباقوں کے نیچے پھیلا دیتی ہیں اور سات شمعیں روشن کرتی ہیں، اگر کی بتیاں جلاتی ہیں، حضرت بی بی کی نیاز دلا کے اُن نیک زنوں کو کھلاتی ہیں، کوئی مرد اُس جگہ نہیں آنے پاتا، اور کوئی اُس نیاز کو نہیں کھانے پاتا، مگر اتنے ہی طباق اُس کھانے سے بھر کے جدا

کھتی ہیں۔ وہ مردانی صحنک کہلاتی ہے، سب مردوں کو تقسیم کرتی ہیں جا بجا ہر ایک کے گھر میں بھیج دیتی ہیں، اس کا کچھ پرہیز نہیں، اُس کو چھٹی نیاز کہتی ہیں۔ اور اُن کے نزدیک یہ واجب ہے کہ جب وہ نیاز دینے لگیں، سب عورتیں دست بستہ کھڑی ہو جائیں اور بعد نیاز کے جھک جھک کر سلامیں کریں اور بلائیں لیں اور دعائیں مانگیں کہ اُس وقت حضرت بی بی وہاں تشریف لاتی ہیں۔ جو کوئی جو دعا مانگے، وہ قبول ہووے گی۔ جتنی ڈومنیاں بیٹھی ہوں گی، وہ اُس وقت مبارک باد گاویں گی، انعام پاویں گی، سب مل کے خوشیاں کریں گی۔ بعد اس کے اُن نیک زنوں کو اپنے مقدور کے موافق خواہ جوڑے، خواہ روپے، خواہ پانچ پانچ پیسے کچھ کچھ دے کے اپنے اپنے گھر روانہ کریں گی۔ اور اُس نیاز کو وہ عورت کھاوے گی کہ جس نے تمام عمر سوا اپنے خاوند کے نامحرم کا منہ نہ دیکھا ہو، اور بلکہ یہاں تک کہ کہیں اور اُس کی منگنی بھی نہ ہوئی ہو، یعنی جس کی ایک جگہ منگنی ہو کے چھوٹ جاوے گی اور دوسری جگہ بیاہ ہوا ہووے گا، تو وہ عورت بی بی کی صحنک پر نہ بیٹھے گی۔ اور کوئی نشہ نہ کھایا ہو، سبزی نہ پی ہو، بلکہ بہ ظاہر اس قدر احتیاط رہتی ہے کہ اپنے کھانا کھانے کا اور پانی پینے کا باسن الگ رکھتی ہیں، کسی کو اُس میں کھانے پینے نہیں دیتیں، باطن کا اُن کے خدا کو علم ہے کہ یہ بات جھوٹھ ہے یا سچ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بیش تر اوباش خانگی رنڈیاں جب چاہتی ہیں کہ اپنے کسی یار کے گھر جاویں، تو صحنک کھانے کا بہانہ کر کے، اپنے خاوند سے رخصت لے کے ڈولی پر سوار ہو کے جاتی ہیں، پہر دو پہر وہاں رہ کے، اپنے دل کا مطلب حاصل کر کے چلی آتی ہیں اور خاوند اُن کے جانتے ہیں کہ اُس شخص کی جورو بڑی پارسا ہے،

یعنی بی بی کی صحنک پر بیٹھی ہے۔ بلکہ ظاہر میں وہ خاوند کی جھوٹی کوئی چیز زبان پہ نہیں رکھتیں اور اسے اپنے باسن کو ہاتھ لگانے نہیں دیتیں۔ وہ بھی ان حرکتوں سے نہایت خوش ہوتے ہیں اور ان کو معتمد سمجھ کے، اُن کے صاحب عصمت ہونے پہ غافل ہوکے کسی حرکت پہ مانع نہیں ہوتے۔ بیت:

برزبان تسبیح و در دل گاو خر ۔۔۔ اینچنین تسبیح کی دارد اثر

عورتوں کے مکر پہ مت جا دلا ۔۔۔ ان کی عصمت پہ نہ بھولا کر ذرا

کیسی ہی یہ پارسا ہو ویں مگر ۔۔۔ ان سے لازم ہے سدا کرنا حذر

یاد ہیں ان کو بہت فن و فریب ۔۔۔ شکل پہ ان کی تو مت ہونا شکیب

اپنے تو نزدیک ثابت ہے یہ بات ۔۔۔ یاد رکھ یہ پند تو دن اور رات

جامہ کعبے کا اگر عورت کوئی ۔۔۔ پہن کر آوے ترے آگے کبھی

مجل نہ اُس کے کھائیو نہار تو ۔۔۔ مکر اُس کا جاننا اے یار تو

اور ایک اُن کے یہاں بی بی کی پُڑیاں کہلاتی ہیں، یعنی جب کسی عورت پہ کوئی مصیبت آن پڑتی ہے یا کوئی ضرور کام لاحق ہوتا ہے یا کوئی اپنے یار سے ملنے کی امیدوار ہے اور اُسے میسر نہیں ہوتا، تو وہ یہ مانتی ہے کہ یا حضرت بی بی! میری کھڑے کھڑے یہ مراد بر آوے تو میں تمھاری کھڑ پُڑیا دوں۔ جس وقت اس کا وہ کام پورا ہو وے گا تو اُسی وقت دیر نہ کرے گی۔ سوا پیسے کی یا اڑھائی پیسے کی یا اڑھائی دمڑی کی یا سوا دمڑی کی پُڑیا شکر کی بازار سے منگوا کے ایک نیک زن کو دے گی۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اس کو کھڑے کھڑے کھائے گی، بیٹھنے نہ پائے گی۔ اور سوا دمڑی سے پانچ پیسے تک یہ نیاز دلا دیتی ہیں، اس سے زیادہ نہیں عمل میں لاتی ہیں۔ اور ایک

ترکیب یہ ہے کہ مراد حاصل ہونے کے (بعد) فقط پُڑیا منگوا کے نیک زنوں کو بھیج دیتی ہیں، اس میں کھڑے کھڑے کی قید نہیں ہے، وہ اپنے جس وقت چاہیں کھائیں۔ اور ان کی مثلاً آج مراد بر آئی ہو تو کل تک بھی اگر یہ پُڑیاں منگوا کے بھیج دیویں تو مضایقہ نہیں رکھتا۔ ایک دن کے پس و پیش میں کچھ اندیشے کی جگہ نہیں ہے۔ وہ پُڑیاں فقط شکر کی ہوتی ہیں، مگر بعضوں کے نزدیک شکر کی جگہ اگر کوئی اور مٹھائی بھی ہو تو درست ہے۔ بعضوں نے فقط برفی ہی پر اکتفا کیا ہے، اور کسی مٹھائی کو جائز نہیں رکھا۔

اور ایک حضرت مشکل کُشا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دونا ہے، اُس کا بھی یہی طور ہے کہ جب جس کی کوئی منت بر آتی ہے تو وہ آسے منگواتی ہے، سوا پیسے سے پانچ پیسے تک، اس سے زیادہ اِس نیا نہ کا نہیں معمول ہے۔ اور اسی طرح جو حضرت بی بی کی پُڑیوں کا احوال بیان کیا ہے، بعینہ اس کا بھی نقشہ یوں ہی ہے۔ ایک کھڑا دونا کہلاتا ہے، اس کو کھڑے کھڑے کھاتی ہیں۔ اور دوسرا بچھا دونا مشہور ہے، اُس کو جس طرح سے چاہیں کھائیں، مگر اس میں کچھ مرد اور عورت کی قید نہیں ہے، جس کا جی چاہے کھا دے لیکن پاک صاف نہایا دھویا ہووے۔ جو عورت کہ حایض ہو یا جو مرد کہ اُس کو نہانے کی احتیاج ہو، وہ نہ اُس دونے کو ہاتھ لگاوے اور نہ کھاوے۔ بیشتر اس کا بھی یہی معمول ہے کہ جلیبیوں کا ہے، مگر بعضوں کے نزدیک اگر برفی کا بھی ہو تو چنداں قباحت نہیں رکھتا۔

اور ایک حضرت مشکل کُشا علی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا روزہ ہے کہ اُس کو سوا پہر دن چڑھے افطار کرتی ہیں، اس کا ڈول یہ ہے کہ دو پیسے سے زیادہ نہیں لیتیں، اُن میں کشمش اور چنے اور ایک آبخورہ مٹی کا لاتی ہیں اور سوا دمڑی

بچا کے وہ نیاز دلوا دیتی ہیں، اور ان چنوں کو چھیل چھلا کے، صاف کر کے خوب سا
دھو دھلا کے، کشمش میں ملا کے، ایک اچھوتی جگہ پر، ایک اچھے پاکیزہ باسن
میں رکھتی ہیں، مگر کشمش کو بھی خوب سا صاف کر لیتی ہیں۔ اور اُس آبخورے
میں اچھوتا پانی تازہ کنویں کا نکالا ہوا بھر کے رکھتی ہیں، اور تھوڑا سا اگر یا
لوبان سلگا دیتی ہیں، اُس وقت کسی سید کو بلا کے، حضرت کی نیاز دلواتی ہیں
اور وہ کوڑیاں اُس کے حوالے کر دیتی ہیں، اور آپ خوب سی دعائیں مانگ
کے اُس جگہ پر آکر بیٹھتی ہیں۔ مگر واجب ہے کہ جتنی عورتیں اُس گھر میں ہوں
وہ سب اُس نیاز کے وقت ہاتھ باندھے کھڑی رہیں اور بعد اس کے بلائیں
لیں اور دُعائیں مانگیں اور نیاز دینے والا اگرچہ کیسا ہی کڑیل جوان ہو مگر
اُس سے اُس وقت پردہ نہ کریں، اور جس شخص نے کہ روزہ رکھا ہو، وہ خوشبو
سُلگاتی جائے اور ایک عورت اُس کے سامنے آن کر بیٹھے اور یہ کہانی کہے،
وہ کہانی یہ ہے کہ:

"ایک گھسیارا تھا افلاس کا مارا، فاقہ کشی سے حالت تباہ، لنگوٹی بدن
پر میسر نہ ہوتی تھی۔ چار پہر دن گھاس کھودتا تھا، شام کو اُسے بیچ کر روٹی ٹکڑا کر(؟)
کھاتا تھا۔ اُس کی جورو نے ہمسایوں کی دیکھا دیکھی، ایک روز جب وہ گھسیارا بیچ
بیچ کے لایا، اس میں سے آدھا کھایا اور کھلایا اور آدھا اُٹھا رکھا۔ فجر کو کشمش
چنے منگوا کے بدستور جس طرح اوپر اس کا بیان کیا ہے، وہ سوا پہر کا روزہ رکھا۔
دوسرے روز خاوند اُس کا جو گھاس کھودنے کو جاتا ہے جنگل میں کیا دیکھتا ہے
ایک پتھر پڑا ہوا ہے۔ اُس نے بہ زور اس پتھر کو اُٹھایا، ایک تہ خانہ اُس میں
نظر آیا۔ یہ جو اُس کے اندر گیا، سوا کنکر پتھر کے کچھ اس کے ہاتھ نہ آیا۔ اُس نے
وہی اپنی کملی میں بھر لیے اور شام کو گھر میں پریشان حیران جورو کے پاس آکے

یہ کرنے لگا بیان :

آج محنت ہوئی مری برباد — گھر کو خالی ہی آیا میں ناشاد
سارے جنگل کو چھان مارا (پر) — پتا اک گھاس کا نہ آیا نظر
ہو کے لاچار واں سے گھر آیا — پتھر اک تھوڑے سے اُٹھا لایا
جوں ہی وہ دیکھتی ہے ان کو کھول — نظر آئے جواہرات اَن مول

دیکھے کیا ہے کہ کل جواہر اور موتی بیش قیمت بھرے ہوئے ہیں۔ اُس وقت وہ اُس سے کچھ نہ بولی، صبح کو اُٹھتے ہی یوں خاوند سے زبان کھولی؛ ایک دو ان میں سے چھوٹے موٹے دیے کہ جوہری بازار میں جا کے انھیں بیچ لا۔ وہ بے چارہ یہ بات سُن کے کمال گھبرایا اور بہ حیرت تمام یہ بات زبان پر لایا :
ان کنکروں کو میں کہاں لے جاؤں اور کسے جا کے دکھاؤں؟ وہ ہنس کر بولی تو اسے جوہریوں کے پاس لے جا، جو کچھ وہ دلویں، لے آ۔ جب یہ لاچار ہوا تو بازار میں وہ موتی لے گیا، کئی روپوں کو بیچ لایا، خوشی خوشی گھر میں آیا، بی بی سے ہنس کر بولا کہ یہ عجائب پتھر ہیں، جن کی بدولت، روپے کی صورت کبھی نہ دیکھی تھی، سو دیکھی۔ الغرض اُن کو بھنا کے کچھ کھانے کے مصرف میں لایا اور کچھ کپڑا لتّا بنایا۔ اسی طرح روز جا کے بیچ لاتا تھا اور اسباب اپنا درست کرتا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ سب لیاقت اپنی درست کی اور عمارتِ عالی بنائی، سارے عالم میں سوداگر مشہور ہوا۔

ایک روز ایک درِ بے بہا کسی جوہری کے ہاتھ بیچا، وہ رفتہ رفتہ اُس شہر کے بادشاہ کے پاس پہنچا۔ اُس نے اپنی بیٹی کو دیا، وہ دیکھتے ہی لوٹ گئی اور یہ بات کہنے لگی کہ اگر دوسرا اس کے ساتھ کا موتی جب تک مجھے نہ منگوا دو گے، تو نہ میں کھانا کھاؤں گی، نہ پانی پیوں گی۔ بادشاہ کو وہ بیٹی اپنی نہایت

عزیز تھی، یہ بات سُنتے ہی مضطرب ہو کے باہر آیا اور سب جوہریوں کو بلوا کے یہ فرمایا: خیریت اس میں ہے کہ جلدی اس کے مقابلے کا دوسرا موتی پیدا کرو، نہیں میں تم کو گردن مار دوں گا۔ اُن بچاروں نے ہر چند تلاش کی مگر وہ شے ہاتھ نہ آئی۔ لاچار ہو کے بادشاہ سے عرض کی کہ ہم کو اس کے ساتھ کا موتی دوسرا نہیں ملتا ہے، مگر ایک سوداگر آپ کے شہر میں رہتا ہے، اُس سے یہ موتی ہم نے مول لیا تھا، اگر آپ اُس کے پاس کوئی اپنا آدمی بھیجیں تو شاید وہاں سے درِ مقصود ہاتھ لگے۔ بادشاہ نے فوراً اس سوداگر کی طلب کو لوگ بھیجے اور وہ موتی بھی بھیج دیا کہ اس کے ساتھ کا اگر کوئی اور ہو تو لیتا آ۔ گھسیارا سخت بے حواس ہوا اور جورو کے پاس جا کے یہ حال بیان کیا۔ اُس نے کہا: اے احمق! یہ وقتِ خوشی ہے نہ جائے حیرانی۔ حاکم نے اس شہر کے تجھ سے فرمائش کی اور تجھے بلایا ہے، اس کو اپنا فخر سمجھ۔ یہ کہ کے، کئی جوڑی موتیوں کی ویسی اور کئی طرح کے جواہر کشتیوں میں اُسے لگا کے دیے کہ یہ پہلے جا کے پیش کش کیجیو۔

القصہ یہ ترساں ہراساں بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوا اور وہ کشتیاں نذر گزرانیں۔ بادشاہ کے حواس اُڑ گئے کہ اِس سوداگر نے ایسے جواہر کہاں سے پائے۔ بہت سی اس کی خاطر داری کی اور خلعتِ فاخرہ سے سرفراز کر کے، یہ فرمایا کہ تو ہمارے پاس ہر روز اور ہر وقت حاضر رہا کر۔ الغرض جوں جوں اُس روز سے یہ حاضر باشی کرتا تھا اور مقربِ درگاہ ہوتا تھا، اور رتبہ اس کا بڑھتا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ بالکل اس سرکار میں مالک بن کے تمام امورِ شاہی میں دخل دینے لگا، کوئی اس کے مقابل وہاں نہ رہا، سب چیز وبل پر اس کا بندوبست ہو گیا۔ بادشاہ بھی جو بات کہیں سو اسی سے کہیں، دوسرے

کو حکم نہ کریں۔ اور اندر محل میں بی بی اس کی اسی طرح مصاحبت میں بادشاہ زادی کی ممتاز تھی کہ بغیر اس کے ایک دم اس کو چین نہ آتا تھا اور اپنے سب کارخانے اس کے حوالے کر دیے تھے۔

گھسیارا امورِ ملکی و مالی میں یہاں تک غرق ہوا کہ ایک لحظے کی فرصت نہ پاتا تھا اور غرۂ جاہ و دولت سے یہاں تک مغرور ہوا کہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا، سراسر اپنی حقیقت کے تئیں بھول گیا کہ ایک روز نوکروں نے عرض کی کہ کل ساتویں تاریخ ہے، صبح کو روزہ رکھنا ہوگا۔ اُس نے کمال منغّص ہو کے یہ بات کہی کہ آج تک مجھے اس روزہ رکھنے سے کیا فائدہ ہوا جو میں آگے پھر رکھوں، اور یہ بات کہہ کے، پھر کبھی وہ روزہ (نہ) رکھا۔ جب اس بات کو دو ایک مہینے گزرے، ایک روز خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ بادشاہ نے کچھ روپے خزانے سے طلب کیے۔ جب کلید برداروں نے کوٹھے کو کھولا تو وہاں ایک روپیا نظر نہ پڑا۔ اسی طرح جس کوٹھے کو دیکھا، خالی پایا۔ لاچار ہو کے بادشاہ سے جا کے عرض کی کہ جس روز سے خزانۂ عامرہ میں روپیا رکھا گیا ہے، کبھی ہم لوگوں سے خیانت نہیں ہوئی، مگر اس سوداگر نے معلوم نہیں کیا جادو کیا ہے کہ ایک کوٹھے میں بھی ایک پیسا نظر نہیں آتا۔ بادشاہ یہ بات سن کے نہایت حیران ہوئے اور اپنے مشیروں سے اس امر کی مشورت کی، سبھوں کی صلاح یہی ٹھہری کہ مقرر کچھ اس سوداگر کا ہی پیچ ہے کہ جو یہ بات وقوع میں آئی ہے۔ الغرض اس لم پر بادشاہ نے اس کو جیل خانے میں بھیجا اور بیڑیاں اس کے پانو میں ڈلوا دیں۔

اب اندر محل کا ماجرا سنو کہ اس کے دوسرے روز بادشاہ زادی حمام میں نہانے کو گئیں اور اپنا نولکھا ہار گلے سے اُتار کے، ایک کاٹھ کی مورنی وہاں

لٹکی تھی، اُس پر ڈال دیا۔ اس سوداگر کی جورو کو کہ گئیں کہ تو اس کی نگہ بانی کرتی رہیو۔ یہ بچاری کیا دیکھتی ہے کہ وہ مورنی خود بہ خود اس ہار کو نگل گئی۔ یہ اس ماجرے کو دیکھ کے دریاے تفکر میں غوطہ کھانے لگی، سکتے کی سی حالت ہوگئی۔ اتنے میں بادشاہ زادی وہاں سے فراغت کرکے آئیں اور یہ بات زبان پر لائیں کہ اے سوداگر کی جورو! تو حیران کیوں بیٹھی ہے، جلدی اُٹھ اور میرا ہار اس پر سے اُتار لا کہ میں پہنوں۔ اس نے احوال سب بیان کیا۔ بادشاہ زادی یہ سُنتے ہی کمال غصّے میں آئی کہ کہیں آج تک یہ بات ہوئی ہے کہ کاٹھ کی مورنی ہار نگل جاوے! خاوند تو تیرا جادوگر تھا، مگر تو اُس سے زیادہ تر نکلی۔ جلدی اس کے بھی بیڑیاں ڈال کے، اُسی کے پاس بھجوا دیا۔

یہ غم زدے، حیرت کے مارے، آفت رسیدہ، ظلم دیدہ اُس بندی خانے میں اوقات گزاری کرتے تھے۔ ایک شب خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ جناب امیر علیہ السلام تشریف لائے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اے گھیارے! تو نے ہمارا روزہ رکھنا موقوف کیا اور یہ بات کہی کہ مجھے اس سے کیا حاصل ہوا۔ دیکھا، اس بات کا خمیازہ پایا۔ یہ دونوں قدم مبارک پر گر پڑے اور زار زار رو کے یہ عرض کرنے لگے:

اے بادشاہِ ہر دو سرا! ہم پہ رحم کر　　مرتے ہیں ہم تو، بہرِ خدا ہم پہ رحم کر
تو ہے کریم، اپنے کرم پر نگاہ کر　　ہم ہیں گناہ گار، نہ ہم پر نگاہ کر

حضرت نے یہ بات فرمائی کہ کل ساتویں تاریخ ہے، تو نہا دھو کے روزہ رکھنا۔ انھوں نے عرض کی کہ ہم قیدی کیونکر نہا سکیں گے، پیسے کہاں سے پائیں گے کہ روزہ رکھیں گے۔ اتنے میں آنکھ اُن دونوں کی کھل گئی، اور خاوند نے جورو سے اس خواب کا احوال بیان کیا۔ اُن نے کہا کہ تیرے سر کی قسم، میں نے

بھی بعینہ یہی نقشہ دیکھا ہے۔ اس میں سرہانے جو ہاتھ ڈالتے ہیں، دو پیسے نظر آئے، انھوں نے چوم کے اُٹھا لیے اور فوراً اپنی بیڑیاں کٹی پائیں، کھلے بندوں اٹھ کھڑے ہوئے اور کنوئیں پہ جا کے، نہا دھو کے، پھر اسی مقام پہ آ بیٹھے۔ کوئی نگہ بانوں میں ان کا مزاحم نہ ہوا۔ صبح کو ایک شخص خوشی خوشی دوڑا ہوا راستے میں جاتا تھا، انھوں نے اُس کو بلا کے کہا کہ اے عزیز! ہم نے مشکل کُشا علیہ السّلام کا روزہ رکھا ہے، یہ ٹکا لے اور اس سودا لا دے۔ اُس نے جواب دیا کہ یہ بات نہیں ہونے والی، مجھے اپنے بیٹے کی برہی کا سودا خرید کرنا ہے، اگر میں تیرے کام میں دو چار گھڑیاں لگاؤں گا تو میری ہرج ہو جائے گی۔ یہ کہہ کے وہ چلا گیا۔ بعد اس کے ایک اور شخص پژمردہ خاطر، گریباں چاک، آنکھوں سے آنسو جاری، سر پہ خاک اڑاتا ہوا اُس راہ سے نکلا۔ ان دونوں نے اس سے بھی یہی سوال کیا۔ وہ بولا کہ اُس شخص کا بیٹا مرگیا (کذا)، اُس کے واسطے کفن خریدنے کو جاتا ہوں، اگر کچھ عرصہ ہو جائے گا تو بلا سے، پہلے میں اس جناب کا کام کر لوں۔ یہ کہہ کے بہ کمال کشادہ پیشانی وہ ٹکا لے لیا اور اُن کو سب سودا خرید کر کے لا دیا۔ جب تک اُنھوں نے روزہ نہ کھولا، تب تک ان کی خدمت میں مصروف رہا، جب یہ اس سے فراغت پا چکے، تو انھوں نے اس کے بیٹے کے حق میں بھی دعا مانگی اور اسے رخصت کیا۔

اس عرصے میں وہ نگہ بان جیل خانے کے کچھ خود بہ خود ہشیار ہوئے اور اُن کی بیڑیاں کٹی پائیں، نہایت گھبرائے اور بادشاہ سے جا کے عرض کی کہ آج اُن جادوگروں کی از خود بیڑیاں کٹ گئیں ہیں، وہ کمال خوش بیٹھے ہیں۔ یہ بات وہ ہنوز تمام کر نہیں پائے تھے کہ ایک شور و فریاد کی اور آواز آئی۔ بادشاہ نے

پوچھا کہ یہ کون آئے ہیں، ان کو ہمارے سامنے لاؤ۔ جب وہ آگے آئے تو اُن میں سے ایک نے سامنے آن کر یوں کہا کہ وہ شخص اپنے بیٹے کی شادی کے واسطے کچھ خریدنے کو جاتا تھا، جیل خانے کے دروازے پر ایک عورت اور ایک مرد قیدی بیٹھے ہوئے تھے، وہ مجھے دیکھ کے کچھ سودا منگوانے لگے، میں جو نہ لایا تو میرا وہیں بیٹا مر گیا۔ بادشاہ یہ سن کے اور حیران ہوئے کہ اس عرصے میں خبر دار نے ان کو خبر دی کہ ایک شخص کا بیٹا مر گیا تھا، وہ کفن خریدنے جاتا تھا، ایک دو جیل خانے کے قیدیوں نے کچھ اُس سے کہا، وہ اُس نے قبول کیا، اُن کی دعا سے اُس کا لڑکا مردہ جی اُٹھا۔ بادشاہ کو اور ایک تعجب لاحق ہوا، کہ وہیں محل سے محل دارنی دوڑی آئی اور مجرا کر کے عرض کرنے لگی کہ جلدی آپ محل میں تشریف لے چلیے، عجب طرح کا تماشا ہے، وہ نولکھا ہار بادشاہ زادی کا جو چوری گیا تھا اور اُس جادوگرنی کا نام ہوا تھا، وہ کاٹھ کی مورنی خود بہ خود اُگل رہی ہے، چلیے اور اس لطف کو دیکھیے۔ بادشاہ اور سب ارکانِ دولت نہایت متحیر ہوئے اور دونوں قیدیوں کو بلوا کے فرمایا کہ تم کون ہو؟ اپنا احوال بیان کرو۔ اس وقت انھوں نے جو از اول تا آخر ان پر گزرا تھا، سب بادشاہ کی خدمت میں اظہار کیا اور کہا کہ اب ہمارے آقا نے ہماری تقصیر معاف کی، اب ہمیں کسی بات کا اندیشہ نہیں ہے۔ بادشاہ نے وہیں ان کے قدموں کو آنکھوں سے لگایا اور آگے سے دہ چند رتبہ اُن کا بڑھایا جیسے اُن کے دن پھرے، ویسے کہتے سنتوں کے دن پھریں۔"

جب وہ عورت اس کہانی کو کہہ چکے تو یہ صاحب روزہ اُس وقت روزہ کھولے۔ اور بعضوں نے اس روزے کو چار پہر بھی رکھا ہے اور جلیبیوں پر فاتحہ دلوائی ہے۔

اور ایک حضرت امام مہدی آخرالزماں علیہ السلام کا روزہ ہے کہ چار پہر کے بعد اس طرح کھولے، یعنی سوا پا گوشت اور سوا پا گھی کا قورما پکا کے، شام کے وقت سوا پا آٹے کی روٹی کے ساتھ فاتحہ دلا کے کھاوے، اور اُس جگہ شمع روشن کرے، اور اگر اور لبان جلائے، اس کھانے میں سے کسی کو ذرا نہ دے، سب آپ ہی کھائے، اگر اُس وقت نہ کھایا جائے تو دوپہر کے بعد اس کو تمام کرے، لیکن شرط یہ ہے کہ روزہ کھولتے وقت ایک اچھی پاکیزہ زمین لیپ پوت کے، اُس پر اپنا بستر لگائے اور وہیں فاتحہ دلائے۔ بعد اس کے اُس بچھونے پر سے صبح تک نیچے قدم نہ رکھے، نہ پاخانے جائے نہ پیشاب کرے، وہیں سو رہے، جو کچھ رات کو خواب میں دیکھے گا، وہی بات ظہور میں آئے گی، مگر نوچندی جمعرات کو نہ روزہ رکھنا شروع کرتے ہیں (کذا) چھے نوچندیاں رکھ لے، ساتویں نوچندی کو گروی رکھتے ہیں، اس شرط پہ کہ جب ہمارا مقصد پورا ہوگا تو ساتواں روزہ، ساتویں نوچندی کو رکھیں گے یقین ہے کہ جلدی مطلب اس کا بر آئے گا۔ یہ بیشتر نیک زنوں نے تجربہ کیا ہے، کبھی یہ بات خالی نہیں گئی۔

اسی طرح رجب ہٹیلے کا مرغا، شاہ سلطان کا روٹ، بی جاگتی جوت کی نوبت، بی سہجان کی کڑھائی کہ مشکل سہج سے آسان ہو، بی ٹپک کی سپاری کہ مراد ٹپک پڑے، یا ترت پھرت کی پوڑیاں، بی کشٹی کا کونڈا کہ جس میں جلدی کشٹ یعنی مشکل آسان ہو، بی حال بحال کی کٹی، بی آس کی ٹکیا، شتاب مرتضیٰ کا ملیدا، اس کی یہ ترکیب ہے کہ ایک کھونٹی باسن کی (کذا) ایک دیوار میں گاڑ کے، اُس پہ ایک ناڑا باندھ کے، یہ منت مانتی ہیں کہ یا شتاب مرتضیٰ! میری شتاب مراد بر آوے تو تمھارا ملیدا کروں گی۔ جس وقت اُن کا

مطلب حاصل ہوتا ہے تو نو کوری میں (کذا) شکر، آٹا منگوا کے نیاز دلاتی ہیں۔

اور ایک بڑ بڑ یروں کی نیاز ہے کہ جب کوئی شادی بیاہ کی یا مسلمانی کی یا سال گرہ کی کسی کے لڑکے کی ہوگی، تو وہ جب اُس کا جوڑا بیونتے گی تو اُس کپڑے میں سے ایک ٹکڑا بڑ بڑیروں کے نام کا نکال کے، یا سہرا باندھے گی تو اُس میں سے دو پھول نکال کے رکھے گی۔

اور ایک ستی کا ٹکا ہے، لیکن رسم نومسلموں کے یہاں کی ہے، کہ جن کی ایک پُشت میں یا دو پُشت میں یا چار پُشت میں کوئی ہندو سے مسلمان ہوا ہے، اور کوئی اُن کی پشتیوں میں ستی ہوگئی ہے، تو وہ مسلمان ہوئے پر بھی مانے جاتے ہیں، اسی طرح سے کہ جو اپنے عزیز کی کوئی منت کرے گی تو پہلے ستی کا ٹکا دھو کے اُٹھا رکھے گی اور انھیں میں سے کسی ہندنی کو دے گی، نہیں تو وہ اُسے ایذا پہنچا دے گی۔ یہ رسم پورب اور شاہ جہاں آباد اور لاہور میں سب جگہ جاری ہے۔

اور اسی وضع سے پیر نصیر الدین کی شیرینی مانتی ہیں اور ایک محرم میں عشرے کے روز اپنے لڑکے کی منت کے واسطے دہی خشکے کے پیالے بھرتی ہیں۔ لیکن ان کے یہاں بعضوں نے اُس روز منت کے پیالے بھرنا مناسب نہیں جانا، اس واسطے سیوم کے روز تا چہلم کے روز بھی جائز رکھا ہے، یہ بات اُن کی نسبت اچھی ہے۔

اور بارہ وفات میں بارہ روز ہر روز بتاشوں پر فاتحہ دلا دیتی ہیں۔ اور تیرہ تیزی کے چنے کو یا گیہوں کو اُبال کے تھوڑوں میں نون مرچ لگا کے، تھوڑوں میں شکر ملا کے نیاز دلاتی ہیں اور ان کا نام گھنگھنیاں رکھا ہے۔ اور رجب کے جمعے کو شاہ جلال بخاری کا کونڈا کرنا بھی ان کے نزدیک واجبات سے ہے، خواہ دہی خشکے کا ہو، خواہ زردہ اور پلاؤ کا، خواہ جلیبیوں کا، جیسا مقدور (ہو)

اس کے موافق عمل میں لاتی ہیں۔ لیکن جس کے ایک لڑکا ہو تو وہ ایک مردانہ اور ایک زنانہ کونڈا کرے گی اور ہر سال کرتی رہے گی۔ اور جس کے دو لڑکے ہوں وہ دو کونڈے اسی طرح ایک زنانہ اور ایک مردانہ کرے گی اور اس کا بھی کھانا باہر نہیں نکالتیں، وہیں کونڈے پر بیٹھا کے کھلاتی ہیں، شمعیں روشن کرتی ہیں، اگر بتیاں جلاتی ہیں، بڑی دھوم سے فاتحہ دلاتی ہیں اور سب لوگوں کو بلوا کے کھلواتی ہیں اور اگر پہلے جمعے کو نہ مقدور ہو، یا کچھ سبب ہو گیا تو دوسرے جمعے کو، تیسرے جمعے کو، چوتھے جمعے تک اس کونڈے کو کریں گی۔

اور ایک خواجہ خضر کی ناد ہے کہ وہ بھی بھادوں کے مہینے میں جمعے کے روز کرتی ہیں، یعنی چاروں جمعوں میں جس جمعے کو جی چاہا، ایک کاغذ کی ناد رنگین بنا کے ایک آدمی کے سر پر رکھتی ہیں، اور ایک دیگ میں دلیا پکا کے ساتھ کر دیتی ہیں اور آگے روشن چوکی اور باجے بجتے ہوئے دریا پر لے جاتی ہیں، وہاں جا کے، اُس ناد میں گھی کے چراغ روشن کر کے، بیچ منجدھار میں بہا دیتی ہیں۔ اگر وہ فوراً بہہ جاتی ہے تو جانتی ہیں کہ مراد جلد حاصل ہو گی۔ اور اُس دلیے پر ایک سقا پرانا کہ جو سب میں کھوسٹ ہو، آن کر فاتحہ دیتا ہے۔ اس فاتحے کا عجایب لطیفہ ہے کہ نہ دید ہے نہ شنید ہے، عجب عجب طرح کے وہ نام لیتا ہے، کہیں زمین کی خیر مانگتا ہے کہیں آسمان کی، کہیں چھپر کی کہیں دالان کی خیر مانگتا ہے، غرض ہزاروں ہی نام لیتا ہے، قابلِ بیان نہیں ہے، اگر سنیے تو اس کا لطف حاصل ہو۔

اور ایک جمعے کو پیر جلیلوں کی درگاہ میں جا کے، گلگلے اور کھچڑی میں تیل بجائے گھی کے ڈال کے چڑھاتی ہیں۔ اسی طرح شاہ چھڑا کی درگاہ میں تمباکو، اور شاہ مینا کی درگاہ میں گڑ اور پینا لے جاتی ہیں۔ اور ایک پریوں کی بیٹھک کا احوال ہے: جب عورت کا کوئی لڑکا بیمار ہوتا ہے یا کسی کا خاوند سفر کو جاتا ہے اور مدت

سے اسکی خبر نہیں آتی، تو اس کو یہ احتمال ہوتا ہے کہ شاید کسی اور رنڈی کو گھر میں ڈالا ہے کہ میری خبر نہیں پوچھتا یا کسی اور طرف مصروف ہے، یا اس کے سوا کوئی اور حاجت درپیش ہوتی ہے، تو اس کے واسطے پریوں کی بیٹھک کرتی ہیں۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ جس عورت پر پریاں آتی ہیں، یعنی سبز پری، لال پری، آسمان پری، شاہ پری، دریا پری، اُس کو اپنے گھر بلاتی ہیں یا آپ اُس کے گھر جاتی ہیں۔ ایک نیا جوڑا بہت تحفہ بنا کے، کچھ تھوڑا سا عطر اور پھول لے کے اُس کی نذر کرتی ہیں۔ وہ اُس وقت نہاتی ہے، لال جوڑا پہنتی ہے، خوشبوئیاں لگاتی ہے، اُجلے فرش پر ایک مسند بچھا کے، بال کھول کے بیٹھتی ہے اور سامنے ڈومنیاں آ کے گاتی ہیں، بجاتی ہیں، رجھاتی ہیں۔ جب خوب گانے کا سماں بندھتا ہے تو اُس وقت وہ سر کو ہلانے لگتی ہے اور کھیلتی ہے۔ اس میں عورتیں پوچھتی جاتی ہیں یعنی، واری جاؤں، تم کون پری ہو؟ تم اپنا نام بتاؤ، تم نے اپنا کرم کیا ہے، تم اتنی دور سے آئی ہو، بھلا ہمیں بھی اپنے نام سے سرفراز کرو۔ بعد دیر کے جب وہ اپنا نام بتاتی ہیں اور گانے سے محظوظ ہو کے باتیں کرنے لگتی ہیں تو کوئی اپنے لڑکے کو اُن کے سامنے چت لٹا دیتی ہے اور منتیں کرتی ہے کہ خدا کے واسطے اس پر کرم کرو۔ وہ اپنے بالوں کو اُس کے پیٹ پر خوب سا ہلاتی ہیں اور جھاڑتی ہیں، یا کچھ جو سایہ ہوتا ہے تو اُس کا احوال بتاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اس کو فلانے کا سایہ ہے، اس کا علاج یہ کرو: پتلا ماش کا آدھی رات کو کسی درخت کی جڑ میں گاڑ دو یا کچھ اُس کے بدن کا کپڑا اس کے بدن سے چھوا کے کسی کو دے ڈالو یا کچھ اور کوئی صدقہ اس پر سے اُتارو۔ اُس وقت اس کو یقین ہوتا ہے کہ میرا لڑکا اچھا ہو گیا۔ اور جو کچھ وہ بتا جاتی ہیں، اُس کو کرنا ان کے نزدیک فرض ہے۔ یا کوئی اپنے خاوند کا احوال پوچھتی ہے، کوئی اُن سے لونگیں پڑھوا کے اپنے خاوند کے واسطے

لے جاتی ہے کہ اُسے الفت زیادہ ہو، یا کوئی کالی مرچیں دم کرواکے اپنی سوت کے واسطے لاتی ہے کہ اُس کے خاوند کا دل اُس سے پھر جائے، یا راکھ پر کچھ پڑھ کے وہ پھونک دیتی ہیں کہ اُس راکھ کو اگر رستے میں دونوں کے ڈال دیجیے تو فوراً اُس کے یار کا دل اُس سے بیزار ہو جائے گا۔

القصہ پھر دوپہر تک اُس بیٹھک کا جلسہ رہتا ہے۔ ہر ایک اپنا مطلب دل پوچھتی جاتی ہے اور غائب اور آیندہ کا سب حال بتاتی جاتی ہیں، اِس میں جس روز جس کی مراد بر آتی ہے، وہ پھر دوبارہ اسی طرح ان کی بیٹھک کرتی ہے اور ہمیشہ مانے جاتی ہے۔ جب کوئی شادی اُس کے گھر ہونے لگے گی تو مقرر پہلے سب کے ایک ٹکا پریوں کے نام کا دھو دھلا کے، کپڑے میں باندھ رکھ چھوڑتی ہے، بعد فراغت کے اُس عورت کو جس کے سر پہ وہ پریاں آتی ہیں، اس کو بھیج دیتی ہے۔

اور بعضی عورتوں کے سر پہ شاہ دریا، زین خاں، ننّھے میاں، سدرجہاں، شاہ سکندر وغیرہ آتے ہیں۔ اُن کے بُلانے کا یہ نقشہ ہے کہ اسی طرح عورت نہا دھو کے، اچھی پوشاک پہن کے، پگڑی سر پہ رکھ کے، ننگی تلوار ہاتھ میں لے کر کھیلتی ہے، اور وہ جب اس کے سر پہ آتے ہیں تو اُٹھ کھڑی ہوتی ہے، پھر وں سر ہلاتی ہے، تلوار کو نچاتی ہے، لاکھوں باتیں بتاتی ہے، مردانی گفتگو میں احوال سب کو جتاتی ہے، اس کو یہ مشہور کرتی ہیں کہ یہ لوگ اس عورت پہ عاشق ہیں، جو یہ کہتی ہے سو یہ کرتے ہیں، بلکہ اُن سے اسی طرح سب پوچھتی ہیں: میاں! یہ تمھاری معشوق نے ہم سے کہا ہے کہ جب میاں میرے سر پہ تشریف لاویں تو اُن سے میری طرف سے یوں پوچھنا، یوں پوچھنا اور جو کچھ وہ فرما دیں گے وہ مجھ سے کہہ دینا، صدقے جاؤں، اپنے محبوب کی خاطر سے جو کچھ ٹھیک ٹھیک احوال

ہو وہ بتاتے جاؤ۔ اور ہر ایک کہتی ہے کہ میاں! جب ہماری مراد بر آئے گی تو ہم بھی تمھاری بیٹھک کریں گے۔ وہ ان باتوں سے خوش ہوتے جاتے ہیں اور لوگوں کا احوال بتاتے ہیں۔

اسی طرح ایک شیخ سدّو ہیں کہ اُن کا بکرا اور کڑھائی ہوتی ہے اور ہر ایک عورت سب سے اُن کو زبردست جانتی ہے۔ چنانچہ یوں مشہور کرتی ہیں کہ "بوٹی کھائے، بکرا دے"۔ یعنی جو کوئی اُن کے بکرے میں سے ایک بوٹی یا شوربا چکھے گا تو اُس کو سارا بکرا دینا پڑے گا، اور بیٹھک کرنی ہوگی، نہیں تو یہ اُسے نہایت ایذا دیں گے اور گھر بار اُس کا تباہ کرنے لگیں گے۔ یا جو کوئی اُن کی کڑھائی میں سے ایک گلگلا چکھے گا، اسی طرح اُس کو ساری کڑھائی کرنی پڑے گی۔ اس کڑھائی کی ترکیب یہ ہے کہ جتنی عورتیں میراں جی یعنی شیخ سدّو کی قائل ہیں، وہ سب نہا دھو کے، پاک صاف ہو کے، جو کڑھائی کرتی ہے اُس کے گھر میں جمع ہوتی ہیں اور تمام رات جاگتی رہتی ہیں، گانے بجانے میں بہ خوشی تمام اوقات صرف کرتی ہیں، آٹا، گُڑ جس قدر مقدور ہوتا ہے، منگوا کے، اُس کو پانی میں گھول کے لتھ کرتی ہیں، بعد اس کے کڑھائی چڑھا کے، تیل بہت سا اُس میں ڈال کے نیچے آگ جلاتی ہیں اور تھوڑا تھوڑا سا وہ گُڑ اور آٹا جو لتھ کیا ہے، اُس کی گلیلیاں باندھ کے اُس تیل میں ڈالتی جاتی ہیں۔ جب وہ خوب سی سُرخ ہو جاتی ہیں تو اُن کو نکال کے، ایک کورے باسن میں رکھتی جاتی ہیں اور اُن کا نام گُلگلے رکھا ہے۔

اور موافق معمول کے وہ صاحب خانہ اچھا جوڑا پہن کے، ہار پان پھول عطر لگا کے، کھیلنے بیٹھتی ہے اور ڈومنیاں گرد اُس کے گاتی جاتی ہیں، تب میاں شیخ سدّو اُس کے سر پر آتے ہیں اور بڑے بڑے سانگ لاتے ہیں۔ فی الحقیقت اُس وقت

عجب طرح کا لطف ہوتا ہے۔ اُدھر تو ساری عورتیں خوب صورت خوب صورت اپنے تئیں بنا بنا کے، سنوار سنوار کے سامنے بیٹھی ہوئی ہیں۔ کوئی تو انھیں سجدہ کر رہی ہے، کوئی کہتی ہے کہ میاں! میرے بھی گھر میں اگر لڑکا ہو تو میں تمھاری کڑھائی کروں۔ کوئی کہتی ہے: میاں! میرا خاوند مجھ سے لڑتا بِھڑتا ہے، تم ذرا اس کو سمجھا دو۔ کوئی کہتی ہے: میاں! میرے خاوند نے اور جورو کی ہے، میری صورت سے بیزار ہے، کچھ ایسا کرو کہ پھر میرا گھر بھرے تو میں تمھارا بکرا دوں۔ کوئی ناک گھسنی کر رہی ہے اور پھولی نہیں سماتی ہے، مزے مزے کی باتیں کرتی جاتی ہیں اور ہر ایک اپنی الفت جتاتی ہے، یہ خاطر میں نہیں لاتے ہیں۔ اور اُدھر ڈومنیاں بیٹھی یہ گیت گاتی ہیں:

یہ سارے پیروں سے تم کو میاں بڑائی ہے جو تم آئے ہو تو سب مراد آئی ہے (کذا)

اُدھر کڑھائی کا سماں ہو رہا ہے، گلگلے تلے جاتے ہیں، منتیں مانی جاتی ہیں، سب اوباش رنڈیاں کوئی ہنسی، کوئی ٹھٹھا، کوئی گالی گلوچ آپس میں کر رہی ہے کوئی کسی کے چٹکی میراں کے سامنے لے کے، اُن کو سنا کے کہتی ہے کہ بُوا! تو ہزار اپنی بناوٹ دکھا دے گی لیکن میاں تجھے جوتی نہ ماریں گے، وہ ہمیں کو چاہتے ہیں۔ کوئی کہتی ہے کہ واہ! یہ ہمارے مدت سے آشنا ہیں، ہمارے ہوتے کسی اور طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں گے۔ کوئی از راہِ شوخی پھر انھیں سے پوچھتی ہے کہ میاں سچ کہو، ان سب میں سے تمھاری رغبت کس طرف ہے، تم کسے پیار کرتے ہو؟ جسے وہ بتاتے ہیں، وہ پھر مارے خوشی کے آپ میں نہیں رہتی، گویا سچ مچ کسی مرد سے ملاقات کرتی ہے ور اپنے چاہنے والے کو پاتی ہے، اور وہ بھی مسخر الذین گویا عاشق تن ہیں اور اپنے تئیں بریزاد سمجھتے ہیں، جانتے ہیں کہ فی الحقیقت ساری رنڈیاں ہم پر مرتی ہیں، ہر ایک کو کمال بے پروائی سے جواب دیتے ہیں۔

اور بعضی عورتوں کے نزدیک یوں ہے کہ شیخ سدو جس کے سر پر آتے ہیں تو اس سے مقاربت کرکے جب فارغ ہوتے ہیں تو وہ ہوش میں آتی ہے اور وہ مزہ اُس کو نہیں بھولتا۔ اور جو کوئی اُن کی کڑھائی کرنا بھول جاوے (یا) اس سال بے مقدوری سے نہ دیوے تو اُن کے نزدیک یوں ہے کہ اسی برس میں اُس کا ستّیاناس مل جائے گا اور اس کا کہیں ٹھکانا نہ رہے گا۔ ہزار اُن پر تکلیف ہو، قرض لیویں، چوری کریں، پر میاں کی کڑھائی بغیر کیے نہ رہیں۔

اسی طرح سید احمد کبیر کی گاے ہے، اس کا یہ حال ہے کہ ایک گاے منگوا کے، چہل ابدالوں کو دیتی ہیں۔ وہ اُس کے ہاتھ پانو میں رات کو منہدی لگاتے ہیں، سہرا باندھتے ہیں، اور رات بھر گاتے بجاتے ہیں۔ سوا من کوئلے یا پچیس سیر، حد پانسیر تک آگے ڈھیر ہوتے ہیں، اُن کو سلگا کے، اس پر لوٹتے ہیں، مگر کپڑا یا بدن اُن کا نہیں جلنے پاتا۔ صبح کو اُس گاے کو ذبح کرکے، کچھ تھوڑے سے گوشت کے کباب اور باقی میں چنے کی دال ڈال کے، قلیہ پکا کے، جا بہ جا تقسیم کرتی ہیں۔ ان کے علماؤں کے نزدیک یوں واجب ہے کہ اُس وقت جو دعا مانگے، وہ قبول ہوگی۔

اور ایک تیسری تاریخ کا چاند ہے، کہتی ہیں کہ جو اُس کو دیکھے گا، وہ مہینا بھر رنج والم میں رہے گا۔ اس واسطے جو کوئی دیکھتا ہے، اُس کے سامنے ایک پیالے میں پانی بھر کے رکھتی ہیں، اور ایک شخص یہ کہانی کہتا ہے کہ : ایک شخص نے تیسری تاریخ کا چاند دیکھا اور باہر گیا، رستے میں ایک بادشاہ زادی کی سواری چلی گئی۔ اُس نے ایک تربوز جو پایا، ٹھٹھیرے سے (چھری) لے کے کاٹنے لگا، اتنے میں وہ ٹھٹھیرا چھری ہو گیا اور وہ (تربوز) شہزادے کا سر بن گیا۔ لوگوں نے دوڑ کر اُس کو پکڑ کے مشکیں باندھ لیں اور بادشاہ کے پاس لے

گئے۔ بادشاہ نے گردن مارنے کا حکم اس کو دیا۔ پھر اسے جنگل میں لائے۔ اُس نے لوگوں سے کہا کہ اگر مجھ کو دریا تک لے چلو تو میں نہا آؤں۔ جو ہیں یہ دریا کے کنارے پر پہنچا، دیکھتا کیا ہے کہ ایک سو ٹونٹی کا لوٹا ہے، اُس میں سے چاند آتا ہے اور جاتا ہے۔ اُس نے اُس کا پانی اپنے مُنہ پر ڈالا، سارا بوجھ بھار اُس کا اُتر گیا، وہ چُھری پھر ٹھٹھیرا بن گئی اور سر تربوز ہو گیا۔ اور بادشاہ زادے کی سواری اُدھر سے پھر آئی۔ لوگوں نے شادیانے بجائے اور اُس سے اُس کا باعث پوچھا۔ اُس نے کہا کہ میں نے تیسری تاریخ کا چاند دیکھا تھا۔ اس لوٹے کو دیکھ کر سب میرا صدمہ مٹ گیا۔ جو کوئی اس چاند کو دیکھے، وہ یہ کہانی کہے تو اُس پر کچھ رنج و غم اثر نہیں کرنے کا۔

ختم ہوئی یہ کتاب، واللہ اعلم بالصواب

تمام شد

پروفیسر سیّد نجیب اشرف ندوی مرحوم

خواجہ احمد فاروقی

اس رسالے کی طباعت کے بالکل آخری مرحلے پر یہ اندوہناک اطلاع ملی کہ بمبئی میں پروفیسر سیّد نجیب اشرف ندوی کا انتقال ہوگیا۔ ان کی شگفتہ متانت، ان کا پُرسوز خلوص، اُردو کی تحریکوں سے ان کی گہری دلچسپی، تعمیری کاموں سے ان کی والہانہ محبّت۔ پھر ان کا علم و فضل اور مرنجاں مرنج طبیعت اس عہد میں ہمارا بہت بڑا سہارا تھیں۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کی شخصیت کے گھنے سایے میں ہمیں زمانے کی کڑی دھوپ سے کچھ دیر کے لیے پناہ مل گئی ہے۔

انھوں نے اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کو جس طرح ایک واہمے سے حقیقت بنا دیا اور شاگردوں اور کام کرنے والوں کی ایک سرگرم جماعت پیدا کردی، وہ اُن ہی کا کارنامہ ہے۔ وہ دراصل اُن رندانِ قدح خوار میں سے تھے جن میں علّامہ شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر عبدالحق کے اسماے گرامی شامل ہیں اور جن کی میزانِ قدر میں علم کے ساتھ عمل بھی لازمی اور ضروری تھا۔ سامرسٹ مام نے اپنے زمانے کے فرانس کے بارے میں لکھا ہے کہ وہاں کے علمی مقابلے، مجادلے ہیں اور اور سب وشتم، دروغ و حسد کی وہ گرم بازاری ہے کہ الامان والحفیظ۔ اُردو میں بھی ایسے معرکوں کی تعداد کم نہیں ہے —— ندوی صاحب سے میرے تعلقات کم و بیش ۲۵ برس کے تھے لیکن مجھے نہیں یاد کہ انھوں نے کبھی کسی کے متعلق کوئی نا ملائم یا نازیبا کلمہ زبان سے نکالا ہو یا اپنے آپ کو کسی ادبی گروہ میں شامل کیا ہو۔ اگر تنقید بھی کی ہے تو ہمدردی کے ساتھ، اور اس طرح کہ رُخِ سخن پر رنگِ ادب

باقی رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا دل، محبّت اور شفقت سے اس درجہ بھرا ہوا تھا کہ اس میں "کینۂ اغیار" کے لیے جگہ تھی ہی نہیں ——

آخر زمانے میں ندوی صاحب کی صحت بہت خراب ہوگئی تھی۔ وہ شاید اور جیتے لیکن ان کے قریبی عزیزوں اور رشتے داروں کی بے اعتنائی اور بے مہری اتنی بڑھ گئی تھی کہ مرض سے مقابلے کی تاب و توانائی اُن کے اندر باقی نہیں رہی تھی ؎

بوے گل، رنگِ چمن اور یہ عمر گزراں
سب ٹھہر جائیں گے اُس کو کوئی روکے تو سہی

اُن کے جانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُردو کا ایک ستون گر گیا اور ہم ایک شفیق اُستاد، ایک باعمل عالم، ایک پیر محبوب اور ایک مخلص دوست سے محروم ہوگئے۔

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی کے انتقال پر شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی نے جو تجویزِ تعزیت منظور کی ہے وہ درجِ ذیل ہے :

"شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی کے طلبہ اور اساتذہ کا یہ جلسہ پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی ڈائرکٹر انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کے انتقالِ پُرملال پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور ان کی موت کو اُردو علم و ادب کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان تصوّر کرتا ہے۔

پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی اُردو کے مشہور محقق اور مستند اہلِ قلم تھے۔ اُن کی نگرانی میں انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کا قیام اور اس کی علمی خدمات مرحوم کے کارموں میں شامل کی جائیں گی جسے انھوں نے اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا۔ ان کی علمی اور ادبی خدمات ہمیشہ اُردو داں طبقہ یاد رکھے گا اور انھیں اپنی متاعِ عزیز سمجھتا رہے گا۔

شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ کا یہ جلسہ مرحوم کے پسماندگان سے اظہار ہمدردی کرتا ہے اور دست بدعا ہے کہ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ ملے، ان کے پروان چڑھائے ہوئے علمی ادارے اُن کی زندہ یادگار بن کر قائم رہیں اور ترقی کریں۔"

حاضرین جلسہ نے ایک منٹ خاموش رہ کر تعزیتی تجویز منظور کی اور مرحوم کے لیے ایصال ثواب کیا۔ آخر میں جناب مغیث الدین فریدی اُستاد شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی نے پروفیسر ندوی کی وفات پر مندرجۂ ذیل قطعۂ تاریخ پیش کیا۔

قطعۂ تاریخ وفات

رخصت ہوا وہ ساقیِ صہبائے علم و فن
"بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے"
سیّد نجیب اشرفِ ندوی کی موت سے
"ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے"
شامل ہے دل کا "کرب" بھی سالِ وفات میں
"اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے"

۲۲۲ + ۱۷۴۶ = ۱۹۶۸ عیسوی

رسالہ کائنات ۱۸۰۲ء

ورق ۲ و ۳

"اِس احقر العباد خلیل علی خاں نے جس کا تخلص اشک مشہور ہے عصر میں شاہ عالم بادشاہ خلد اللہ ملکہ کے اور وقت میں امیر الامرا ... مارکوئس ولزلی بہادر ... کے یہ رسالہ کائنات جو کا سن ہجری بارہ سو سترہ میں مطابق اٹھارہ سو دو (۱۸۰۲ء) عیسوی کے زبان ریختے میں بموجب مستر جان گل کرائسٹ صاحب دام دولتہ، کی مصلحت کے واسطے ... تصنیف کیا اور اختصار کیا اسے دس فصل پر۔"

عکس مملوکہ خواجہ احمد فاروقی

سلسلۂ اشاعتِ مخطوطاتِ اُردو

عمدۂ منتخبہ

یہ اُردو شاعروں کا نہایت اہم تذکرہ ہے جسے اعظم الدولہ نواب میر محمد خاں سرور دہلوی نے اٹھارھویں صدی کے آخر میں ترتیب دینا شروع کیا تھا۔ انڈیا آفس لندن کے کتب خانے میں اس کا ایک اچھا مخطوطہ محفوظ تھا۔ شعبے نے اسی کو اپنے نسخے کی بنیاد بنایا ہے اور مفید حواشی اور مقدمے کے ساتھ، نہایت دیدہ زیب ٹائپ میں شائع کیا ہے صفحات: ۸۳۶

قیمت: بیس روپے

کربل کتھا

یہ کتاب جس کو شمالی ہند میں اُردو نثر کی پہلی تصنیف کہا گیا ہے، ۱۱۴۵ھ میں بعہدِ محمد شاہ لکھی گئی تھی۔ اس وقت دنیا میں اس کا واحد نسخہ ٹیوبن گن یونی ورسٹی (جرمنی) کے ذخیرۂ اشپرنگر کی زینت ہے۔ شعبۂ اُردو نے اس نادر و نایاب کتاب کو مقدمے اور فرہنگ کے اضافے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ آفسٹ کی طباعت، قیمت: دس روپے۔

گنجِ خوبی

میر امن، صاحبِ باغ و بہار کا دوسرا شاہ کار، ان کی کتاب گنجِ خوبی ہے۔ جو فارسی کی معروف نصابی کتاب اخلاقِ محسنی کا اُردو ترجمہ ہے۔ ہم نے اس کو میر امن کے خود نوشت نسخے سے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب بھی تذکرۂ سرور کی طرح خوب صورت ٹائپ میں چھپی ہے۔

قیمت: پندرہ روپے۔

دیوانِ بقا

بقا اکبر آبادی، میر و سودا کے حریف کی حیثیت سے خاصی شہرت رکھتے ہیں لیکن ان کا دیوان نایاب تھا۔ اس کا واحد خطی نسخہ ذخیرۂ اشپرنگر (جرمنی) میں محفوظ تھا یہ متن، اسی نسخے

پر مبنی ہے۔ صفحات : ۱۰۰ ۔ قیمت تین روپے پچاس پیسے۔

خدنگِ غدر

تصنیفِ معین الدین حسن خاں خلفِ نواب اشرف الدولہ قدرت اللہ بیگ خاں بہادر غالب جنگ۔ یہ نایاب مخطوطہ مصنّف کے بیان کے مطابق ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے اُن واقعات پر مشتمل ہے جن کو مصنف نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا یا نہایت معتبر ذریعے سے سُنا تھا۔

سلسلۂ دبستانِ دہلی

ماسٹر رام چندر

دہلی کالج کی نامور شخصیت اور مشہور ریاضی داں ماسٹر رام چندر کا کام یقیناً اس کا مستحق ہے کہ اُس کا ادب کے بڑے نقشے میں جائزہ لیا جائے۔ یہ مانوگراف اسی ضرورت کے پیش نظر تیار کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں مفصل اشاریہ ہے جس میں اُن کے مضامین کی فہرست دی گئی ہے اور شروع میں مفصّل مقدمہ۔ دبیز کاغذ۔ دیدہ زیب ٹائپ۔
قیمت : دس روپے۔

دہلی اُردو اخبار

اُردو صحافت کی تاریخ میں "دہلی اُردو اخبار" غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ انیسویں صدی کے وسط میں ہندوستان، خصوصاً دہلی میں جو واقعات رونما ہوتے رہے یہ ان کی مستند دستاویز ہے۔ یہ پہلی جلد ہے جس میں ۱۸۴۰ء کے موجود شماروں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ (زیرِ طبع)

اُردوے معلّیٰ

شعبۂ اردو کا تحقیقی رسالہ۔ اب تک اس کے مندرجۂ ذیل شمارے شائع

ہو چکے ہیں :

(۱) غالب نمبر حصۂ اوّل صفحات ۱۶۰ قیمت : تین روپے

(۲) غالب نمبر حصۂ دوم صفحات ۳۲۴ قیمت : پانچ روپے

(۳) لسانیات نمبر صفحات ۲۹۶ قیمت : پانچ روپے

(۴) میر سوز نمبر یہ نمبر میر سوز کے کلام پر مشتمل ہے۔ سوز کا کلام عام طور سے دست یاب نہیں ہوتا۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) اور رضا لائبریری رام پور کے خطّی نسخوں کی مدد سے اس کو مرتب کیا گیا ہے شروع میں ان کی حیات اور شاعری سے متعلق ایک مفصّل مضمون بھی شامل ہے۔ صفحات ۵۵۸۔ قیمت سات روپے

(۵) قائم نمبر اس اشاعت میں قائم کا دیوانِ غزلیات شائع کیا گیا ہے۔ انڈیا آفس لندن اور رضا لائبریری رام پور کے خطّی نسخوں کی مدد سے اس کا متن تیار کیا گیا ہے۔ صفحات ۲۲۳۔ قیمت پانچ روپے۔

(۶) قدیم اُردو نمبر صفحات ۳۲۸ قیمت : پانچ روپے

(۷) غالب نمبر حصّۂ سوم جشن صد سالہ نمبر (زیرِ طبع)

غالب کا سکّۂ شعر

از خواجہ احمد فاروقی

منشی جیون لال نے اپنے اصل روزنامچے میں غالب کا یہ سکّۂ شعر درج کیا ہے :

بر زرِ آفتاب و نقرۂ ماہ سکّہ زد در جہاں بہادر شاہ

یہ اور اس قسم کی دوسری نادر معلومات کے لیے ملاحظہ ہو رسالہ اُردوئے معلّیٰ، دہلی یونی ورسٹی نمبر ۱۰ جشنِ صد سالہ نمبر جو زیرِ طبع ہے۔